یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ھیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ھیں.

منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

زیر نظر

اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ جلد ۵

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی ؒ

زیر سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

فہرست مضامین

مسلمان ارادہ کر رہے تھے کہ فوراً اپنے چھوٹے چھوٹے خیموں میں جاکر پناہ لیں جو انہوں نے اپنے ساتھ اٹھا رکھے تھے لیکن رسول اللہؐ نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ سب کے سب خداوند تعالیٰ کا ایک نیا پیغام سننے کے لیے تیار ہوں جسے ایک مفصل خطبے کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

جو لوگ رسول اللہؐ سے دور تھے وہ پیغمبرؐ کا ملکوتی چہرہ اس عظیم اجتماع میں دور سے نہیں دیکھ پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنایا گیا، پیغمبرؐ اس کے اوپر تشریف لے گئے۔ پہلے پروردگار عالم کی حمد و ثنا بجا لائے اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے یوں خطاب فرمایا: میں عنقریب خداوند تعالیٰ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں میں بھی جوابدہ ہوں اور تم بھی جوابدہ ہو تم میرے بارے میں کیا گواہی دو گے لوگوں نے بلند آواز میں کہا نشہد انک قد بلغت ونصحت وجهدت فجزاك الله خيرًا یعنی ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے فریضہ رسالت انجام دیا اور خیر خواہی کی ذمہ داری کو انجام دیا اور ہماری ہدایت کی راہ میں سعی و کوشش کی، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور روز قیامت کی حقانیت اور اس دن مردوں کے قبروں سے مبعوث ہونے کی گواہی نہیں دیتے؟

سب نے کہا: کیوں نہیں ہم سب گواہی دیتے ہیں۔

آپ نے فرمایا خداوندا گواہ رہنا۔

آپ نے مزید فرمایا لوگو! کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد سارے بیابان پر سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ سوائے ہوا کی سنسناہٹ کے کوئی چیز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: دیکھو! میں تمہارے درمیان دو گرانمایہ اور گرانقدر چیزیں بطور یادگار کے چھوڑے جا رہا ہوں تم اُن کے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟

حاضرین میں سے ایک شخص نے پکار کر کہا: یا رسول اللہؐ وہ دو گرانمایہ چیزیں کونسی ہیں؟

تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: پہلی چیز تو اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو ثقل اکبر ہے۔ اس کا ایک سرا تو پروردگار عالم کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، اس سے ہاتھ نہ ہٹانا ورنہ تم گمراہ ہو جاؤ گے اور دوسری گرانقدر یادگار میرے اہل بیت ہیں اور مجھے خدائے لطیف و خبیر نے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے آملیں گے۔

ان دونوں سے آگے بڑھنے (اور اُن سے تجاوز کرنے) کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی اُن سے پیچھے رہنا کہ اس صورت میں بھی تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنے اردگرد نگاہیں دوڑا رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں جونہی آپؐ کی نظر حضرت علی علیہ السلام پر پڑی فوراً ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کے نیچے کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب لوگوں نے اُنہیں دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ تو اسلام کا وہی سپہ سالار ہے کہ جس نے کبھی شکست کا منہ نہیں دیکھا۔

اس موقع پر پیغمبرؐ کی آواز زیادہ نمایاں اور بلند ہوگئی اور آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ایھا الناس من اولی الناس بالمؤمنین من انفسھم

یعنی — اے لوگو! بتاؤ وہ کون ہے جو تمام لوگوں کی نسبت مومنین پر خود اُن سے زیادہ اولیت رکھتا ہے؟ اس پر سب حاضرین نے بیک آواز جواب دیا کہ خدا اور اس کا پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں۔

تو پیغمبرؐ نے فرمایا: خدا میرا مولا و رہبر ہے اور میں مومنین کا مولا و رہبر ہوں اور ان کے اوپر ان کی نسبت خود اُن سے زیادہ حق رکھتا ہوں (اور میرا ارادہ ان کے ارادے سے مقدم ہے)۔

اس کے بعد فرمایا:

فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ یعنی جس جس کا میں مولا ہوں علیؑ بھی اس اس کا مولا و رہبر ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے اس جملے کی تین مرتبہ تکرار کی اور بعض راویوں کے قول کے مطابق پیغمبرؐ نے یہ جملہ چار مرتبہ دہرایا اور اس کے بعد آسمان کی طرف سر بلند کر کے بارگاہ خداوندی میں عرض کی:

اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ واحب من احبہ وابغض من ابغضہ و انصر من نصرہ واخذل من خذلہ وادر الحق معہ حیث دار۔

یعنی — بارالٰہا جو اس کو دوست رکھے تو اس کو دوست رکھ اور جو اس سے دشمنی کرے تو اس سے دشمنی رکھ۔ جو اس سے محبت کرے تو اُس سے محبت کر اور جو اس سے بغض رکھے تو اُس سے بغض رکھ۔ جو اس کی مدد کرے تو اُس کی مدد کر جو اس کی مدد سے کنارہ کشی کرے تو اسے اپنی مدد سے محروم رکھ اور حق کو ادھر پھیر دے جدھر وہ رُخ کرے۔

اس کے بعد فرمایا۔ الا فلیبلغ الشاھد الغائب یعنی۔ تمام حاضرین آگاہ ہو جائیں اس بات پر کہ یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو اُن لوگوں تک پہنچائیں جو یہاں پر اور اس وقت موجود نہیں ہیں۔ پیغمبرؐ کا خطبہ ختم ہو گیا۔ پیغمبرؐ پسینے میں شرابور تھے حضرت علی علیہ السلام بھی پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ دوسرے تمام حاضرین کے بھی سر سے پاؤں تک پسینہ بہ رہا تھا۔ ابھی اس جمعیت کی صفیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئی تھیں کہ جبرئیل امین وحی لے کر نازل ہوئے اور تکمیل دین کی پیغمبرؐ کو بایں الفاظ بشارت دی:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ۔۔۔ الخ

"آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین اور آئین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا۔"

اتمام نعمت کا پیغام سن کر پیغمبرؐ نے فرمایا:

اللہ اکبر اللہ اکبر علی اکمال الدین واتمام النعمۃ ورضی الرب برسالتی والولایۃ لعلی من بعدی؛

ہر طرح کی بزرگی و بڑائی خدا ہی کے لیے ہے کہ جس نے اپنے دین کو کامل فرمایا اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کیا اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد کے لیے علیؑ کی ولایت کے لیے خوش ہوا۔

امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کا پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے اعلان سن کر حاضرین میں مبارک باد کا شور برپا ہوا لوگ بڑھ چڑھ کر اس اعزاز و منصب پر حضرت علیؑ کو اپنی طرف سے مبارک باد پیش کر رہے تھے معروف شخصیتوں میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی طرف سے مبارک باد کے یہ الفاظ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں کہ انہوں نے کہا:

بخ بخ لك یا ابن ابی طالب اصبحت وامسیت مولائی ومولا کل مؤمن ومؤمنة

مبارک ہو! مبارک ہو! اے فرزند ابی طالب کہ آپ میرے اور تمام صاحبان ایمان مردوں اور عورتوں کے مولا اور رہبر ہو گئے۔

اس وقت ابن عباس نے کہا بخدا یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں میں باقی رہے گا۔ عرب کے مشہور شاعر مداح رسولؐ حسان بن ثابت نے پیغمبرؐ سے اجازت لے کر اس موقع کی مناسبت سے ایک قصیدہ پڑھا جس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں:

ینادیهم یوم الغدیر نبیهم ــــــ ٭ ــــــ بخم و اسمع بالرسول منادیا

فقال فمن مولاکم ونبیکم ــــــ ٭ ــــــ فقالوا ولم یبدوا هناك التعامیا

الٰهك مولانا و انت نبینا ــــــ ٭ ــــــ ولم تلق منا فی الولایة عاصیا

فقال له قم یا علی فاننی ــــــ ٭ ــــــ رضیتك من بعدی اماما وهادیا

فمن کنت مولاه فهذا ولیه ــــــ ٭ ــــــ فکونوا له اتباع صدق موالیا

هناك دعا اللهم وال ولیه ــــــ ٭ ــــــ وکن للذی عادا علیا معادیا

"یعنی پیغمبرؐ نے غدیر کے دن خم کے مقام پر انہیں ندا دی اور پکارا اور یہ پکارنے والا کس قدر گرامی قدر تھا۔"

"فرمایا: تمہارا مولا اور تمہارا نبی کون ہے؟ تو انہوں نے بلا تردد صراحت کے ساتھ جواب دیا۔"

"کہ آپ کا خدا ہمارا مولا اور آپ ہمارے پیغمبر ہیں اور ہم آپ کی ولایت کے قبول کرنے سے روگردانی نہیں کریں گے۔"

"اس پر پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے کہا کھڑے ہو جاؤ کیونکہ میں نے تمہیں اپنے بعد کے لیے امام اور رہبر منتخب کیا ہے۔"

"اس کے بعد فرمایا جس شخص کا میں مولا و رہبر ہوں یہ علیؑ اس کے مولا و رہبر ہیں پس تم سچے دل سے ان کی پیروی کرنا۔"

"اس وقت پیغمبرؐ نے عرض کیا: بارالہا! اس کے دوست کو دوست اور اس کے دشمن کو دشمن رکھنا۔"[1]

---

[1] یہ اشعار اہل سنت کے بہت سے علماء نے نقل کیے ہیں ان میں حافظ ابونعیم اصفہانی، حافظ ابوسعید سجستانی، خوارزمی مالکی، حافظ ابوعبداللہ مرزبانی گنجی شافعی، جلال الدین سیوطی، سبط ابن جوزی اور صدرالدین حموی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

یہ تھا مشہور حدیث غدیر کا خلاصہ جو اہل سنت اور شیعہ کتب میں موجود ہے۔

جرح وتنقید اور اعتراضات

اس میں شک نہیں کہ اگر یہ آیت خلافت علیؑ کے علاوہ کسی دوسرے موضوع سے متعلق ہوتی، تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ان روایات اور خود آیت میں موجود قرائن سے کم مقدار پر بھی قناعت کر لی جاتی جیسا کہ دنیائے اسلام کے بڑے بڑے مفسرین نے قرآن کریم کی باقی تمام آیات کی تعبیر میں بعض اوقات زیر نظر آیت کے موجود مدارک کے دسویں حصہ بلکہ اس سے بھی کم تر پر قناعت کر لی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقام پر تعصب کے پردے بہت سے حقائق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔

جن لوگوں نے اس آیت کی تفسیر اور ان متعدد روایات کے متعلق جو اس آیت کی شان نزول کے بارے میں بیان ہوئی ہیں اختلاف کیا ہے اور حد تواتر سے بڑھی ہوئی ان روایات کے مقابلے میں علم مخالفت بلند کیا ہے جو در اصل واقعہ غدیر کے متعلق ہیں دو قسم کے ہیں:۔

پہلی قسم ان لوگوں کی ہے کہ جو شروع ہی سے نہ صرف دشمنی اور ہٹ دھرمی سے اس پر بحث کرتے ہیں بلکہ انہوں نے شیعوں کی ہتک و توہین، بدگوئی اور دشنام طرازی کا راستہ اختیار کیا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے روح تحقیق کی حفاظت کی ہے اور وہ کسی حد تک حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے ہیں لہٰذا انہوں نے استدلال کی راہ اپنائی ہے اسی بنا پر انہوں نے حقائق کے ایک حصے کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن انہوں نے اس آیت اور اس سے مربوط روایات بیان کرنے سے پہلے کچھ اشکالات بیان کیے ہیں اور وہ اشکالات جو شاید ان خاص حالات کا نتیجہ تھے جو ان کے فکری ماحول پر محیط تھا، بیان کرنے کے بعد اس آیت اور اس سے مربوط روایات ذکر کی ہیں۔

پہلے گروہ کا واضح نمونہ ابن تیمیہ ہے اس نے اپنا موقف کتاب منہاج السنۃ میں بیان کیا ہے اس میں اس کی حالت بالکل اس شخص کی طرح ہے جو روز روشن میں اپنی آنکھیں بند کرے اور اپنی انگلیاں زور سے کانوں میں ٹھونس لے اور چلانا شروع کرے کہ سورج کہاں ہے۔ نہ تو وہ اپنی آنکھوں کو کھولنے کے لیے تیار ہوتا ہے کہ کچھ حقائق کو دیکھ لے نہ کانوں سے انگلیاں نکالنے پر آمادہ ہوتا ہے کہ کچھ اسلامی محدثین و مفسرین کی داد و فریاد سن سکے بس مسلسل اور پے در پے گالیاں دیئے چلے جا رہا ہے اور ہتک حرمت پر کمر بستہ ہے۔ ایسے افراد جہالت، بے خبری، ہٹ دھرمی اور خشونت آمیز تعصب کے ہاتھوں اتنے مجبور ہیں کہ ایسے واضح اور بدیہی مسائل کا بھی انکار کر دیتے ہیں جن کا ہر آدمی آسانی کے ساتھ ادراک کر سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کی باتیں نقل کرنے کی ہم اپنے آپ کو زحمت دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے جوابات پڑھنے کی تکلیف قارئین کو دیتے ہیں کیونکہ عظیم اسلامی علماءؒ مفسرین جن کی اکثریت علماء اہل سنت میں سے ہے جنہوں نے تصریح کی ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور جو شخص ان کے خلاف ڈھٹائی سے کہے کہ ان میں سے کسی ایک نے بھی ایسی کوئی چیز اپنی کتاب میں نقل نہیں کی، ایسے شخص کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور ایسے آدمی کی بات کیا وزن رکھتی ہے کہ جس پر ہم بحث کریں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ابن تیمیہ" نے اُن بہت سی معتبر کتابوں کے مقابلے میں کہ جن میں اس آیت کے حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اپنی برأت کے لیے اس مضحکہ خیز جملہ پر اکتفا کیا ہے:

"اُن علماء میں سے جو یہ جانتے ہیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں کوئی بھی اس آیت کو حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہونا نہیں جانتا"

گویا صرف وہ علماء جو ابن تیمیہ کے عناد آلود ہٹ دھرمی کے افراط زدہ میلانات کے ساتھ ہم آواز ہیں صرف وہی "سمجھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں" ورنہ جو شخص اس کا ہم آواز نہیں ہے وہ ایسا دانشمند ہے کہ جسے یہ پتہ ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ ایسے شخص کی منطق ہے کہ جس کی فکر پر خود خواہی اور ہٹ دھرمی سایہ فگن ہے۔ ہم اس گروہ کا ذکر یہیں پر چھوڑتے ہیں۔

البتہ ان اعتراضات میں سے جو دوسرے گروہ نے کیے ہیں اُن میں سے چند قابلِ بحث ہیں جنہیں ہم ذیل میں آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

۱۔ کیا مولیٰ کا معنی اولیٰ بالتصرف ہے؟

اہم ترین اعتراض جو حدیث غدیر کے سلسلہ میں کیا جاتا ہے یہ ہے کہ "مولیٰ" کے معانی میں سے ایک معنی دوست اور یاور و مددگار بھی ہے اور یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں یہ معنی مراد نہ ہو!

اس بات کا جواب کوئی مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے کیونکہ ہر غیر جانبدار دیکھنے والا شخص جانتا ہے کہ علی کی دوستی کے ذکر اور یاددہانی کے لیے ان مقدمات و تشکیلات، اور خشک جلا دینے والے بیابان کے وسط میں خطبہ پڑھنے، اور لوگوں کو وہاں ٹھہرانے اور اُن سے پے در پے اقرار لینے اور اعتراف کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ مسلمانوں کا ایک دوسرے سے دوستی رکھنا مسائل اسلامی میں سے ایک بدیہی ترین مسئلہ تھا جو آغاز اسلام سے ہی موجود تھا۔ علاوہ ازیں یہ کوئی ایسا مطلب نہیں تھا کہ جس کی پیغمبر نے اُس وقت تک تبلیغ نہ کی ہو بلکہ آپ تو بارہا اس کی تبلیغ کر چکے تھے۔

یہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ جس کے اظہار سے آپ پریشان ہوں اور خدا کو اس کے لیے تسلی اور حفاظت کی ضمانت دینی پڑے۔

یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہیں تھا کہ خداوند عالم اس لب و لہجہ کے ساتھ اپنے پیغمبر سے گفتگو کرتا "اگر اس کی تبلیغ نہ کی تو رسالت کی تبلیغ بھی نہ کی"۔ یہ سب چیزیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ مسئلہ ایک عام دوستی سے کہیں اونچا تھا۔ وہ دوستی جو اسلام کے پہلے ہی دن سے اخوت اسلامی کی الف کا حصہ شمار ہوتی تھی۔

علاوہ ازیں اگر اس سے ایک عام اور سادہ دوستی کا بیان کرنا ہی منظور ہوتا تو پیغمبرؐ پہلے یہ اقرار لوگوں سے کیوں لیتے کہ "الست اولیٰ بکم من انفسکم" یعنی کیا میں تمہاری نسبت تمہارے نفوس پر خود تم سے زیادہ حقدار اور صاحبِ اختیار نہیں ہوں؟[۱]

---

[۱] یہ جملہ متعدد روایات میں وارد ہوا ہے۔

کیا یہ جملہ ایک عام دوستی کے بیان کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت رکھتا ہے؟ نیز ایک عام دوستی تو یہ مقام نہیں رکھتی تھی کہ لوگ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی حضرت علیؑ کو اس طرح سے مبارک باد اور تہنیت پیش کریں:

"اصبحت مولای و مولا کل مؤمن و مؤمنة"

"اے علیؑ! آپ میرے اور ہر مومن مرد اور ہر مومن عورت کے مولا ہو گئے۔"

اور اسے ایک نیا منصب اور اعزاز شمار کریں[1]

کیا حضرت علیؑ اس دن تک ایک عام مسلمان کی حیثیت سے بھی پہچانے نہیں گئے تھے۔ کیونکہ ایک مسلمان کی دوستی تو تمام مسلمانوں پر لازم و ضروری ہے۔ کیا مسلمانوں کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے دوستی کرنا کوئی نئی بات تھی کہ جس کے لیے مبارک باد دینے کی ضرورت ہو اور وہ بھی رسول اللہ کی عمر کے آخری سال میں۔

علاوہ ازیں کیا حدیث ثقلین اور وداعِ پیغمبرؐ سے تعلق رکھنے والی تعبیرات کا حضرت علیؑ کی دوستی کے مسئلہ سے بھی کوئی ربط ہو سکتا ہے؟ حضرت علیؑ کی مومنین کے ساتھ ایک عام دوستی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اُسے قرآن کے ہم پلہ اور برابر قرار دے دیں[2]

کیا ہر غیر جانبدار دیکھنے والا شخص اس تعبیر سے یہ نہیں سمجھتا کہ یہاں پر مسئلہ رہبری و امامت سے متعلق گفتگو ہو رہی ہے کیونکہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد قرآن مسلمانوں کا پہلا رہبر ہے لہٰذا اسی بنیاد پر اہلِ بیت علیہم السلام مسلمانوں کے دوسرے رہبر ہیں۔

۲۔ آیات کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے قبل و بعد کی آیات اہلِ کتاب اور ان کی غلط کاریوں کے بارے میں ہیں۔ خاص طور پر تفسیر المنار کے مؤلف نے جلد ۶ صفحہ ۴۶۶ پر اس مسئلہ پر زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم خود اس آیت کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو اس آیت کا لب ولہجہ اور اس کا قبل و بعد کی آیات سے فرق مکمل طور پر یہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس آیت میں موضوعِ سخن کوئی ایسی چیز ہے جو قبل و بعد کی آیات سے مختلف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ قرآن ایک کلاسیکی کتاب نہیں ہے کہ جس کے مطالب کو خاص حصّوں اور ابواب میں ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بلکہ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی اور مختلف حادثات و واقعات رونما ہوتے گئے اُن کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں قرآن ایک جنگ کے متعلق بحث کرتے کرتے یکایک ایک فروعی حکم کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔ یا جب وہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو کر رہا ہوتا ہے تو اچانک ہی مسلمانوں کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ایک اسلامی حکم اُن کے لیے بیان کر دیتا ہے۔

---

[1] اس واقعہ کے اس حصّہ کو کہ جو حدیث تہنیت کے نام سے مشہور ہے، اہلِ سنت کے بہت سے عظیم علماء حدیث و تفسیر و تاریخ نے متعدد طریقوں سے بہت سے صحابہؓ سے نقل کیا ہے مثلاً ۔۔۔ ابن عباس، ابوہریرہ، براء بن عازب اور زید بن ارقم۔ مرحوم علامہ امینی نے الغدیر کی پہلی جلد میں اس حدیث کو اہلِ سنت کے ساٹھ علماء سے نقل کیا ہے۔

[2] حدیث ثقلین ان متواتر احادیث میں سے ہے جسے اہلِ سنت کی بہت سی کتابوں میں متعدد صحابہ سے نقل کیا گیا ہے مثلاً ابوسعید خدری، زید ابن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ بن حنطب، عبد بن حمید، جبیر بن مطعم، ضمرہ اسلمی، ابوذر غفاری، ابو رافع اور ام سلمہ نے پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے پھر ایک دفعہ اس بحث کی طرف رجوع فرمائیں جو ہم نے اس آیت کی تفسیر کے ابتدا میں کی ہے۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض متعصب قسم کے لوگوں کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ آیت ابتداءِ بعثت میں نازل ہوئی ہے، حالانکہ سورۂ مائدہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری ایام میں نازل ہوئی ہے اور اگر وہ یہ کہیں کہ صرف یہ ایک آیت مکہ میں ابتدائے بعثت میں نازل ہوئی ہے اور اس کے بعد کسی مناسبت سے اس سورہ کی آیات کے درمیان آگئی ہے، تو ہم کہیں گے کہ یہ بات تو بالکل اس بات کے الٹ ہے جسے آپ منوانا چاہتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتدائے بعثت میں نہ تو پیغمبرؐ یہودیوں کے ساتھ برسرِ جنگ تھے اور نہ ہی عیسائیوں کے ساتھ، اس بنیاد پر تو اس آیت کا قبل و بعد کی آیات سے کوئی تعلق ہی نہ رہے گا (غور کیجئے)۔
یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ آیت تعصب کے طوفان کی زد میں آگئی ہے اور اسی بنا پر اس میں کئی طرح احتمالات پیدا کیے جاتے ہیں۔ جبکہ اس جیسی دوسری آیات میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ ہر ایک اسی کوشش میں لگا ہوا ہے کہ کسی حیلہ و بہانہ سے یا کسی بے بنیاد دستاویز کے ذریعہ اس کے مفہوم کو اس کے صحیح راستے سے منحرف کرے۔

۳۔ کیا یہ حدیث تمام کتبِ صحاح میں نقل ہوئی ہے

بعض کہتے ہیں کہ ہم کس طرح اس حدیث کو قبول کر سکتے ہیں جبکہ بخاری اور مسلم نے اپنی اپنی کتاب میں اسے نقل نہیں کیا ہے، یہ اعتراض بھی عجائبات میں سے ہے کیونکہ اول تو بہت سی معتبر احادیث ایسی ہیں جنہیں علمائے اہلِ سنت نے قبول کیا ہے۔ حالانکہ وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہیں اور یہ کوئی پہلی حدیث بھی نہیں کہ جس کی یہ وضع و کیفیت ہو۔
دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ کیا ان کے نزدیک صرف یہی دو کتابیں معتبر ہیں؛ حالانکہ یہ حدیث ان کے قابلِ اعتماد منابع اور کتب میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ صحاح ستہ (اہلِ سنت کی چھ مشہور کتابیں جن پر وہ اعتماد کرتے ہیں) مثلاً سنن ابن ماجہؒ میں یہ حدیث موجود ہے اسی طرح مسند احمد حنبلؒ میں بھی یہ حدیث آئی ہے۔ اور حاکم، ذہبی اور ابن حجر جیسے علماء نے بھی اپنے شہرہ آفاق تعصب کے باوجود اس حدیث کے بہت سے طرق کے صحیح ہونے کا اعتراف کیا ہے۔
بنابریں بعید نہیں کہ بخاری و مسلم اس مخصوص فضا اور گھٹے ہوئے ماحول میں صریحاً اپنی کتاب میں ایسی چیز نہ لکھ سکے ہوں یا نہ لکھنا چاہتے ہوں جو اُن کے وقت کے صاحبانِ اقتدار کے مزاج کے خلاف تھی۔

۴۔ حضرت علی علیہ السلام نے اور اہلِ بیتؑ نے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا

بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر حدیث غدیر اس عظمت کے ساتھ موجود تھی تو خود حضرت علیؑ نے اور ان کے اہلِ بیتؑ اور یار و انصار اور ان سے تعلق رکھنے والوں نے ضروری مقامات پر اس سے استدلال کیوں نہ کیا۔ آیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ حضرت علیؑ کی حقانیت ثابت

۱ے جلد اول صفحہ ۵۵ و صفحہ ۵۸۔

۲ے مسند احمد حنبل جلد اول صفحہ ۸۴۔ ۸۸۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۵۲۔ ۳۳۱۔ ۲۸۱۔ ۳۷۰۔

کرنے کے لیے اس قسم کے اہم مدرک کو سند کے طور پر پیش کرتے۔

یہ اعتراض بھی اسلامی کتابوں سے خواہ وہ حدیث سے متعلق ہوں یا تاریخ و تفسیر سے، عدم واقفیت کا نتیجہ ہے، کیونکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں ایسے بہت سے مواقع کا ذکر کیا گیا ہے کہ جہاں پر خود حضرت علیؑ نے یا آئمہ اہل بیتؑ نے یا اس مسلک سے تعلق رکھنے والوں نے حدیثِ غدیر سے استدلال کیا ہے ان میں سے ایک واقعہ خود حضرت علیؑ سے متعلق ہے جسے خطیب خوارزمی نے عامر بن واصلہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ عامر کہتا ہے:

میں شوریٰ کے روز حضرت علیؑ کے ساتھ اس گھر میں موجود تھا میں نے خود سنا کہ آپ ارکان شوریٰ سے اس طرح کہہ رہے تھے کہ میں ایک ایسی محکم دلیل تمہارے سامنے قائم کرتا ہوں جسے عرب و عجم مل کر بھی تبدیل کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ تمہیں خدا کی قسم! بتلاؤ کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص ہے کہ جس نے مجھ سے پہلے خدا کو اس کی توحید و یکتائی کے ساتھ پکارا ہو؟۔ اس کے بعد آپ نے خاندانِ رسالت کی معنوی عظمتیں بیان کیں یہاں تک کہ آپ نے فرمایا: تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں بتلاؤ کیا تمہارے درمیان میرے علاوہ اور کوئی شخص ایسا ہے جس کے حق میں پیغمبرؐ نے یہ کہا ہو:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ انصر من نصرہ لیبلغ الشاھد الغائب

سب نے کہا: نہیں[1]

یہ روایت حموینی نے فرائد السمطین باب ۵۸ میں اور اسی طرح "ابن حاتم" نے "دار النظیم" میں، دار قطنی نے اپنی کتاب میں، ابن عقدہ نے اپنی کتاب میں اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے۔

فرائد السمطین کے باب ۵۸ میں منقول ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت عثمان کے زمانے میں مسجد کے اندر چند لوگوں کی موجودگی میں بھی واقعہ غدیر سے استدلال کیا تھا۔ اسی طرح کوفہ میں ان لوگوں کے سامنے بھی جو پیغمبرؐ کی طرف سے ان کی خلافت بلافصل کے لیے نص ہونے کا انکار کر رہے تھے صراحت کے ساتھ اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔ الغدیر کے مطابق اس حدیث (یعنی کوفہ میں واقعہ غدیر سے آپؑ کے استدلال) کو اہلِ سنت کی مشہور کتابوں اور معروف ماخذوں میں چار صحابہ اور چودہ تابعین سے روایت کیا گیا ہے۔

جنگِ "جمل" کے دن بھی "حاکم" کی کتاب مستدرک جلد سوم ص۳۷۱ کی روایت کے مطابق طلحہ کے سامنے حدیث غدیر سے استدلال فرمایا۔

نیز جنگِ "صفین" کے دن "سلیم بن قیس ہلالی" کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ نے اپنی لشکر گاہ میں مہاجرین و انصار اور اطراف و جوانب سے آنے والے لوگوں کے سامنے اس حدیث سے استدلال کیا۔ اور بدریین (جو جنگ بدر میں پیغمبرؐ کے ساتھ تھے) میں سے بارہ افراد نے کھڑے ہو کر گواہی دی کہ انہوں نے یہ حدیث پیغمبرؐ سے سنی ہے۔

---

[1] مناقب صفحہ ۲۱۷۔

حضرت علی علیہ السلام کے علاوہ بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہراؑ ، امام حسنؑ ، امام حسینؑ ، عبداللہ بن جعفر ، عمار یاسر ، قیس بن سعد عمر بن عبدالعزیز اور عباسی خلیفہ مامون نے بھی اس حدیث کو سند کے طور پر پیش کیا ہے ۔ یہاں تک کہ عمرو بن عاص نے اس خط میں جو اُس نے معاویہ کو اس لیے لکھا تھا تاکہ وہ اس پر اچھی طرح سے یہ بات ثابت کردے کہ وہ حضرت علیؑ کے مرتبہ ومقام اور معاویہ کی وضع سے متعلق حقائق سے خوب آگاہ ہے ، اس خط میں اس نے صراحت کے ساتھ مسئلہ غدیر کا ذکر کیا تھا اور اسے خطیب خوارزمی حنفی نے اپنی کتاب مناقب کے صفحہ ۱۲۴ پر نقل کیا ہے ۔

وہ لوگ جو اس سے زیادہ توضیحات کے خواہاں ہیں اور حضرت علیؑ ، اہل بیتؑ ، صحابہ اور غیر صحابہ کی طرف سے حدیث غدیر سے استدلال کرنے کے بارے میں ان روایات کے مختلف ماخذوں میں بیان سے آگاہ ہونا چاہیں تو وہ کتاب الغدیر جلد اول صفحات ۱۵۹ تا ۲۱۳ کی طرف رجوع کریں ۔ علامہ امینی مرحوم نے صحابہ وغیر صحابہ میں سے ۲۲ حضرات سے مختلف مواقع پر اس حدیث سے استدلال کرنے کی روایات پیش کی ہیں ۔

۵ ۔ آیت کے آخری جملہ کا مفہوم کیا ہے ؟

بعض کہتے ہیں کہ اگر یہ آیت حضرت علیؑ کو خلافت وولایت کا منصب عطا کرنے اور واقعہ غدیر سے مربوط ہے تو پھر یہ آخری جملہ کہ : ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین ۔ یعنی "خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا " اس مسئلے سے کیا ربط رکھتا ہے ۔

اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے بس اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ لفظ کفر لغت میں بھی اور اسی طرح قرآن کی زبان میں بھی انکار ، مخالفت اور ترک کے معنی میں ہے ۔ کبھی انکارِ خدا یا انکار نبوت پیغمبر کے لیے بولا جاتا ہے اور کبھی دوسرے احکام کے مقابلے میں انکار یا مخالفت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے ۔ سورہ آلِ عمران آیت ۹۷ میں حج کے بارے میں ہے :

ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین

جو لوگ حج کے حکم کو پامال کرتے ہیں اور اس کی مخالفت کرتے ہیں تو وہ خدا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے خدا تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے ۔

سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ میں جادوگروں کے لیے بھی اور ان کے بارے میں بھی کہ جو جادو میں آلودہ نہیں لفظ کفر بولا گیا ہے :

وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ

سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں بھی ہے کہ شیطان اُن لوگوں کے مقابلے میں کہ جنہوں نے اس کی پیروی اور اطاعت کی ، قیامت کے دن صریحاً اظہارِ نفرت کرتے ہوئے اُن سے کہے گا کہ تم نے احکام الٰہی کی اطاعت میں مجھے اس کا شریک قرار دیا تھا اور میں آج تمہارے اس کام سے کفر کرتا ہوں ۔

" اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ " (ابراہیم ۔ ۲۲)

اس بنا پر کفر کا اطلاق مسئلہ ولایت ورہبری کے مخالفین پر ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ۔

۲۔ ایک ہی زمانہ میں دو ولی ہو سکتے ہیں؟

ایک اور بہانہ جو اس متواتر حدیث اور اسی طرح زیر بحث آیت سے روگردانی کے لیے کیا گیا ہے یہ ہے کہ اگر پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو غدیر خم میں ولایت و رہبری و خلافت کے لیے مقرر کر دیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک ہی زمانے میں دو رہبر اور دو پیشوا ہو جائیں گے۔

لیکن اس آیت کے نزول اور حدیث کے ورود کے زمانے کے خاص اوضاع و شرائط اور مخصوص حالات و کوائف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اسی طرح ان قرائن پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو پیغمبرؐ کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں یہ بہانہ بھی کلی طور پر برطرف ہو جاتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے آخری مہینوں میں واقع ہوا ہے جبکہ آپؐ آخری احکام کو لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ خصوصاً جب کہ آپؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا کہ میں بہت جلدی تمہارے درمیان سے جا رہا ہوں اور دو گرانمایہ چیزیں تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں۔

جو شخص یہ گفتگو کر رہا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے جانشین کے مقرر کرنے کے انتظام میں مصروف ہے اور وہ آئندہ کے لیے پروگرام دے رہا ہے نہ کہ اپنے زمانے کے لیے۔ لہٰذا اس سے صاف واضح اور روشن ہے کہ اس سے دو امیروں اور دو پیشواؤں کا ایک ہی زمانے میں وجود مقصود نہیں ہے۔

وہ بات جو خاص طور پر لائق توجہ ہے یہ ہے کہ ایک طرف تو بعض علمائے اہل سنت یہ اعتراض پیش کر رہے ہیں تو بعض دوسرے ایسے ہیں جنہوں نے اس کے مقابلے میں ایک اور اعتراض پیش کر دیا ہے اور وہ یہ کہ پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کی ولایت و خلافت کے منصب پر تقرری تو کی ہے لیکن اس کی تاریخ صاف اور واضح طور پر بیان نہیں فرمائی، تو اس صورت میں کیا رکاوٹ ہے کہ یہ ولایت و خلافتِ علیؑ کا بیان دوسرے تین خلفاء کے بعد کے لیے ہو۔

حقیقتاً کتنی حیرت کی بات ہے کہ کوئی چھت کے اُس طرف گر رہا ہے اور کوئی اس طرف۔ لیکن تمن واقعہ کو مان لینے میں تعصبات حائل ہو گئے ہیں۔ ذرا کوئی اُن سے یہ تو پوچھے کہ اگر پیغمبر اکرمؐ یہ چاہتے تھے کہ اپنے چوتھے خلیفہ کو معین کریں اور مسلمانوں کے آئندہ کی فکر تھی تو کیوں اپنے پہلے، دوسرے اور تیسرے خلیفہ کا ذکر جس کا تعین چوتھے خلیفہ پر مقدم و لازم تھا غدیر خم کے خطبہ میں نہ فرمایا۔

یہاں ہم اپنا سابقہ بیان دہراتے ہیں اور اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ اگر مخصوص نظریات درمیان میں نہ ہوتے تو یہ تمام اعتراضات اس آیت اور اس حدیث کے سلسلے میں نہ کیے جاتے جس طرح سے کہ دوسرے مواقع پر اس قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہوا ہے۔

۶۸۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ مَا

أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○

۶۹۔ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

ترجمہ

۶۸۔ اے اہلِ کتاب تم کچھ وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ تم تورات و انجیل اور اس کو جو تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے قائم اور برپا نہ کرو لیکن جو کچھ تجھ پر تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے (نہ صرف ان کی بیداری کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ) اُن میں سے بہت سوں کے طغیان اور کفر کو زیادہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اس کافر قوم (اور ان کی مخالفت) سے غمگین نہ ہو۔

۶۹۔ وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور یہودی، صائبین اور عیسائی جو بھی خدائے یگانہ اور روزِ قیامت پر ایمان لے آئے گا اور عمل صالح بجا لائے گا تو نہ ایسے لوگوں پر کوئی خوف طاری ہو گا اور نہ ہی وہ محزون و مغموم ہوں گے۔

شانِ نزول

تفسیر "مجمع البیان" اور تفسیر قرطبی میں ابن عباس سے اس طرح منقول ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت پیغمبرؐ کی خدمت میں آئی اور پہلا سوال یہ کیا کہ کیا آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ تورات خدا کی طرف سے ہے۔ پیغمبرؐ نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم بھی تورات کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ اور کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے (درحقیقت تورات ہمارے اور آپ کے درمیان قدرِ مشترک ہے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے کہ جس پر صرف آپ ہی عقیدہ رکھتے ہیں، تو کیا ہی اچھا ہو کہ ہم تورات کو تو قبول کر لیں اور اس کے علاوہ کی نفی کر دیں)۔ اس پر پہلی آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم اس سورہ کی آیات کی تفسیر میں اب تک پڑھ چکے ہیں کہ ان میں قابلِ لحاظ حصہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی وعظ

شکنیوں، بحثوں، سوالات اور اعتراضات سے ہی متعلق تھا۔ یہ آیت بھی اُن بحثوں کے ایک اور رُخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ان کی اس کمزور منطق کا جواب دے رہی کہ جو یہ چاہتے تھے کہ تورات کو تو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک متفق علیہ کتاب ہونے کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور قرآن کو ایسی کتاب ہونے کی حیثیت سے کہ جس میں اختلاف پایا جاتا ہے چھوڑ دیا جائے۔ یہ آیت انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہی ہے اہلِ کتاب تمہاری کوئی بھی وقعت نہیں ہوگی جب تک کہ تم تورات وانجیل اور تمام آسمانی کتابوں کو جو تم پر نازل ہوئی ہیں بلا استثنا اور بغیر کسی تفاوت کے تسلیم نہ کرو گے۔

" قل یا اھل الکتب لستم علی شیٔ حتی تقیموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیکم من ربکم "

کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ تمام کتابیں ایک ہی مبداء سے صادر ہوئی ہیں اور ان سب کی اساس اور اصول بھی ایک سے ہیں اگرچہ ان میں سے آخری کتاب کامل ترین اور جامع ترین ہے۔ اسی بنا پر لازم العمل ہے اس کے علاوہ پہلی کتابوں میں آخری کتاب یعنی قرآن کے بارے میں متعدد بشارتیں بھی آئی ہیں۔ وہ مدعی ہیں اس بات کے کہ وہ تورات وانجیل کو قبول کرتے ہیں پس اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ ان بشارتوں کو بھی قبول کریں اور جب کہ انہوں نے ان نشانیوں کو قرآن میں پالیا ہے تو اس کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیں۔

مذکورہ بالا آیت یہ بھی کہتی ہے کہ صرف دعویٰ ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان آسمانی کتابوں پر عملاً قائم ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں "ہماری اور" تمہاری "کتاب کی بات نہیں ہے۔ معاملہ تو آسمانی کتابوں کا ہے اور جو کچھ خدا کی طرف سے آیا ہے، اُس کا ہے۔ پس تم کس طرح اس کمزور منطق کے ذریعے آخری کتاب کو نظر انداز کر سکتے ہو۔ قرآن پھر ایک مرتبہ ان کی اکثریت کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُن میں سے بہت سے لوگ نہ صرف ان آیات سے پند و نصیحت نہیں لیتے اور ہدایت حاصل نہیں کرتے بلکہ ان کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کا کفر و طغیان بڑھتا ہی جاتا ہے۔

" ولیزیدن کثیرا منھم ما انزل الیک من ربک طغیانا وکفرا "

اور آیاتِ حق اور صحیح باتوں کی بیمار انکار اور ہٹ دھرمی سے بھرے ہوئے دلوں پر ایسی ہی اُلٹی تاثیر پیدا ہوا کرتی ہے۔

آیت کے آخر میں اپنے پیغمبر کو اس منحرف اکثریت کی انتہائی سختی کے مقابلہ میں تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: اس کافر جمعیت کی مخالفتوں سے غمگین نہ ہو کیونکہ اس کا نقصان خود اُن ہی کی طرف لوٹ جائے گا اور تجھے اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچے گا (فلا تأس[1] علی القوم الکافرین)۔

یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اس آیت کے مفاہیم قوم یہود کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مسلمان بھی اگر صرف اسلام کے دعویٰ پر ہی قناعت کریں اور تعلیمات انبیاءؑ کے اصول اور خاص طور پر اپنی آسمانی کتاب قرآن کو عملاً برپا نہ کریں تو ان کی کسی قسم کی کوئی حیثیت اور قدر و قیمت بارگاہِ خدا میں ہوگی نہ انفرادی واجتماعی زندگی میں، اور وہ ہمیشہ زبوں حال، زیر دست اور شکست خوردہ رہیں گے۔

---

[1] "تأس" کا مادہ "أس" ہے جس کا معنی ہے "غم و اندوہ"۔

بعد والی آیت میں پھر نئے سرے سے اس حقیقت کو مؤکد تاکید قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام اقوام و ملل اور تمام مذاہب کے پیروکار بلا استثنا خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی، صابئین ہوں یا نصاریٰ صرف اسی صورت میں اہلِ نجات ہوں گے اور اپنے آئندہ سے خوف زدہ اور گذشتہ سے محزون و غمگین نہ ہوں گے جب کہ وہ خدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہوں گے اور نیک اعمال انجام دیں گے۔

(ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والصابئون والنصریٰ من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر وعمل صالحًا فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

یہ آیت حقیقت میں ان لوگوں کے لیے دندان شکن جواب ہے جو نجات کو کسی خاص ملت اور قوم میں منحصر سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انبیاء کے احکام میں تبعیض (بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا) کے قائل ہو جائیں اور مذہبی دعوتوں کو قومی تعصبات سے ملا دیں۔ آیت کہتی ہے کہ راہِ نجات ایسی باتوں کو برکنار رکھنے میں منحصر ہے۔

جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۶۲ کے ذیل میں کہ جس کا مضمون مذکورہ بالا آیت کے ساتھ تقریباً یکساں ہے ہم واضح کر چکے ہیں کہ بعض لوگ ایک سفسطہ آمیز بیان کے ذریعہ چاہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کو "صلح کل" کے مسلک پر دلیل قرار دیں اور تمام مذاہب کے پیروکاروں کو اہلِ نجات فرض کر لیں اور اسے نظر انداز کر دیں کہ درحقیقت آسمانی کتابوں کے یکے بعد دیگرے نازل ہونا جہانِ انسانیت کے بتدریج درجہ کمال تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ آیت "عمل صالحا" کی تعبیر کے ذریعے اس حقیقت کو مشخص و ممتاز کرتی ہے کہ مذاہب کے اختلاف کی صورت میں آخری قانون پر عمل کریں۔ کیونکہ منسوخ شدہ قوانین پر عمل کرنا عمل صالح نہیں ہے۔ بلکہ عمل صالح تو موجودہ قوانین اور آخری قانون پر عمل کرنا ہے[1]

علاوہ ازیں اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی قابلِ قبول ہے کہ (من اٰمن باللّٰہ والیوم الاٰخر وعمل صالحًا) کا جملہ صرف یہود و نصاریٰ اور صابئین کی طرف لوٹتا ہو کیونکہ "الذین اٰمنوا" جو آیت کی ابتداء میں ذکر ہوا ہے وہ اس قید کا محتاج نہیں ہے۔ تو اس طرح سے اس آیت کا معنی یوں ہو گا کہ صاحبانِ ایمان اور مسلمان افراد اور اسی طرح یہود و نصاریٰ اور صابئین بشرطیکہ وہ بھی ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کر لیں اور عمل صالح بجا لائیں تو سب کے سب اہلِ نجات اور رستگار ہوں گے اور کسی بھی قسم کے لوگوں کے سابقہ مذہبی اعتقادات کا اس صورت میں ان پر کوئی اثر نہ ہو گا اگر وہ ایمان لے آئیں اور راستہ سب کے سامنے کھلا ہوا ہے (غور کیجئے)۔

۷۰۔ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا

---

[1] اس کی مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ اُردو ترجمہ جلد اول ص ۲۴۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝

۷۱۔ وَحَسِبُوٓا اَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۷۰۔ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف رسول بھیجے لیکن جب بھی کوئی پیغمبر ان کی خواہشات نفسانی اور میلانات کے خلاف آتا تو بعض کی تو تکذیب کرتے اور بعض کو قتل کر دیتے۔

۷۱۔ اور انہوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ اس کا کوئی بدلہ اور سزا نہ ہوگی لہٰذا (وہ حقائق کو دیکھنے اور سچی باتوں کو سننے سے اندھے اور بہرے ہو گئے اس کے بعد پھر (وہ بیدار ہوئے اور) خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی اس کے بعد دوبارہ (خواب غفلت میں جا پڑے اور) ان میں سے بہت سے اندھے اور بہرے ہو گئے اور خدا ان کی کارگزاریوں پر خوب اچھی طرح مطلع ہے۔

تفسیر

سورہ بقرہ میں جو آیات گزر چکی ہیں اُن میں اور اس سورہ کے شروع میں جو آیات گزری ہیں اُن میں اُس تاکیدی عہد و پیمان کی طرف جو خداوند تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے لیا تھا اشارہ ہو چکا ہے۔ اس آیت میں دوبارہ اس عہد و پیمان کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل سے پیمان لیا اور ان کی ہدایت اور اس پیمان کو وفا کرنے کا مطالبہ کرنے کے لیے ان کی طرف پیغمبر بھیجے (لقد اخذنا میثاق بنی اسرائیل وارسلنا الیھم رسلاً)۔

جیسا کہ جلد اول میں بیان ہو چکا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیمان وہی ہے جس کی طرف سورہ بقرہ کی آیت ۹۳ میں اشارہ ہوا ہے یعنی اس پر عمل کرنے کا پیمان جو خدا نے ان پر نازل کیا تھا[1]

پھر مزید کہتا ہے: انہوں نے نہ صرف یہ کہ اُس پیمان پر عمل نہیں کیا بلکہ جب بھی کوئی پیغمبر ان کے میلانات اور ہوا و ہوس

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۹۳ کے ذیل میں۔

کے خلاف کوئی حکم لاتا تو وہ اس کی مخالفت میں سخت ترین مقابلے اور جھگڑے پر اتر آتے تھے۔ اُن میں سے کچھ انبیاء کی تو وہ تکذیب کرتے تھے اور انہیں جھٹلاتے تھے اور جن انبیاء کی تکذیب کرنے پر اور ان کے اثرات کو روکنے پر قادر نہ ہوتے تھے انہیں قتل کر دیتے تھے۔

(کلما جاءهم رسول بما لا تهوى انفسهم فريقا كذبوا و فريقا يقتلون)۔

یہ ہیں طریقۂ منحرف اور خود خواہ افراد کے کہ بجائے اپنے رہبروں کی پیروی کرنے کے وہ اس بات پر مصر ہیں کہ رہبران کے میلانات اور خواہشات کے تابع ہوں اور اگر وہ ان کے میلانات اور خواہشات کے خلاف ہوں تو اس صورت میں نہ صرف ان کی رہبری قبول نہیں کرتے بلکہ انہیں زندہ رہنے کا حق دینے کو بھی تیار نہیں ہوتے۔

مندرجہ بالا جملے میں "کذبوا" ماضی کی شکل میں اور "یقتلون" مضارع کی صورت میں آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب قبل و بعد کی آیات کی لفظی مناسبت کا لحاظ رکھنے کے علاوہ کہ جو سب کے سب مضارع کی صورت میں آئے ہیں یہ ہو کہ چونکہ فعل مضارع استمرار پر دلالت کرتا ہے لہٰذا خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اس روح اور فکر کے اُن میں ہمیشہ جاری رہنے کو بیان کرے کہ پیغمبروں کو جھٹلانا اور انہیں قتل کرنا ان کی زندگی کا کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ ان کا یہ عمل ایک مستقل پروگرام اور مکتب کی صورت اختیار کر گیا تھا[1]۔

بعد والی آیت میں ان سرکشیوں اور جرائم کے باوجود ان کی بے جا خود فریبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ان حالات کے باوصف وہ یہ گمان کرتے تھے کہ کوئی عذاب و سزا انہیں دامن گیر نہ ہو گی۔

جیسا کہ دوسری آیات میں تصریح ہو چکی ہے وہ خود کو ایک برتر قوم و قبیلہ سمجھتے تھے اور خود کو خدا کا بیٹا کہتے تھے (وحسبوا ان لا تكون فتنة)۔

آخر کار اس خطرناک فریب خوردگی نے اور اپنے آپ کو برتر سمجھنے نے ایک قسم کا پردہ ان کی آنکھوں اور کانوں پر ڈال دیا تھا جس کی وجہ سے وہ آیات خدا دیکھنے سے اندھے اور کلمات حق سننے سے بہرے ہو گئے (فعموا وصموا)۔

لیکن جب انہوں نے اللہ کے عذاب کے نمونے اور اپنے بُرے اعمال کے انجام کا مشاہدہ کیا تو پشیمان ہوئے اور توبہ کر لی اور اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوئے کہ خداوند تعالیٰ کی دھمکیاں یقینی اور سچ ہونے والی ہیں نیز وہ قطعاً کوئی برتر خاندان نہیں ہیں تو خدا نے بھی اُن کی توبہ کو قبول کر لیا (ثم تاب الله عليهم)۔

مگر یہ بیداری اور ندامت و پشیمانی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی اور انہوں نے دوبارہ طغیان و سرکشی اختیار کر لی اور حق و عدالت کو ٹھکرانا شروع کر دیا اور ایک دفعہ پھر غفلت کے پردے کہ جو گناہ کے اندر ڈوب جانے کے آثار ہیں اُن کی آنکھوں اور کانوں پر پڑ گئے اور پھر وہ آیات حق دیکھنے سے اندھے اور حق کی باتیں سننے سے بہرے ہو گئے اور اُن میں سے بہت سوں کی یہ حالت ہو گئی (ثم عموا وصموا كثير منهم)۔

---

[1] حقیقت میں "فريقا كذبوا و فريقا يقتلون" کا جملہ جیسا کہ مجمع البیان اور دیگر تفاسیر میں آیا ہے در اصل "کذبوا و قتلوا" اور "یکذبون و یقتلون" تھا

شاید "عموا " (اندھے ہو گئے) کو "صموا " (بہرے ہو گئے) پر مقدم رکھنے میں اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ پہلی دفعہ انہیں آیات خدا اور پیغمبرؐ کے معجزات کو دیکھنا چاہیے اور پھر ان کے احکام کو سننا چاہیے۔ "کثیر منھم " (ان میں سے بہت سے) کا ذکر عموا و صموا کے الفاظ کی تکرار کے بعد درحقیقت دونوں الفاظ کی توضیح کے طور پر ہے یعنی غفلت و بے خبری اور اندھے اور بہرے ہونے کی حالت حقائق کے مقابلے میں کوئی عمومی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ہمیشہ ایک صالح اور نیک اقلیت بھی ان کے درمیان موجود رہی تھی اور یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کے یہودیوں پر حملے کسی طرح بھی نسل اور قبائلی پہلو نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ صرف ان کے اعمال کی وجہ سے تھے۔

کیا "عموا و صموا" کے الفاظ کی تکرار کلیت اور تاکید کا پہلو رکھتی ہے یا یہ دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل میں ہوئے تھے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ دو مختلف واقعات کی طرف اشارہ ہیں ایک بابل کے لوگوں کے حملے کے وقت اور دوسرے ایرانیوں اور رومیوں کے حملے کے زمانے میں کہ جس کی طرف قرآن نے سورہ بنی اسرائیل کی ابتداء میں ایک مختصر سا اشارہ کیا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ وہ بارہا اس حالت میں گرفتار ہوتے رہے ہیں اور جب بھی وہ اپنے برے اعمال کے منحوس نتائج دیکھتے تو توبہ کر لیتے اور پھر توبہ کو توڑ دیتے نہ یہ کہ صرف دو ہی مرتبہ ایسا ہوا۔ آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پر معنی جملے کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ خدا کسی وقت بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں تھا اور تمام کام جو وہ انجام دیتے ہیں انہیں وہ دیکھتا ہے۔

(واللہ بصیر بما یعملون)

۷۲۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۖ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۖ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ○

۷۳۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ وَإِنْ لَمْ يَنْتَهُوا عَمَّا يَقُولُونَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

۷۴۔ أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

ترجمہ

۷۲۔ جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ یقیناً کافر ہیں (جبکہ خود) مسیح نے یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل تم خدائے واحد و یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی کیونکہ جو شخص کسی کو خدا کا شریک قرار دے گا خدا نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی یاور و انصار نہیں ہے۔

۷۳۔ جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے وہ بھی یقیناً کافر ہو گئے ہیں کیونکہ معبود یگانہ کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے اور اگر وہ اپنے اس قول سے دستبردار نہ ہوئے تو اُن میں سے (اس عقیدہ پر قائم رہنے والے) کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

۷۴۔ کیا وہ خدا کے حضور توبہ نہیں کرتے، اُس کی طرف نہیں پلٹتے اور اس سے طلب بخشش نہیں کرتے جبکہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تفسیر

ان مباحث کے بعد کہ جو گذشتہ آیات میں یہودیوں کے انحرافات سے متعلق گزری ہیں، یہ آیات اور ان سے بعد والی آیات عیسائیوں کے انحرافات کے متعلق بحث کرتی ہیں۔ سب سے پہلے تو خدا اس آیت میں مسیحیت کے اہم ترین انحراف یعنی مسئلہ الوہیت مسیح اور تثلیث معبود سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے: یقیناً جنہوں نے یہ کہا کہ خدا مسیح ابن مریم ہی ہے وہ کافر ہو گئے ہیں۔

(لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم)

اس سے بڑھ کر اور کیا کفر ہو گا کہ ہر جہت سے لامحدود خدا کو ایسی مخلوق کے ساتھ کہ جو ہر جہت سے محدود ہے ایک اور متحد سمجھ لیا جائے اور مخلوق کی صفات کو خالق میں قرار دے لیا جائے جبکہ خود مسیح نے صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل سے کہا کہ تم خدا یگانہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔

(وقال المسیح یا بنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی و ربکم)

اور اس طرح سے اپنے متعلق ہر قسم کے غلو اور شرک سے نفی کرتے ہوئے اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا اور خود کو خدا تعالےٰ کی دوسری مخلوقات کی طرح ہی ایک مخلوق کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ ساتھ ہی اس مطلب کی تاکید مزید اور ہر قسم کا شک و شبہ دور کرنے کے لیے مسیح نے مزید کہا کہ "جو خدا کے لیے کوئی شریک قرار دے اس پر خدا نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔"

(انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ و ماوٰیہ النار)

پھر مزید تاکید اور اس حقیقت کے اثبات کے لیے کہ شرک وغلو ایک قسم کا کھلم کھلا ظلم ہے اُن سے کہتا ہے کہ ستمگروں اور ظالموں کے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔

(و ما للظّٰلمین من انصار)

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ تاریخ مسیحیت یہ کہتی ہے کہ تثلیث کا قرن اوّل میں اور خصوصاً حضرت مسیحؑ کے زمانے میں کوئی وجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ موجودہ انجیلوں میں بھی اپنی تمام تر تحریفات کے باوجود تثلیث کے بارے میں ذراسی بات بھی دکھائی نہیں دیتی اور خود مسیحی محققین بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں۔

بنابریں مذکورہ بالا آیت میں حضرت مسیحؑ کی ثابت قدمی و پافشاری اور مسئلہ توحید کے بارے میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ مسیحیت کے موجودہ منابع اور کتب سے بھی ہم آہنگ ہے اور یہ جات قرآن کی عظمت کے دلائل میں سے شمار ہوتی ہے۔[1]

ضمنی طور پر اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ اس آیت میں جو موضوع زیر بحث ہے وہ مسئلہ غلو اور جناب مسیحؑ کی خدا کے ساتھ وحدت ہے دوسرے لفظوں میں "توحید در تثلیث" کا معاملہ زیرِ نظر ہے لیکن بعد کی آیت میں مسیحیوں کے نقطۂ نظر سے "خداؤں کے تعدد" یعنی تثلیت در توحید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "جنہوں نے یہ کہا کہ خدا تین اقانیم میں سے تیسرا اقنوم[2] ہے وہ مسلّماً کافر ہیں (لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلثۃ)۔

بہت سے مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں شیخ طوسی نے تبیان میں اور رازی و قرطبی نے اپنی اپنی تفسیروں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلی آیت تو عیسائیوں کے یعقوبیہ نامی فرقے کے بارے میں ہے جو خدا کو حضرت مسیحؑ کے ساتھ متحد جانتے ہیں لیکن یہ آیت ملکانیہ اور نسطوریہ نامی فرقوں کے بارے میں ہے۔ یہ لوگ تین خداؤں کے قائل ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اسے مسیحیوں کے بعض فرقوں سے مخصوص کہنا حقیقت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا چونکہ تثلیث کا عقیدہ تو تمام عیسائیوں میں عمومیت رکھتا ہے جیسا کہ خدا کی توحید اور یکتائی کا مسئلہ ہم مسلمانوں کے درمیان قطعی اور مسلّم ہے۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ جہاں وہ خداؤں کو تین مانتے ہیں وہاں وہ اسے یگانۂ حقیقی بھی مانتے ہیں اور ان کے اعتقاد کے مطابق تین حقیقی واحد مل کر ایک حقیقی واحد کو تشکیل دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیات ظاہراً ان دونوں قضیوں کے دو مختلف پہلوؤں کی طرف ہی اشارہ کرتی ہیں۔

پہلی آیت میں تین خداؤں کی وحدت کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت میں اُن کے تعدد کے عقیدے

---

[1] اس موضوع کی مزید وضاحت اور مسئلہ تثلیث اور وحدت در تثلیث کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد چہارم صفحہ ۱۴۶ کی طرف رجوع کریں (اُردو ترجمہ)۔

[2] "اقنوم" کا معنی ہے اصل اور ذات اور اس کی جمع "اقانیم" ہے۔

کی طرف اشارہ ہے اور ان دونوں بیانات کا ایک دوسرے کے ساتھ آگے پیچھے آنا درحقیقت اُن کے عقیدے کے بطلان کے روشن و واضح دلائل میں سے ہے کہ کس طرح ان کے زعم میں خدا وند تعالیٰ کبھی مسیح اور روح القدس کے ساتھ مل کر حقیقتاً ایک ہوجاتا ہے اور کبھی حقیقتاً تین چیزیں بن جاتا ہے کیا تین کا ایک کے ساتھ مساوی ہوجانا کوئی معقول بات ہے۔

جو بات اس حقیقت کی تائید کرتی ہے یہ ہے کہ عیسائیوں میں ایک گروہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا جو تین خداؤں کا قائل نہ ہو[1]

پھر قرآن قطعی طور پر ان کے جواب میں کہتا ہے: خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے (و ما من الٰہ الا الٰہ واحد)۔ خصوصاً لفظ "من" کا لفظ "الٰہ" سے پہلے آنا دوسرے معبودوں کی نفی کرتا ہے۔

دوسری مرتبہ پھر انتہائی سخت اور تاکیدی لب ولہجہ میں اُن کو اس خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اگر وہ اس عقیدے سے دستبردار نہ ہوں گے تو اُن لوگوں کو جو اس کفر پر باقی رہیں گے ضرور دردناک عذاب پہنچے گا (و ان لم ینتھوا عما یقولون لیمسن الذین کفروا منھم عذاب الیم)۔

"منھم" میں کلمہ "من" بعض کی نظر میں بیانیہ ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اسے "بعض" کے مفہوم میں ہونا چاہیے اور حقیقت میں یہ ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہے اور قرآن کی دعوت توحید کے بعد بھی صحیح عقیدے کی طرف نہیں پلٹے نہ کہ وہ لوگ جنہوں نے توبہ کرلی اور صحیح عقیدہ کی طرف پلٹ آئے۔

تفسیر المنار میں کتاب اظہار الحق سے ایک داستان نقل ہوئی ہے کہ جس کا یہاں پر ذکر کرنا غیر مناسب نہیں ہے۔ اس سے اس بات کی نشاندہی ہوجاتی ہے کہ عیسائیوں کی تثلیث و توحید کتنی ناقابلِ فہم ہے۔

اس کتاب کا مؤلف کہتا ہے: تین آدمی عیسائی ہوگئے۔ پادری نے عیسائیت کے ضروری عقائد کہ جن میں سے ایک عقیدہ تثلیث بھی تھا انہیں تعلیم کر دیا۔ ایک دن ایک کٹر عیسائی عقیدہ رکھنے والا اُس پادری کے پاس آیا اور اُس نے اُن لوگوں کے بارے میں جو نئے نئے عیسائی ہوئے تھے سوال کیا۔ پادری نے انتہائی خوشی کے عالم میں ان تین افراد کی طرف اشارہ کیا تو اس نے فوراً پوچھا کہ کیا انہوں نے ہمارے ضروری عقائد میں سے کچھ یاد کرلیا ہے۔ پادری نے بڑی دلیری اور تاکید کے ساتھ کہا: ہاں، ہاں!۔ اس کے بعد نمونے کے طور پر اُن میں سے ایک کو آواز دی تاکہ مہمان کے سامنے اس کی آزمائش کرے۔ پادری نے کہا: تم تثلیث کے بارے میں کیا جانتے ہو؟۔ اس نے جواب میں کہا آپ نے مجھے یہ بتلایا ہے کہ خدا تین ہیں۔ ایک آسمان میں ہے دوسرا زمین میں ہے کہ جو مریم کے شکم سے پیدا ہوا ہے۔ تیسرا خدا کبوتر کی شکل میں دوسرے خدا پر تیس سال کی عمر میں نازل ہوا۔ پادری کو غصہ آگیا اور اُس کو باہر نکال دیا۔ کہنے لگا: اسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر دوسرے شخص کو آواز دی تو اُس نے اس سوال کے جواب میں تثلیث کے بارے میں یہ بتلایا کہ آپ نے مجھے اس طرح تعلیم دی ہے کہ خدا تین تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک سولی پر چڑھا دیا گیا لہٰذا اب ہمارے

---

[1] بعض روایات و تواریخ میں نقل ہوا ہے کہ عیسائیوں میں ایک ایسی اقلیت بھی وجود رکھتی ہے جو تین خداؤں کے قائل نہیں ہیں بلکہ صرف عیسیٰ کی خدائے وحدت کے قائل ہیں لیکن آج ایسے لوگ بہت کمیاب ہیں۔

پاس صرف دو خدا باقی رہ گئے ہیں۔ پادری کو اس پر اس سے بھی زیادہ غصہ آیا اور اسے بھی باہر نکال دیا۔ اس کے بعد تیسرے آدمی کو جو سب سے زیادہ سمجھدار اور دینی عقائد کو یاد کرنے میں زیادہ کوشش کرنے والا تھا، آواز دی اور وہی مسئلہ اس سے پوچھا تو اس نے بڑے ادب اور احترام سے کہا: اے میرے پیشوا جو کچھ آپ نے مجھے تعلیم دی ہے میں نے اسے مکمل طور پر یاد کر لیا ہے اور حضرت مسیح کی برکت سے میں نے اُسے اچھی طرح سے سمجھ لیا ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ خدا ئے یگانہ سہ گانہ ہے (ایک خدا تین ہیں) اور تین خدا ایک ہیں۔ اُن میں سے ایک کو انہوں نے سولی پر لٹکا دیا اور وہ مر گیا اس بنا پر وہ سب کے سب مر گئے کیونکہ وہ باقیوں کے ساتھ متحد اور ایک ہی تھا لہٰذا اس طرح سے اب کوئی خدا باقی نہیں رہا۔

ان آیات میں سے تیسری آیت میں دعوت دی گئی ہے کہ اس کفر آمیز عقیدے سے توبہ کرو یہ دعوت اس لیے ہے تاکہ خدا اپنی عفو و بخشش ان کے شامل حال کر دے۔ لہٰذا کہا گیا ہے: کیا وہ ان تمام باتوں کے بعد خدائے یکتا کی طرف نہیں پلٹتے اور اس شرک اور کفر سے مغفرت نہیں چاہتے حالانکہ خدا غفور و رحیم ہے۔

۷۵۔ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۖ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○

۷۶۔ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

۷۷۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ ○ ع

ترجمہ

۷۵۔ مسیح ابن مریم فقط فرستادۂ خدا تھے اُن سے پہلے اور دوسرے بھی فرستادگان الٰہی ہی تھے ان کی ماں بھی بہت سچی خاتون تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھاتے تھے (لہٰذا تم کس طرح سے مسیح کی الوہیت کا دعویٰ اور اس کی ماں کی عبادت کرتے ہو) غور کرو کہ ہم کس کس طرح سے نشانیوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ حق سے

کس طرح باز رکھے جاتے ہیں۔

۷۶۔ کہہ دو کیا تم خدا کے سوا ایسی چیز کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہیں نقصان ہی پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی تمہارے نفع کی مالک ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۷۷۔ کہہ دو اے اہلِ کتاب! تم اپنے دین میں غلو (اور تجاوز) نہ کرو اور حق کے سوا کچھ نہ کہو اور ایسے لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا اور سیدھے راستے سے منحرف ہو گئے۔

تفسیر

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں حضرت مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے غلو اور ان کی الوہیت کے اعتقاد سے متعلق گزری ہیں ان آیات میں واضح دلائل سے چند مختصر جملوں میں ان کے اس عقیدے کو باطل کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے کہ مسیح اور باقی انبیاء کے درمیان کیا فرق ہے کہ جس کی وجہ سے تم مسیح کی الوہیت کا عقیدہ رکھتے ہو۔ مسیح ابن مریم بھی خدا کے ایک رسول ہی تھے اور ان سے پہلے بھی خدا کی طرف سے رسول اور اس کے دیگر فرستادگان آتے رہے ہیں (ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل)۔

اگر خدا کی طرف سے رسول ہونا الوہیت اور شرک کی دلیل ہے تو پھر باقی انبیاء کے متعلق بھی اسی چیز کے قائل کیوں نہیں ہوتے لیکن ہم جانتے ہیں کہ کجرو عیسائی ہرگز اس بات پر قانع نہیں ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو فقط ایک فرستادۂ خدا (رسول) جانیں بلکہ ان کا عام عقیدہ کہ جس پر وہ فعلاً قائم ہیں یہ ہے کہ وہ انہیں خدا کا بیٹا اور ایک معنی میں خود خدا سمجھتے ہیں کہ جو بشریت کے گناہوں کو خریدنے کے لیے (نہ کہ ان کی ہدایت و رہبری کے لیے) آیا ہے۔ اسی لیے وہ اس کو "فادی" (نوع بشر کے گناہوں کا فدیہ ہونے والا) کا لقب دیتے ہیں۔

اس کے بعد اس بات کی تائید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: اس کی ماں بہت ہی سچی خاتون تھیں (و امہ صدیقۃ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اولاً تو وہ شخص کہ جس کی کوئی ماں ہے اور وہ ایک عورت کے شکم میں پرورش پاتا ہے اور بہت سی حوائج و ضروریات رکھتا ہے وہ کس طرح خدا ہو سکتا ہے؛ اور دوسرے یہ کہ اگر اس کی ماں قابلِ احترام ہے تو وہ اس بنا پر ہے کہ وہ بھی مسیح کی رسالت کے دوران ان سے ہم آہنگ تھیں اور کارِ رسالت میں ان کی مددگار رہتیں تو اس طرح سے وہ بھی خدا کی ایک خاص بندہ ہی تھیں لہٰذا ان کی ایک معبود کی طرح سے عبادت و پرستش نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ عیسائیوں میں رائج ہے کہ وہ ان کے مجسمہ کے سامنے عبادت و پرستش کی حد تک خضوع کرتے ہیں۔

اس کے بعد عیسیٰ کی ربوبیت کی نفی کی ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کرتے فرمایا: وہ اور ان کی ماں دونوں کھانا کھاتے

تھے (کانا یأکلان الطعام) توجو شخص اتنا محتاج ہے کہ اگر چند دن اُسے کھانا نہ ملے تو اُس میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہے وہ کس طرح سے پروردگار یا خدا کے ہم پلہ ہو سکتا ہے۔

آیت کے آخر میں ایک طرف تو اُن دلائل کے واضح ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری طرف ان واضح وآشکار دلائل کے مقابلہ میں ان کی ہٹ دھرمی، سختی اور نادانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ذرا دیکھو تو سہی کہ ہم کس طرح ان کے لیے دلائل کو وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد یہ دیکھو کہ وہ کس طرح حق قبول کرنے سے روگردانی کرتے ہیں (انظر کیف نبین لھم الاٰیات ثم انظر انّٰی یؤفکون)[1]۔

بنا بریں ان دو جملوں میں "انظر" کی تکرار اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک طرف تو ان روشن و واضح دلائل پر غور کرنا ہر شخص کی توجہ کے لیے کافی ہیں اور دوسری طرف اُن کے حیرت انگیز اور منفی عکس العمل پر نظر کرو کہ جو ہر شخص کے لیے تعجب خیز ہے۔

بعد والی آیت میں گذشتہ استدلال کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: انہیں معلوم ہے کہ مسیح خود سرتاپا احتیاجات بشری رکھتے اور خود اپنے نفع و نقصان پر قادر نہیں تھے چہ جائیکہ وہ تمہارے نفع و نقصان پر قادر ہوں (قل اتعبدون من دون الله ما لا یملک لکم ضرًا و لا نفعًا)۔

اسی بنا پر وہ بار ہا دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوئے۔ یا ان کے دوست گرفتار ہوئے۔ اگر لطف خدا ان کے شامل حال نہ ہوتا تو وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔

آخر میں انہیں اس خطرے سے آگاہ کرتا ہے کہ خبردار کہیں یہ گمان نہ کر لینا کہ خدا تمہاری ناروا باتوں کو سنتا نہیں ہے یا وہ تمہارے باطن سے آگاہ نہیں ہے، خدا سننے والا بھی ہے اور عالم و دانا بھی (و الله ھو السمیع العلیم)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ مسیح کے بشر ہونے اور ان کی مادی اور جسمانی ضروریات اور احتیاجات کا مسئلہ کہ جس کا قرآن نے ان آیات اور دوسری آیات میں تذکرہ کیا ہے حضرت عیسیٰ کی خدائی کا دعویٰ کرنے والے عیسائیوں کے لیے بہت بڑی مشکلات میں سے ایک ہے کہ جس کی توجیہ کے لیے وہ بہت ہی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور بعض اوقات وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے لیے جنبوں کے قائل ہوں جنبہ لاہوت اور دوسرے جنبہ ناسوت۔ جنبہ لاہوت کی نظر سے وہ خدا کے بیٹے ہیں اور خود خدا ہیں اور ناسوت کی نظر سے جسم اور مخلوقِ خدا ہیں اور اسی قسم کی دوسری توجیہات کہ جو ان کی منطق کے ضعف اور نادرستی کی بہترین مظہر ہیں۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے کہ آیت میں لفظ "من" کے بجائے "ما" استعمال ہوا ہے جو عام طور پر غیر ذوی العقول موجودات کے لیے ذکر ہوتا ہے یہ تعبیر شاید اسی بنا پر ہو کہ باقی معبودوں اور بتوں کو بھی جو پتھر اور لکڑی سے بنے ہوئے

---

[1] "یؤفکون" کا مادہ "افک" ہے اور یہ دراصل کسی چیز سے منحرف کرنے کے معنی دیتا ہے اور "ماٴفوک" ایسے شخص کو کہا جاتا ہے کہ جسے حق سے روک دیا گیا ہو، اگرچہ خود اس کی کوتاہی کی بنا پر ایسا ہوا ہو۔ اور چونکہ جھوٹ انسان کو حق سے روک دیتا ہے اس لیے اس کو "افک" کہا جاتا ہے۔

ہوتے ہیں اس جملہ کی عمومیت میں داخل کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اگر مخلوق کی پرستش جائز ہو تو پھر بت پرستوں کی بت پرستی بھی جائز شمار کی جائے۔ کیونکہ مخلوق ہونے میں سب برابر ہیں اور مساوی ہیں اور حقیقت میں حضرت مسیح کی الوہیت پر ایمان ایک طرح کی بت پرستی ہی ہے نہ کہ خدا پرستی۔

انبیاء کے بارے میں غلو کے سلسلے میں روشن دلائل سے اہلِ کتاب کا اشتباہ واضح ہو جانے کے بعد پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں دعوت دو کہ وہ اس راستے سے عملی طور پر پلٹ آئیں۔ فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو اور حق کے علاوہ کوئی بات نہ کہو (قل یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق[1])۔

البتہ عیسائیوں کا غلو تو واضح ہے باقی رہا یہودیوں کا غلو کہ اہلِ کتاب کا خطاب ان کے بارے میں بھی ہے، تو بعید نہیں ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جو وہ عزیر کے بارے میں کہتے تھے اور اُسے خدا کا بیٹا سمجھتے تھے۔ چونکہ غلو کا سرچشمہ عموماً گمراہ لوگوں کی ہوا و ہوس کی پیروی کرنا ہے اس لیے اس گفتگو کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اس قوم کی خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ جو تم سے پہلے گمراہ ہوئی اور انہوں نے بہت سے لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور جو راہ مستقیم سے منحرف ہو گئے (ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل)۔

یہ جملہ حقیقت میں ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو مسیحیت کی تاریخ میں بھی منعکس ہے کہ مسئلہ تثلیث اور حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو مسیحیت کی ابتدائی صدیوں میں ان کے درمیان وجود نہیں رکھتا تھا بلکہ جب ہندوستان کے بت پرست اور ان کی مانند دوسرے لوگوں نے دینِ مسیحیت اختیار کیا تو انہوں نے اپنے سابقہ دین میں سے باقی ماندہ ایک چیز یعنی تثلیث شرک کو مسیحیت میں شامل کر دیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ثالوث ہندی (تین خداؤں، برہما، فیشنو، سیفا پر ایمان) تاریخی لحاظ سے تثلیث مسیحیت سے پہلے تھا اور درحقیقت یہ اسی کی عکاسی ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۳۰ میں بھی یہود و نصاریٰ کے عزیر و عیسیٰ کے بارے میں غلو کے ذکر کے بعد ہے کہ:

يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ

ان کی باتیں گذشتہ کفار کی باتوں سے مشابہت رکھتی ہیں۔

اس عبارت میں لفظ "ضلوا" ان کفار کے بارے میں ہے کہ جن سے اہلِ کتاب نے غلو کا اقتباس کیا تھا اور یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ تکرار تاکید کے لیے ہو یا اس بنا پر ہو کہ وہ پہلے سے تو گمراہ تھے ہی لیکن بعد میں اپنی تبلیغات کے ذریعہ انہوں نے

---

[1] "لاتغلوا" کا مادہ "غلو" ہے جس کے معنی ہیں حق سے تجاوز کرنا۔ فرق یہ ہے کہ جب یہ کسی کے مقام و منزلت سے متعلق تجاوز ہو تو غلو کہا جاتا ہے، اگر کسی چیز کے نرخ اور قیمت کے بارے میں ہو تو غلاء کہا جاتا ہے اور اگر تیر کے بارے میں ہو تو غلو بروزن دلو کہتے ہیں جوش مارنے کو غلیان کہتے ہیں اور جو جانور بہت ہی سرکش ہو اُسے غلواء کہتے ہیں، یہ سب اسی مادہ سے ہیں۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ غلو افراط کی طرف بھی بولا جاتا ہے اور تفریط کی طرف بھی جبکہ بعض اسے تفریط میں منحصر سمجھتے ہیں اور اس کے نقطہ مقابل کو تقصیر کہتے ہیں۔

دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا تو وہ ایک نئی گمراہی میں جا گرے۔ کیونکہ جو شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ لے جائے در حقیقت وہ سب سے زیادہ گمراہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی قوتوں کو خود اپنی اور دوسرے لوگوں کی بدبختی میں تلف کر دیا ہے اور دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے دوش پر اٹھا لیا ہے۔ آیا وہ شخص کہ جو سیدھے راستے پر قرار پا چکا ہو کبھی اس بات کے لیے تیار ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کے بوجھ کے ساتھ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھائے۔

۷۸۔ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

۷۹۔ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝

۸۰۔ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِى الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۸۔ جو لوگ بنی اسرائیل میں سے کافر ہو گئے ہیں انہیں حضرت داؤد و عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی۔ یہ اس بنا پر ہوا کہ وہ گناہ اور تجاوز کرتے تھے۔

۷۹۔ وہ ان برے اعمال سے جنہیں وہ خود انجام دیتے تھے ایک دوسرے کو منع نہیں کیا کرتے تھے۔

۸۰۔ تم ان میں سے بہت سے لوگوں کو دیکھو گے کہ وہ کافروں (اور بت پرستوں) کو دوست رکھتے ہیں (اور ان سے راہ و رسم بڑھاتے ہیں) انہوں نے کتنے برے اعمال اپنے (انجام اور آخرت) کے لیے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کی ناراضگی تھی اور وہ ہمیشہ عذاب (الہٰی) میں رہیں گے۔

تفسیر

ان آیات میں اس بنا پر کہ اہل کتاب کو ان سے پہلے لوگوں کی اندھی تقلید سے روکا جائے ان کی بدبختی کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "بنی اسرائیل کے کافروں پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی ہے اور ان دو بزرگ انبیاء نے خدا سے درخواست کی ہے کہ وہ انہیں اپنی رحمت سے دور رکھے (لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علی لسان داؤد و عیسی ابن مریم)۔

اس سلسلے میں کہ صرف ان دو ہی پیغمبروں کا نام کیوں لیا گیا کئی احتمال پیش کیے گئے ہیں۔ کبھی تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد زیادہ معروف نبی یہی دونوں تھے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اہل کتاب اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ داؤدؑ کی اولاد ہیں۔ لہٰذا قرآن اس جملے کے ذریعہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت داؤدؑ ان لوگوں سے کہ جنہوں نے کفر و طغیان اختیار کیا تھا متنفر تھے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت میں دو تاریخی واقعات کی طرف اشارہ ہے کہ جس پر یہ دونوں عظیم پیغمبر غضب ناک ہوئے اور انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر لعنت کی۔ حضرت داؤدؑ نے ساحلی شہر ایلہ کے ساکنین پر کہ جو اصحاب سبت کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا قصہ سورہ اعراف میں آئے گا اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنے پیروکاروں میں سے اس گروہ پر لعنت و نفرین کی کہ جنہوں نے آسمانی مائدہ کے نازل ہونے کے بعد بھی انکار و مخالفت کی راہ اختیار کیے رکھی۔

بہر حال اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نسل بنی اسرائیل سے ہونا یا حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں میں سے ہونا کسی کی نجات کا باعث نہیں ہو گا، جب تک ان کے اعمال کے ساتھ ہم آہنگی نہ پیدا کی جائے۔ بلکہ خود ان انبیاء نے ایسے افراد سے نفرت کی ہے۔

آیت کا آخری جملہ بھی اس مطلب کی تائید کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ نفرت و بیزاری کا یہ اعلان اس بنا پر تھا کہ وہ گنہگار اور تجاوز کرنے والے تھے (ذٰلک بما عصوا و کانوا یعتدون)۔

اس کے علاوہ وہ لوگ کسی طرح بھی اپنے لیے کسی اجتماعی ذمہ داری کے قائل نہ تھے اور ایک دوسرے کو غلط کاری سے منع نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں سے نیک لوگوں کا ایک گروہ خاموشی سے اور سازشی انداز میں گنہگار لوگوں میں عملی طور پر شوق پیدا کرتا تھا (کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ)۔

اس طرح ان کی زندگی کا لائحۂ عمل بہت ہی پست اور ناپسندیدہ تھا (لبئس ما کانوا یفعلون)۔

اس آیت کی تفسیر میں پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ اہل بیتؑ سے ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جو بہت ہی سبق آموز ہیں۔

ایک حدیث میں جو پیغمبرؐ سے روایت ہوئی ہے منقول ہے:

لتأمرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر و لتأخذن علی ید السفیہ و لتأطرنہ علی الحق اطرًا، او لیضربن اللہ قلوب بعضکم علی بعض و یلعنکم کما لعنھم

"تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، نادان اور جاہل لوگوں کا ہاتھ پکڑو اور حق کی طرف دعوت دو ورنہ خدا تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کی مانند کر دے گا اور تمہیں اپنی رحمت سے اسی طرح دور کر دے گا جس طرح سے اس نے انہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا۔[1]

[1] تفسیر مجمع البیان میں زیر بحث آیت کے ذیل میں اور تفسیر قرطبی جلد چہارم صفحہ ۲۲۷۵ میں نیز اس میں اسی مضمون کی ایک حدیث ترمذی سے نقل کی گئی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے (کانوا لا یتناھون عن منکر فعلوہ) کی تفسیر میں منقول ہے:

اما انھم لم یکونوا یدخلون مداخلھم و لا یجلسون مجالسھم ولکن کانوا اذا لقوھم ضحکوا فی وجوھھم و انسوا بھم[1]

یہ گروہ جن کی خدا مذمت کر رہا ہے ہرگز گنہگاروں کے کاموں اور ان کی محفلوں میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے بلکہ فقط اس وقت جبکہ اُن سے ملاقات کرتے تھے تو اُن کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور ان سے مانوس تھے۔

بعد والی آیت میں ان کے ایک اور غلط عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تم اُن میں سے بہت سوں کو دیکھو گے گروہ کافروں کے ساتھ محبت اور دوستی کی بنیادیں استوار کرتے ہیں (تریٰ کثیرا منھم یتولون الذین کفروا)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ ان کی دوستی ایک عام دوستی کی طرح نہ تھی بلکہ وہ طرح طرح کے گناہوں سے مخلوط اور غلط اعمال و افکار کا شوق پیدا کرنے والی دوستی تھی لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: انہوں نے کیسے بُرے اعمال اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجے ہیں کہ جن کا نتیجہ خدا کا خشم و غضب تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے عذاب الٰہی میں مبتلا رہیں گے۔

(لبئس ما قدمت لھم انفسھم ان سخط اللہ علیھم و فی العذاب ھم خٰلدون)

اس بارے میں کہ "الذین کفروا" سے اس آیت میں کون سے افراد مراد ہیں بعض نے تو یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ اس سے منظور مشرکین مکہ ہیں کہ جن کے ساتھ یہودیوں نے دوستی کی پینگیں بڑھا رکھی تھیں اور بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے منظور وہ ظالم و ستمگر ہیں جن کے ساتھ یہودیوں نے گذشتہ زمانے میں دوستی کر رکھی تھی۔

وہ حدیث جو امام باقرؑ سے اس سلسلے میں وارد ہوئی ہے وہ بھی اس معنی کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

یتولون الملوک الجبارین و یزینون لھم اھوآءھم لیصیبوا من دنیاھم[2]

یہ گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو جابر بادشاہوں کو دوست رکھتے تھے اور ان کے ہوس آلودگن ہوں کو ان کی نظر میں اچھا کر کے پیش کرتے تھے تاکہ انہیں اُن کا قرب حاصل ہو اور ان کی دنیا سے بہرہ ور ہوں۔

اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ آیت دونوں ہی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہو بلکہ ان معنی سے بھی بڑھ کر عام ہو۔

۸۱۔ وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

ترجمہ

۸۱۔ اگر وہ خدا پر اور پیغمبر پر اور جو کچھ اس کے اُوپر نازل ہوا ہے اس پر ایمان لے آتے تو (ہرگز) انہیں اپنا دوست نہ بناتے

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۹۲ و تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۶۱۔

[2] مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

لیکن ان میں سے بہت سے لوگ فاسق ہیں۔

تفسیر

اس آیت میں اللہ تعالٰے انہیں اس غلط اور نادرست طریقۂ عمل سے راہ نجات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ اگر وا قعاً خدا اور پیغمبر اور جو کچھ اس پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے تو کبھی بیگانوں اور خدا کے دشمنوں سے دوستی نہ کرتے اور نہ ہی انہیں اپنے لیے سہارے کے طور پر منتخب کرتے (ولو کانوا یؤمنون باللہ والنبی وما انزل الیہ ما اتخذوھم اولیآء) لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان میں اطاعت خدا کرنے والے لوگ بہت ہی کم ہیں اور ان میں سے زیادہ تر فرمان خدا کے دائرہ سے خارج ہو چکے ہیں اور فسق کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں (ولکن کثیرا منھم فسقون)۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس مقام پر "النبی" سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہیں کیونکہ قرآن مجید کی مختلف آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے اور یہ امر قرآن کی دسیوں آیات میں دکھائی دیتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ "کانوا" کی ضمیر مشرکین اور بت پرستوں کی طرف لوٹتی ہو کہ اگر یہ مشرک جو یہودیوں کے دوست اور ان کے لیے قابل اعتماد ہیں پیغمبر اکرمؐ اور قرآن پر ایمان لے آتے تو یہودی کبھی انہیں اپنا دوست نہ بناتے اور یہ ان کی گمراہی اور فسق و فجور کی واضح نشانی ہے کیونکہ وہ کتب آسمانی کی پیروی کے دعوے کے ساتھ بت پرستوں سے اس وقت تک دوستی نہ کرتے جب تک وہ مشرک ہیں جبکہ ہوتا یہ ہے کہ جب وہ خدا اور آسمانی کتابوں کی طرف آجاتے ہیں تو یہ ان سے دوری اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن پہلی تفسیر آیات کے ظاہری مفہوم سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور اس کے مطابق تمام ضمیریں ایک ہی مرجع (یعنی یہودیوں) کی طرف لوٹتی ہیں۔

۸۲۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

۸۳۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝

۸۴۔ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ۝

۸۵۔ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۸۶۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝ ع

ترجمہ

۸۲۔ یقینی طور پر تم یہود اور مشرکین کو مومنین کی دشمنی میں سب لوگوں سے بڑھا ہوا پاؤ گے لیکن وہ لوگ کہ جو خود کو مسیحی کہتے ہیں انہیں تم مومنین کے ساتھ دوستی میں قریب تر پاؤ گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں کچھ دانشمند اور دنیا سے دور افراد موجود ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر نہیں کرتے۔[1]

۸۳۔ اور وہ جس وقت پیغمبر پر نازل ہونے والی آیات سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے (فرطِ شوق میں) آنسو جاری ہو جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں پس

[1] ساتواں پارہ آیت ۸۳ سے شروع ہوتا ہے لیکن آیت ۸۲ کو مضمون کی مناسبت سے یہاں درج کیا گیا ہے (مترجم)۔

تو ہمیں حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔

۸۴۔ ہم خدا پر اور اُس حق پر جو ہم تک پہنچا ہے کیوں ایمان نہ لے آئیں جبکہ ہماری آرزو ہے کہ وہ ہمیں صالحین کے گروہ میں سے قرار دے۔

۸۵۔ خدا نے انہیں ان ہی باتوں کی وجہ سے جنت کے ایسے باغات ثواب و جزا کے طور پر دیئے کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ نیکوکار لوگوں کی جزا ہے۔

۸۶۔ اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ اہلِ دوزخ ہیں۔

شان نزول

اِسلام کے پہلے مہاجرین

بہت سے مفسرین نے منجملہ طبرسی، نے "مجمع البیان" میں اور فخر الدین رازی، اور "المنار" کے مؤلف نے اپنی اپنی تفسیروں میں اپنے سے پہلے مفسرین کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ آیات پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے حبشہ کے بادشاہ نجاشی اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں نیز جو حدیث تفسیر برہان میں نقل ہوئی ہے اس میں بھی یہی بات شرح و بسط سے بیان کی گئی ہے۔

اس سلسلے میں اسلامی روایات و تواریخ اور مفسرین کے اقوال سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ اس طرح ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی بعثت اور عمومی دعوت کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت ہی کم تعداد میں تھے۔ قریش نے قبائل عرب کو نصیحت کر رکھی تھی کہ ہر قبیلہ اپنے قبیلے کے ان لوگوں پر کہ جو پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لا چکے ہیں انتہائی سخت دباؤ ڈالیں اور اس طرح مسلمانوں میں سے ہر کوئی اپنی قوم و قبیلہ کی طرف سے انتہائی سختی اور دباؤ میں مبتلا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد جہادِ آزادی شروع کرنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس چھوٹے سے گروہ کی حفاظت اور مسلمانوں کے لیے حجاز سے باہر قیام گاہ مہیا کرنے کے لیے انہیں ہجرت کا حکم دیا اور اس مقصد کے لیے حبشہ کو منتخب فرمایا اور کہا کہ وہاں ایک نیک دل بادشاہ ہے جو ظلم و ستم کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ تم وہاں چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ خداوند تعالیٰ کوئی مناسب موقع ہمیں عطا فرمائے۔

پیغمبر اکرمؐ کی مراد نجاشی سے تھی (نجاشی ایک عام نام تھا جیسے "کسریٰ" ، جو حبشہ کے تمام بادشاہوں کا خاص لقب تھا لیکن اس نجاشی کا اصل نام جو پیغمبرؐ کا ہم عصر تھا اصمحہ تھا جو کہ حبشہ کی زبان میں عطیہ و بخشش کے معنی میں ہے)۔

مسلمانوں میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں حبشہ جانے کے لیے تیار ہوئے اور ایک چھوٹی سی کشتی کرایہ پر لے کر بحری راستے سے حبشہ جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ بعثت کے پانچویں سال ماہ رجب کا واقعہ ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ جناب

جعفر بن ابو طالب بھی مسلمانوں کے ایک دوسرے گروہ کے ساتھ حبشہ چلے گئے۔ اب اس اسلامی جمعیت میں ۸۲ مردوں کے علاوہ کافی تعداد میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔

اس ہجرت کی بنیاد بت پرستوں کے لیے سخت تکلیف دہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح سے دیکھ رہے تھے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ وہ لوگ جو تدریجاً اسلام کو قبول کر چکے ہیں اور حبشہ کی سرزمین امن و امان کی طرف چلے گئے ہیں مسلمانوں کی ایک طاقتور جماعت کی صورت اختیار کر لیں گے۔ یہ حیثیت ختم کرنے کے لیے انہوں نے کام کرنا شروع کر دیا اس مقصد کے لیے انہوں نے جوانوں میں سے دو ہوشیار، فعال، حیلہ ساز اور عیار جوانوں یعنی عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید کا انتخاب کیا بہت سے ہدیے دے کر اُن کو حبشہ کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان دونوں نے کشتی میں بیٹھ کر شراب پی اور ایک دوسرے سے لڑ پڑے۔ لیکن آخر کار وہ اپنی سازش کو روبہ عمل لانے کے لیے سرزمین حبشہ میں داخل ہو گئے۔ ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد وہ نجاشی کے دربار میں پہنچ گئے۔ دربار میں باریاب ہونے سے پہلے انہوں نے نجاشی کے درباریوں کو بہت قیمتی ہدیے دے کر اُن کو اپنا موافق بنا لیا تھا اور اُن سے اپنی طرفداری اور تائید کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔

"عمرو عاص" نے اپنی گفتگو شروع کی اور نجاشی سے اس طرح ہمکلام ہوا:

> ہم سرداران مکہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ ہمارے درمیان کچھ کم عقل جوانوں نے مخالفت کا علم بلند کیا ہے اور وہ اپنے بزرگوں کے دین سے پھر گئے ہیں اور ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ انہوں نے فتنہ و فساد برپا کر دیا ہے، لوگوں میں نفاق کا بیج بو دیا ہے، آپ کی سرزمین کی آزادی سے انہوں نے غلط فائدہ اُٹھایا ہے اور انہوں نے یہاں آکر پناہ لے لی ہے۔ ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ وہ یہاں بھی خلل اندازی نہ کریں۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں ہمارے سپرد کر دیں تاکہ ہم انہیں اپنی جگہ واپس لے جائیں۔

یہ کہہ کر اُن لوگوں نے وہ ہدیے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے پیش کیے۔

نجاشی نے کہا:

> جب تک میں اپنی حکومت میں پناہ لینے والوں کے نمائندوں سے نہ مل لوں اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کر سکتا اور چونکہ یہ ایک مذہبی بحث ہے لہٰذا ضروری ہے کہ مذہبی نمائندوں ہی کو ایک جلسہ میں تمہاری موجودگی میں دعوت دی جائے۔

دوسرے دن ایک اہم جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں نجاشی کے مصاحبین اور عیسائی علماء کی ایک جماعت شریک تھی، جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے موجود تھے اور قریش کے نمائندے بھی حاضر ہوئے۔ نجاشی نے قریش کے نمائندوں کی باتیں سننے کے بعد جناب جعفر کی طرف رخ کیا اور اُن سے خواہش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا نقطہ نظر بیان کریں۔

جناب جعفر ادائے احترام کے بعد اس طرح گویا ہوئے: پہلے ان سے پوچھیے کہ کیا ہم ان کے بھاگے ہوئے غلاموں میں سے ہیں؟

عمرو نے کہا: نہیں بلکہ آپ آزاد ہیں۔

جعفر: ان سے یہ بھی پوچھیے کہ کیا ان کا کوئی قرض ہمارے ذمہ ہے کہ جس کا وہ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں؟
عمرو: نہیں ہمارا آپ سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔
جعفر: کیا ہم نے تمہارا کوئی خون بہایا ہے کہ جس کا ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو؟
عمرو: نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔
جعفر: تو پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟ تم نے ہم پر اتنی سختیاں کیں اور اتنی تکلیفیں پہنچائیں اور ہم تمہاری سرزمین سے جو سراسر مرکزِ ظلم و جور تھی باہر نکل آئے ہیں۔

اس کے بعد جناب جعفر نے نجاشی کی طرف رُخ کیا اور کہا: ہم جاہل اور نادان تھے، بت پرستی کرتے تھے، مردار کا گوشت کھاتے تھے، طرح طرح کے بُرے اور شرمناک کام انجام دیتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، اپنے ہمسایوں سے بُرا سلوک کرتے تھے اور ہمارے طاقتور کمزوروں کے حقوق ہڑپ کر جاتے تھے ـــــ

لیکن خداوند تعالیٰ نے ہمارے درمیان ایک پیغمبر کو مبعوث فرمایا جس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خدا کا کوئی مثل اور شریک نہ بنائیں اور فحشاء و منکر، ظلم و ستم اور قماربازی ترک کردیں۔ ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں، زکوٰۃ ادا کریں، عدل و احسان سے کام لیں اور اپنے وابستگان کی مدد کریں۔

نجاشی نے کہا: عیسیٰ مسیحؑ بھی انہی چیزوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

اس کے بعد اس نے جناب جعفر سے پوچھا: ان آیات میں سے جو تمہارے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں کچھ تمہیں یاد ہیں۔

جعفر نے کہا: جی ہاں!

اور پھر انہوں نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کردی ۔ اس سورہ کی ایسی ہلا دینے والی آیات کے ذریعہ جو مسیحؑ اور اُن کی ماں کو ہر قسم کی ناروا تہمتوں سے پاک قرار دیتی ہیں، جناب جعفر کے حسنِ انتخاب نے عجیب و غریب اثر کیا یہاں تک کہ مسیحی علماء کی آنکھوں سے فرطِ شوق میں آنسو بہنے لگے اور نجاشی نے پکار کر کہا: خدا کی قسم! ان آیات میں حقیقت کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

جب عمرو نے چاہا کہ اب یہاں کوئی بات کرے اور مسلمانوں کو اس کے سپرد کرنے کی درخواست کرے، نجاشی نے ہاتھ بلند کیا اور زور سے عمرو کے منہ پر مارا اور کہا: خاموش رہو، خدا کی قسم! اگر ان لوگوں کی مذمت میں اس سے زیادہ کوئی بات کی تو میں تجھے سزا دوں گا ۔ یہ کہہ کر مامورینِ حکومت کی طرف رُخ کیا اور پکار کر کہا: ان کے ہدیے ان کو واپس کردو اور انہیں حبشہ کی سرزمین سے باہر نکال دو ۔ جناب جعفر اور اُن کے ساتھیوں سے کہا: تم آرام سے میرے ملک میں زندگی بسر کرو۔

اس واقعہ نے جہاں حبشہ کے کچھ لوگوں پر اسلام شناسی کے سلسلے میں گہرا تبلیغی اثر کیا وہاں یہ واقعہ اس بات کا بھی سبب بنا کہ مکے کے مسلمان اس کو ایک اطمینان بخش جائے پناہ شمار کریں اور نئے مسلمان ہونے والوں کو اس دن کے انتظار میں کہ جب وہ کافی قدرت و طاقت حاصل کریں وہاں پر بھیجتے رہیں۔

کئی سال گزر گئے۔ پیغمبرؐ بھی ہجرت فرما گئے اور اسلام روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا، عہد نامہ حدیبیہ لکھا گیا اور پیغمبر اکرمؐ فتح خیبر کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس وقت جبکہ مسلمان یہودیوں کے سب سے بڑے اور خطرناک مرکز کے ٹوٹنے کی وجہ سے اتنے خوش تھے کہ پھولے نہیں سماتے تھے، دور سے انہوں نے ایک مجمع کو لشکر اسلام کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ معلوم ہوا کہ یہ وہی مہاجرین حبشہ ہیں، جو آغوش وطن میں پلٹ کر آرہے ہیں، جب کہ دشمنوں کی بڑی بڑی طاقتیں دم توڑ چکی ہیں اور اسلام کا پودا اپنی جڑیں کافی پھیلا چکا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ نے جناب جعفر اور مہاجرین حبشہ کو دیکھ کر یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا:

لا ادری انا بفتح خیبر اسراھم بقدوم جعفر؟

"میں نہیں جانتا کہ مجھے خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے پلٹ آنے کی"

کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے علاوہ شامیوں میں سے آٹھ افراد کہ جن میں ایک مسیحی راہب بھی تھا اور ان کا اسلام کی طرف شدید میلان پیدا ہو گیا تھا پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سورہ یٰسین کی کچھ آیات سننے کے بعد رونا شروع کر دیا اور مسلمان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ آیات مسیح کی سچی تعلیمات سے کس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔

اس روایت کے مطابق جو تفسیر المنار، میں سعید ابن جبیر سے منقول ہے نجاشی نے اپنے یار و انصار میں سے تیس بہترین افراد کو پیغمبر اکرمؐ اور دین اسلام کے ساتھ اظہار عقیدت کے لیے مدینہ بھیجا تھا اور یہ وہی تھے جو سورہ یٰسین کی آیات سن کر رو پڑے تھے اور اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان مومنین کی عزت افزائی کی گئی۔ (یہ شان نزول اس بات کے خلاف نہیں کہ سورۂ مائدہ پیغمبر اکرمؐ کی عمر کے اواخر میں نازل ہوئی ہو۔ کیونکہ یہ بات اس سورہ کی اکثر آیات کے ساتھ مربوط ہے لہٰذا اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ان میں سے کچھ آیات قبل کے واقعات کے سلسلے میں نازل ہوئی ہوں اور پیغمبرؐ کی ہدایت کے مطابق اس سورہ میں بہت سی مناسبات کی وجہ سے شامل کر دی گئی ہوں)۔

تفسیر

یہودیوں کی کینہ پروری اور عیسائیوں کی نرم دلی

ان آیات میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے جو پیغمبرؐ کے ہم عصر تھے۔ پہلی آیت میں یہودیوں اور مشرکین کو ایک ہی صف میں قرار دیا گیا ہے اور عیسائیوں کو دوسری صف میں۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے: مومنین کے سخت ترین دشمن یہودی اور مشرکین ہیں لیکن عیسائی مومنین سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں (لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین اٰمنوا الیھود والذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین اٰمنوا الذین قالوا انا نصٰری)۔

تاریخ اسلام اس حقیقت کی اچھی طرح گواہ ہے کیونکہ اسلام کے خلاف لڑی جانے والی بہت سی جنگوں کے میدان میں یہودی بلاواسطہ یا بالواسطہ طریقے سے دخیل رہے ہیں اور کسی عہد شکنی اور دشمنی سے باز نہیں آتے تھے۔ ان میں سے بہت ہی کم افراد ایسے ہیں جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے جبکہ ہم اسلامی جنگوں میں بہت کم مسلمانوں کو عیسائیوں سے آمنا سامنا کرتے دیکھتے ہیں

اور ہم یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ اُن میں سے بہت سے افراد مسلمانوں کی صفوں میں آملے۔
اس کے بعد قرآن اس روحانی فرق کی دلیل اور رہن سہن کے اجتماعی طریقوں کو چند جملوں میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پیغمبر کے ہم عصر عیسائی کچھ ایسے امتیازات رکھتے تھے کہ جو یہودیوں میں نہیں تھے۔
پہلا امتیاز تو یہ ہے کہ ان میں علماء اور دانشمندوں کی ایک ایسی جماعت موجود تھی جو دنیا پرست یہودی علماء کی طرح حقیقت کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے تھے (ذالك بان منهم قسيسين)[1]
نیز اُن کے درمیان کچھ لوگ تارک دنیا بھی تھے کہ جو از روئے عمل لالچی یہودیوں کے بالکل برخلاف تھے اگرچہ وہ بھی کئی طرح کے انحرافات کے مرتکب تھے لیکن پھر بھی وہ ایک ایسی سطح پر تھے جو یہودیوں سے بالاتر تھی (ورهبانا)۔
اُن میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جو حق کے قبول کرنے میں خاضع تھے اور اپنی طرف سے تکبر کا اظہار نہیں کرتے تھے جبکہ یہودیوں کی اکثریت دین اسلام کو قبول کرنے سے اس وجہ سے سرتابی کرتی تھی کیونکہ وہ خود کو ایک برتر نسل سمجھتے تھے اور دین اسلام یہودیوں کی نسل میں قائم نہیں ہوا تھا (وانهم لا يستكبرون)۔
علاوہ ازیں ان میں سے ایک جماعت (جیسے جناب جعفر کے ساتھی اور حبشہ کے عیسائیوں میں سے کچھ لوگ) ایسے تھے کہ وہ جس وقت قرآن کی آیات کو سنتے تھے تو حق کے حاصل ہو جانے کی خوشی میں ان کی آنکھوں سے شوق کے آنسو جاری ہو جاتے تھے (واذا سمعوا ما انزل الى الرسول ترى اعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من الحق)۔
اور وہ صراحت کے ساتھ علی الاعلان بغیر کسی لاگ لپیٹ کے پکار اُٹھتے تھے پروردگارا! ہم ایمان لے آئے ہیں ہمیں حق کے گواہوں اور محمدؐ کے ساتھیوں اور یار و انصار میں سے قرار دے (يقولون ربنا آمنا فاكتبنا مع الشاهدين)۔
وہ اس آسمانی کتاب کی ہلا دینے والی آیات سے اس قدر متاثر ہوتے تھے کہ پکار اُٹھتے کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم خدائے یکتا پر اور ان حقائق پر جو اُس کی طرف سے آئے ہیں ایمان نہ لائیں جبکہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں صالحین کے زمرے میں قرار دے (وما لنا لا نؤمن بالله وما جاءنا من الحق ونطمع ان يدخلنا ربنا مع القوم الصالحين)۔
البتہ جیسا ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں یہ موازنہ زیادہ تر پیغمبر اسلامؐ کے ہم عصر یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہے کیونکہ یہودی آسمانی کتاب کے حامل ہونے کے باوجود مادیت سے بے اندازہ لگاؤ کی وجہ سے مشرکین کی صف میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ جب کہ مذہبی نقطہ نظر سے اُن دونوں میں کوئی وجہ مشترک نہیں تھی۔ حالانکہ ابتداء میں یہودی اسلام کی بشارت دینے والوں میں شمار ہوتے تھے اور اُن میں عیسائیوں کی طرح تثلیث اور غلو جیسے انحرافات موجود نہیں تھے۔
لیکن ان کی شدید دنیا پرستی نے انہیں حق سے بالکل بیگانہ کر دیا جبکہ اُس زمانے کے عیسائی ایسے نہیں تھے۔
لیکن گذشتہ اور موجودہ زمانے کی تاریخ ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ بعد کے زمانوں کے عیسائی، اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے جو یہودیوں کے جرائم سے کسی طرح کم نہ تھے۔ گذشتہ زمانے میں طویل اور خونیں صلیبی جنگیں

---

[1] کشیش اصل میں سریانی زبان کا لفظ ہے کہ جس کا معنی عیسائیوں کا مذہبی پیشوا اور رہنما ہے جس کو عربی میں قسیس کہا جاتا ہے اس کی جمع قسیسین ہے۔

اور اس زمانے کی ایسی بے شمار تحریکیں جو مسیحی سامراجی ممالک کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہو رہی ہیں کسی پر ڈھکی چھپی نہیں۔ لہٰذا اُوپر والی آیات کو تمام عیسائیوں کے بارے میں ایک قانون کلی کے طور پر نہیں جاننا چاہیے۔ واذا سمعوا ما انزل الی الرسول۔ اور اس کے بعد کے جملے اس بات پر گواہ ہیں کہ یہ آیات صرف پیغمبر اکرم کے ہم عصر عیسائیوں کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

اس کے بعد کی دو آیات میں ان ہی دونوں گروہوں کے انجام اور جزا و سزا کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے صاحب ایمان افراد کے سامنے محبت کا اظہار کیا اور آیات الٰہی کے مقابلہ میں سر تسلیم خم کیا اور صراحت کے ساتھ اپنے ایمان کا اظہار کیا خداوند تعالےٰ اس کے بدلے میں بطور جزا و ثواب انہیں جنت کے ایسے باغات عطا فرمائے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور نیکو کاروں کی یہی جزا ہے (فاثابھم اللہ بما قالوا جنات تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا و ذلک جزآء المحسنین)[1]۔

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے دشمنی کا راستہ اختیار کیا اور کافر ہو گئے (والذین کفروا وکذبوا بایتنا اولئک اصحب الجحیم)۔

٨٧۔ يَاَيُّهَا الَّذِينَ امَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَتِ مَا اَحَلَّ اللهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ اِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ○

٨٨۔ وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○

٨٩۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ

---

[1] "اثابھم" "ثواب" کے مادے سے لیا گیا ہے کہ جو اصل میں "لوٹ آنے" "نیکی کرنے" اور کسی کو نفع پہنچانے کے معنی میں ہے۔

ایٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ○

ترجمہ

۸۷ ۔ اے ایمان والو! اُن پاکیزہ چیزوں کو جو خدا نے تم پر حلال کردی ہیں اپنے اُوپر حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو کیونکہ خدا حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۸۸ ۔ اور خداوند تعالیٰ نے حلال اور پاکیزہ نعمات میں سے جو رزق تمہیں دے رکھا ہے اُنہیں کھاؤ اور اس خدا (کی مخالفت) سے پرہیز کرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

۸۹ ۔ خداوند تعالیٰ تمہیں بے ہودہ (اور بے ارادہ) قسموں کی وجہ سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن وہ قسمیں کہ جنہیں (ارادہ کے ساتھ) تم نے محکم کیا ہو ان کے بارے میں مواخذہ کرے گا۔ اس قسم کی قسموں کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے (اور وہ کھانا ایسا ہونا چاہیے) جو تم عام طور پر اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔ یا دس مسکینوں کو لباس پہنانا ہے یا ایک غلام آزاد کرنا ہے اور جسے ان میں سے کچھ میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے۔ یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے۔ جب تم قسمیں کھاتے ہو (اور پھر ان کی مخالفت کرتے ہو) اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو اور انہیں نہ توڑو۔ خداوند تعالیٰ اس طرح سے اپنی آیات کو تمہارے لیے بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر بجا لاؤ۔

شانِ نزول

حد سے تجاوز نہ کرو

درج بالا آیات کے بارے میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ ایک دن پیغمبرؐ نے روزِ قیامت خداوند تعالیٰ کی عظیم عدالت میں لوگوں کی حالت وکیفیت سے متعلق کچھ بیان فرمایا۔ ان بیانات نے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا اور کچھ لوگ رونے لگے اُس کے بعد اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک گروہ نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ کچھ لذائذ اور راحتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے ان کی جگہ عبادت میں مشغول رہیں۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ نے قسم کھائی کہ رات کو بہت کم سویا کریں گے اور عبادت میں مشغول رہیں گے۔ بلال نے قسم کھائی کہ ہمیشہ روزہ رکھیں گے۔ عثمان بن مظعون نے قسم کھائی کہ اپنی بیوی سے مباشرت ترک کر کے عبادت کرتے رہیں گے۔ ایک دن عثمان بن مظعون کی بیوی عائشہ کے پاس آئی۔ وہ ایک جوان عورت تھی اور بڑی ہی حسین وجمیل تھی۔ عائشہ کو اس کی حالت پر تعجب ہوا اور کہنے لگی کہ تم اپنا بناؤ سنگھار کیوں نہیں کرتی۔ اس نے کہا کہ بناؤ سنگھار کس کے لیے کروں میرے

شوہر نے تو ایک عرصہ ہوا مجھے چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر رکھی ہے ۔ یہ باتیں پیغمبر کے گوش گزار ہوئیں تو آپ نے ایک فرمان جاری فرمایا کہ تمام مسلمان مسجد میں جمع ہوں ۔ جب سب لوگ مسجد میں اکٹھے ہو گئے تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور پروردگار کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

تم میں سے بعض لوگوں نے پاکیزہ چیزوں کو کیوں اپنے اوپر حرام کر لیا ہے میں اپنی سنت تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں، جو اس سے روگردانی کرے اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ میں رات کے ایک حصّہ میں سوتا ہوں اور اپنی بیویوں سے مباشرت کرتا ہوں اور ہر روز روزہ بھی نہیں رکھتا ۔

آگاہ رہو میں ہرگز تمہیں یہ حکم نہیں دیتا کہ عیسائیوں کے پادریوں اور راہبوں کی طرح دنیا ترک کر دو کیونکہ اس قسم کے مسائل اور اس طرح کی رہبانیت میرے دین میں نہیں ہے ۔ میری اُمت کی رہبانیت جہاد میں ہے (اگر تم دنیا کو ترک کرنا چاہتے ہو تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ جہاد جیسے تعمیری راستے پر چلتے ہوئے ہو) تم اپنے آپ کو سختی میں نہ ڈالو کیونکہ جو لوگ تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اُن میں سے ایک گروہ اپنے آپ کو سختی میں ڈالنے کے نتیجے میں ہی ہلاک ہوا تھا ۔

جن لوگوں نے یہ قسم کھا رکھی تھی کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دیں گے وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا اے رسولِ خدا! اس سلسلے میں ہم نے قسم کھائی تھی اب اس قسم کے سلسلے میں ہماری ذمہ داری کیا ہے تو مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن کے ذریعے انہیں جواب دیا گیا۔[1]

اس مقام پر یہ یاددہانی ضروری ہے کہ مذکورہ قسموں میں سے بعض مثلاً وہ قسم جو عثمان بن مظعون سے نقل کی گئی ہے چونکہ وہ ان کی بیوی کے حقوق کے منافی تھی لہٰذا وہ قسم شرعاً جائز نہیں تھی ۔ لیکن حضرت علی کی قسم جو کہ رات کو بیدار رہنے اور عبادت میں مشغول رہنے کے سلسلے میں ہے ایک امر مباح اور جائز تھی اگرچہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیٰ اور بہتر یہی تھا کہ مسلسل ایسا نہ ہو لیکن یہ امر حضرت علیؑ کے مقام عصمت کے منافی نہیں ہے ۔ جیسا کہ اسی کی نظیر پیغمبر کے بارے میں بھی سورہ تحریم کی آیت ا میں ہے :

یٰایها النبی لم تحرم ما احل الله لك تبتغی مرضات ازواجك

اے پیغمبر! وہ امور جو تیرے لیے اللہ نے حلال قرار دیے ہیں اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اُوپر کیوں حرام کرتے ہو (یا اپنے آپ کو ان سے کیوں محروم کرتے ہو)۔

تفسیر

قسم اور اس کا کفارہ

اس آیت میں اور اس سے بعد کی آیات میں اہم اسلامی احکام کا ایک سلسلہ بیان ہوا ہے ۔ اُن میں سے بعض تو ایسے ہیں جو

---

[1] مذکورہ بالا شانِ نزول کا کچھ حصّہ تفسیر علی بن ابراہیم سے اور کچھ حصّہ مجمع البیان اور دوسری تفاسیر سے لیا گیا ہے ۔
اس روایت میں جناب امیرؑ کا ذکر درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آپ اُن ذوات مقدسہ میں سے ہیں کہ جن سے ترک اولیٰ کا صدور بھی نہیں ہوتا ۔ (مترجم)

پہلی مرتبہ بیان ہوئے ہیں ۔ لیکن زیادہ اہم حصہ ان احکام کی توضیح وتاکید کے طور پر بھی بیان ہوا ہے جو قرآن کی دیگر آیات میں پہلے بیان ہو چکے ہیں ۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورہ پیغمبر کی عمر کے آخریں نازل ہوئی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ اس میں مختلف اسلامی احکام کے بارے میں زیادہ تاکید کی جائے ۔ پہلی آیت میں بعض مسلمانوں کی طرف سے کچھ نعمات الٰہی کی تحریم کی طرف اشارہ ہوا ہے اور انہیں اس کام کی تکرار سے منع کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : اے ایمان لانے والو! طیبات اور ایسے پاکیزہ امور جنہیں خدا نے تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے اپنے اوپر حرام نہ کرو ۔

(یا ایہا الذین اٰمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم[1]) ۔

اس حکم کا تذکرہ شان نزول کے مفہوم کے علاوہ ممکن ہے اس بارے میں بھی ہو کہ اگر گذشتہ آیات میں کچھ عیسائی علماء اور رہبانوں کی مدح وستائش کی گئی ہے تو وہ ان کے حق کی طرف مائل ہونے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی وجہ سے تھی نہ کہ ان کے ترک دنیا کے عمل اور تحریم طیبات کی خاطر تھی اور مسلمان اس بارے میں اُن کی پیروی کرسکتے ۔ یہ حکم بیان کرکے اسلام نے صراحت کے ساتھ رہبانیت اور ترک دنیا سے جیسے عیسائی پادری اور راہب کرتے ہیں اپنی بیگانگی کا اعلان کیا ہے ۔ اس امر کے بارے میں مزید تشریح سورہ حدید کی آیت ۲۷ ” ورھبانیۃ ابتدعوھا “ کے ذیل میں آئے گی اس کے بعد اس امر کی تاکید کے لیے کہتا ہے : سرحدوں اور حد بندیوں سے آگے نہ بڑھو کیونکہ خدا تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ۔ (ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین) ۔

بعد والی آیت میں نئے سرے سے اس مطلب کی تاکید کرتا ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گذشتہ آیت میں تحریم سے نہی کی گئی تھی اور اس آیت میں نعمات الٰہی سے جائز طور پر بہرہ ور ہونے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے ، ان چیزوں میں سے جو خداوند تعالیٰ نے تمہیں بطور روزی دی ہیں حلال و پاکیزہ چیزیں کھاؤ (وکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً) ۔

ان مواہب ونعمات سے بہرہ ور اور مستفید ہونے کی شرط یہ ہے کہ اعتدال ، تقویٰ اور پرہیزگاری کو فراموش نہ کرو اسی لیے فرمایا :

(واتقوا اللہ الذی انتم بہ مؤمنون)

یعنی خدا پر تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کے تمام احکام کا احترام کرو ان سے نفع بھی اٹھاؤ اور اعتدال وتقویٰ کو بھی ملحوظ نظر رکھو ۔

اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ حکم تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ مباحات وطیبات کو حرام قرار دینا تقویٰ کے عالی اور کامل درجے سے مناسبت نہیں رکھتا ۔ تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کسی طرف بھی حدِ اعتدال سے نہ نکلے ۔

قسموں کی دو قسمیں

قرآن بعد والی آیت میں اُن قسموں کے بارے میں کہ جو حلال کی تحریم یا اور چیزوں کے متعلق کھائی جائیں بطور کلی بحث کرتے

---

[1] حلال و” طیب “ کے معنی کے بارے میں پہلی جلد میں بحث ہو چکی ہے ۔

ہوئے قسموں کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے، پہلے کہتا ہے: خداوند تعالیٰ تمہیں لغو اور فضول قسموں کے بارے میں نہ کوئی مواخذہ کرے گا اور نہ ہی سزا دے گا (لا یؤاخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم)۔

جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۵ کی تفسیر میں بھی لغو قسموں کے مقابلے میں سزا نہ ہونے کے بارے میں بحث ہوئی تھی تو وہاں ہم نے کہا تھا کہ لغو قسم سے مراد جیسا کہ مفسرین اور فقہا نے کہا ہے، وہ قسمیں ہیں کہ جن کا ہدف و مقصد مشخص و معین نہ ہو اور جو قصد و ارادہ و عزم سے سرزد نہ ہوئی ہوں۔ بلکہ بغیر توجہ کیے واللہ، باللہ، یا لا واللہ یا بلیٰ و اللہ کہہ دیا ہو یا شدت ہیجان و غضب کے وقت بغیر قصد و ارادہ کے قسم کھائی جائے۔

بعض کہتے ہیں کہ اگر انسان کسی چیز کا یقین رکھتا ہو اور وہ اس کی بنیاد پر قسم کھائے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ اُسے اشتباہ ہوا ہے تو ایسی قسم بھی لغو قسموں میں ہی شمار ہو گی۔ مثلاً یہ کہ کوئی شخص چغل خور، افراد کی چغلی کی وجہ سے اپنی بیوی کی کجروی کا یقین کرلے اور وہ اس کو طلاق دینے کی قسم کھائے لیکن بعد میں معلوم ہو کہ وہ بات جھوٹی تھی تو اس قسم کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حتمی قسموں میں قصد و ارادہ و تصمیم کے لازم ہونے کے علاوہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ قسم کا مضمون کوئی غیر مشروع اور مکروہ فعل بھی نہ ہو۔ لہٰذا اگر انسان حالت اختیار میں قصد و ارادہ سے قسم کھائے کہ کسی فعل حرام یا مکروہ کو انجام دے گا، ایسی قسم کی بھی کوئی قیمت نہیں ہے اور اس کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔

احتمال یہ ہے کہ زیر نظر آیت میں لفظ لغو کا ایک وسیع مفہوم ہے یہاں تک کہ اس طرح کی قسم بھی اس میں شامل ہے۔

دوسری قسم کی قسمیں وہ ہیں جو قصد و ارادہ اور عزم مصمم سے کھائی جائیں۔ اس قسم کی قسموں کے بارے میں قرآن زیر بحث آیت میں کہتا ہے: خدا تمہارا ایسی قسموں کے بارے میں کہ جنکی گرہ کو تم نے محکم کر رکھا ہے مواخذہ کرے گا اور تمہیں اس پر عمل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ٹھہرائے گا۔

(ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان)

لفظ "عقد" جیسا کہ ہم سورہ مائدہ کی ابتدا میں کہہ چکے ہیں اصل میں ایک محکم چیز کے اطراف کو جمع کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی وجہ سے رسی کے دونوں سروں میں گرہ لگانے کو "عقد" کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ لفظ معنوی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ہر قسم کے عہد و پیمان کو بھی "عقد" کہتے ہیں۔

زیر نظر آیت میں "عقد ایمان" یعنی قسمیں باندھنے سے مراد کسی کام کے کرنے کا عزم مصمم ہے جو قسم کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ البتہ قسم کا حتمی ہونا اس کی درستی کے لیے اکیلا کافی نہیں ہے بلکہ جس طرح اُوپر اشارہ ہوا ہے کہ قسم کا مضمون کم از کم کوئی امر مباح ہونا چاہیے اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ خدا کے نام کے بغیر قسم معتبر نہیں ہے۔ اسی بنا پر اگر کوئی شخص خدا کے نام کی قسم کھاتا ہے کہ وہ کوئی نیک عمل یا کم از کم کوئی مباح کام انجام دے گا تو واجب ہے کہ وہ اپنی قسم پر عمل کرے اور اگر اس نے قسم توڑ لی تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا۔ قسم کا کفارہ وہی ہے جو محل بحث آیت کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔

اس قسم کی قسم کا کفارہ تین چیزوں میں سے ایک چیز ہے۔

پہلی چیز ہے دس مسکینوں کو کھانا کھلانا (فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین)۔

البتہ اس بنا پر کہ کہیں اس حکم سے بعض لوگ یہ استفادہ نہ کریں کہ پست و بے قیمت غذا کفارے کے طور پر کھانے لگیں، تصریح کی گئی ہے کہ یہ کھانا کم از کم ایک متوسط غذا ہونا چاہیے جو عام طور پر اپنے گھر میں کھاتے ہیں (من اوسط ما تطعمون اھلیکم)۔

البتہ اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کیفیت کے لحاظ سے حدِ متوسط مراد ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ کیفیت کی طرف بھی اشارہ ہو اور مقدار و کمیت کی طرف بھی۔ جیسا کہ ایک روایت میں امام صادقؑ سے حدِ وسط کیفیت کے لحاظ سے اور ایک روایت میں امام باقرؑ سے حدِ وسط کمیت کے لحاظ سے نقل ہوا ہے کہ جن کا خلاصہ دونوں لحاظ سے حدِ وسط بنتا ہے[1]۔

یہ بات بغیر کہے ظاہر ہے کہ حدِ وسط کا مسئلہ دونوں لحاظ سے شہروں، آبادیوں اور زمانوں کے اختلاف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف ہو گا۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اوسط اچھے اور عالی کے معنی میں ہے کیونکہ "اوسط" کا ایک معنی "عالی" بھی ہے جیسا کہ سورہ قلم کی آیت ۲۸ میں ہے:

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ

ان میں سے بہترین شخص نے یہ کہا کہ کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔

دوسری چیز ہے دس محتاج لوگوں کو لباس پہنانا (او کسوتھم) البتہ آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ ایسا لباس ہونا چاہیے کہ جو عام طور پر ان کو ڈھانپ لے اسی لیے بعض روایات میں ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا کہ اس آیت میں (کسوہ) سے مراد دو قطعہ لباس (یعنی قمیص و شلوار) ہیں اور اگر ہم بعض روایات میں جیسے وہ روایت جو امام باقرؑ سے نقل ہوئی ہے یہ پڑھتے ہیں کہ ایک کپڑے پر بھی قناعت کی جا سکتی ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ عربی قسم کے بڑے قمیص اکیلے ہی سارے بدن کو ڈھانپ سکتے ہیں۔ البتہ عورتوں کے لیے ایک قمیص چاہے وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو کافی نہیں ہے بلکہ سر اور گردن کو ڈھانپنے کے لیے دوپٹہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ عورت کو کم از کم جتنے لباس کی ضرورت ہو سکتی ہے وہ اس سے کم نہیں ہے۔ تو اس احتمال کے ہوتے ہوئے بعید نہیں ہے کہ وہ لباس کہ جو کفارہ کے طور پر دیا جاتا ہے اس میں فصول، مکان اور زمان کے لحاظ سے تفاوت ہو جائے۔

اس سلسلے میں کہ کیا کیفیت کے لحاظ سے کم از کم کافی ہے یا یہاں بھی حدِ وسط کو ملحوظ رکھا جائے مفسرین میں دو نظریے پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ آیت کے اطلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ہر قسم کا لباس کافی ہے۔ اور دوسرا یہ کہ اس شرط کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کھانا کھلانے میں تھی یہاں بھی حدِ وسط کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ البتہ پہلا احتمال آیت کے اطلاق کے ساتھ زیادہ مناسب ہے۔

تیسری چیز ہے ایک غلام کو آزاد کرنا (او تحریر رقبۃ)۔

اس سلسلے میں کہ جو غلام آزاد ہو گا کیا اُسے مسلمان اور مومن ہونا چاہیے یا کسی بھی غلام کو آزاد کرنا کافی ہے، فقہا کے درمیان اختلاف ہے اور اس کی وضاحت کتب فقہ میں پڑھنا چاہیے۔

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۶۴ اور تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

[2] اس سلسلے میں ایک حدیث بھی امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے۔ تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۴۹۶۔

اگرچہ آیت کا ظاہری مفہوم مطلق ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام مختلف ذرائع سے غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے استفادہ کرتا ہے اور ہمارے جیسے زمانے میں جبکہ غلام نہیں ہیں دیگر کفاروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں چیزیں قیمت کے لحاظ سے بہت مختلف ہیں اور شاید یہ تفاوت اس بنا پر ہو کہ ہر شخص آزاد ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر سکے۔

لیکن چونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اُن میں سے کسی پر بھی قدرت نہ رکھتے ہوں لہٰذا اس حکم کے بعد فرماتا ہے: اور وہ لوگ جو ان میں سے کسی تک دسترس نہیں رکھتے انہیں تین دن کے روزے رکھنا چاہئیں (فمن لم یجد فصیام ثلاثة ایام)

اس بنا پر تین دن روزے رکھنا صرف اُن لوگوں سے مربوط ہے جو ان اُوپر والے تین امور میں سے کسی کی بھی انجام دہی کی قدرت نہیں رکھتے۔ اس کے بعد تاکید کے طور پر قرآن کہتا ہے: تمہاری قسموں کا کفارہ یہ ہے جو بیان کیا گیا ہے (ذٰلک کفارة ایمانکم اذا حلفتم)۔

لیکن اس بنا پر کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کرے کہ کفارہ دینے سے صحیح قسم کا توڑنا حرام نہیں ہے کہتا ہے: اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو (واحفظوا ایمانکم) دوسرے لفظوں میں قسم پر عمل کرنا شرعاً واجب ہے اور اس کا توڑنا حرام ہے۔ لیکن اگر توڑا ہے تو اس کا کفارہ دینا پڑے گا قرآن آیت کے آخر میں فرماتا ہے: اس طرح خدا تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور ان احکام کے بارے میں کہ جو فرد و اجتماع کی سعادت و سلامتی کے ضامن ہیں اس کی حمد و سپاس کرو (کذٰلک یبین اللّٰہ لکم اٰیاتہ لعلکم تشکرون)۔

۹۰۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

۹۱۔ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○

۹۲۔ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ○

ترجمہ

۹۰۔ اے ایمان لانے والو شراب، قمار بازی، بت اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری تھی) پلید اور عمل شیطان ہیں۔ ان سے اجتناب

کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۔

۹۱۔ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی ڈال دے اور تمہیں ذکر خدا اور نماز سے باز رکھے تو کیا تم (ان تمام نقصانات اور اس تاکیدی نہی کے بعد) اس سے رکو گے ؟

۹۲۔ اور خدا و پیغمبر کی اطاعت کرو اور (اس کے فرمان کی مخالفت سے) ڈرو اور اگر تم روگردانی کرو گے تو (سزا کے مستحق ہو گے اور) جان لو کہ پیغمبر کے ذمہ واضح ابلاغ کے سوا اور کچھ نہیں ہے (اور اس نے یہ فریضہ تمہارے سامنے انجام دے دیا ہے)۔

شان نزول

پہلی آیت کے بارے میں شیعہ و سنی تفاسیر میں مختلف شان نزول ذکر ہوئی ہیں، جو تقریباً ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ منجملہ ان کے تفسیر در منثور میں سعد بن ابی وقاص سے اس طرح منقول ہے: وہ کہتا ہے یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی۔ انصار میں سے ایک شخص نے کھانا تیار کیا ہوا تھا اور اس نے ہمیں دعوت دی اور چند افراد نے اس کی مجلس مہمانی میں شرکت کی اور کھانا کھانے کے علاوہ انہوں نے شراب بھی پی اور یہ اسلام میں شراب کی حرمت سے پہلے کا واقعہ ہے اور جب اُن کے دماغ شراب سے گرم ہوئے تو انہوں نے اپنے افتخارات بیان کرنا شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ معاملہ بڑھتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُن میں سے ایک نے اونٹ کی ہڈی اُٹھا کر میری ناک پر ماردی اور اُسے چیر دیا۔ میں پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ ماجرا عرض کیا تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مسند احمد، سنن ابی داؤد، نسائی، اور ترمذی سے اس طرح منقول ہے: حضرت عمر (جو تفسیر فی ظلال جلد سوم ص ۳۰ کے مطابق شراب کے بڑے رسیا تھے) دعا کرتے اور کہتے تھے خدایا کوئی واضح بیان شراب کے بارے میں ہم پر نازل فرما۔ جب سورۂ بقرہ کی آیت (و یسئلونک عن الخمر والمیسر) ۲۱۹ نازل ہوئی تو پیغمبر نے ان کے سامنے اس آیت کی تلاوت فرمائی لیکن وہ پھر بھی یہی دعا کرتے رہے اور کہتے رہے کہ خدایا اس بارے میں کوئی واضح تر بیان ہم پر نازل فرما یہاں تک کہ سورۂ نساء کی آیت ۴۳ نازل ہوئی جو یہ ہے:

یاایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰة و انتم سکاریٰ

پیغمبر نے وہ بھی ان کے سامنے پڑھی۔ انہوں نے پھر بھی اپنی اسی دعا کو جاری رکھا یہاں تک کہ سورۂ مائدہ کی (آیہ زیر بحث) کہ جس میں اس موضوع پر ایک غیر معمولی صراحت موجود تھی نازل ہوئی۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے یہ آیت حضرت عمر کے سامنے پڑھی تو انہوں نے کہا

انتھینا انتھینا

"ہم اب شراب پینے سے رک گئے۔ اب ہم شراب خواری سے رک گئے"۔[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷، صفحہ ۵۰۔

تفسیر

شراب کے بارے میں قطعی حکم اور اس کے تدریجی مراحل

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی جلد سوم میں سورہ نساء کی آیہ ۴۳ کے ذیل میں اشارہ کیا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں شراب خواری اور مے نوشی کا بہت زیادہ رواج تھا اور یہ ایک عمومی وبا کی صورت اختیار کر گئی تھی یہاں تک کہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کے عشق کا خلاصہ تین چیزیں تھیں شعر و شراب اور جنگ!

روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شراب کے حرام ہونے کے بعد تک بھی بعض مسلمانوں کے لیے اس کی ممانعت کا مسئلہ حد سے زیادہ سخت اور مشکل تھا۔ یہاں تک کہ وہ یہ کہتے تھے کہ "ما حرم علینا شیٔ اشد من الخمر.

شراب کے حرام ہونے سے زیادہ اور کوئی حکم ہم پر سخت تر نہیں تھا"[1]

یہ بات واضح ہے کہ اگر اسلام چاہتا کہ اس عظیم عمومی وبا کے خلاف نفسیات اور معاشرے کے اجتماعی اصول کو مدنظر رکھے بغیر برسرپیکار ہو جائے تو کامیابی ممکن نہ تھی لہٰذا اس نے مے نوشی کی بیخ کنی کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا۔ پہلے ان کے اذہان و افکار کو آمادہ کیا پھر حرمت کا حکم نافذ کیا گیا۔ کیونکہ مے نوشی کی عادت ان کی ایک فطرت ثانیہ بن چکی تھی پہلے کی سورتوں میں بعض آیات میں اس کام کی برائی کی طرف کچھ اشارے کئے گئے۔ جیسا کہ سورہ نحل کی آیت ۶۷ میں ہے:

"ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منه سکرا و رزقا حسنا"

تم انگور اور کھجور کے درخت کے پھلوں سے سکرات (نشہ آور چیزیں) اور پاکیزہ روزی فراہم کرتے ہو۔

اس مقام پر لفظ "سکر" یعنی مسکر اور اس شراب کو جو وہ انگور اور خرما سے حاصل کرتے تھے رزق حسن کے مدمقابل بیان کیا گیا ہے اور اسے ایک ناپاک اور آلودہ مشروب شمار کیا گیا ہے۔

لیکن شراب خواری کی بری عادت نے اس سے کہیں زیادہ جڑیں پکڑی ہوئی تھیں کہ اس کی ان اشاروں سے بیخ کنی ہو جاتی۔ اس کے علاوہ شراب ان کی اقتصادی درآمدات کے ایک حصہ کی ضامن بھی تھی لہٰذا جب مسلمان مدینے میں منتقل ہو گئے اور پہلی اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی تو شراب خواری کی ممانعت کے بارے میں دوسرا حکم قاطع تر صورت میں نازل ہوا تاکہ افکار کو (شراب کی) حرمت کے انتہائی حکم کے لیے اور زیادہ آمادہ کیا جا سکے۔ یہ موقع تھا جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ نازل ہوئی:

"یسئلونك عن الخمر و المیسر قل فیهما اثم کبیر و منافع للناس و اثمهما اکبر من نفعهما"

اس آیت میں بعض معاشروں مثلاً دور جاہلیت کے لیے شراب کے اقتصادی منافع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کے خطرات

---

[1] المنار جلد ۷، صفحہ ۵۱۔

اور عظیم نقصانات کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی ہے جو کہ اُس کے اقتصادی منافع سے کئی درجے بڑھ کر ہیں۔

اس کے بعد سورۂ نساء کی آیہ ۴۳ ہے :

"یاایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصّلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتیٰ تعلموا ما تقولون"

اس میں مسلمانوں کو صراحت سے حکم دیا گیا ہے کہ وہ مستی کی حالت میں ہرگز نماز نہ پڑھیں جب تک یہ نہ جانیں کہ وہ اپنے خدا سے کیا باتیں کر رہے ہیں۔

البتہ اس آیت کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ نماز کی حالت کے علاوہ شراب پینا جائز ہے بلکہ مقصد وہی تدریجی طور پر اس کی حرمت کا حکم نافذ کرنا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ آیت نماز کی حالت کے علاوہ دوسری حالتوں کے سلسلے میں خاموش ہے اور صراحت سے کچھ نہیں کہتی۔

مسلمانوں کی احکام اسلام سے شناسائی اور اس عظیم معاشرتی روگ کو جو اُن کے وجود کی گہرائیوں میں اُتر چکا تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اُن کی فکری آمادگی اس بات کا سبب بنی کہ آخری حکم مکمل صراحت اور قاطعیت سے نازل ہو اکہ جس کے بعد بہانہ سازی کرنے والے بھی اس پر اعتراض نہ کر سکیں اور وہ یہی زیرِ بحث آیت ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں مختلف تعبیرات کے ذریعے اس کام کی ممنوعیت پر تاکید کی گئی ہے :

۱ - آیت " یاایھا الذین اٰمنوا " کے خطاب سے شروع ہوئی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حکم کی مخالفت روحِ ایمان کے منافی ہے۔

۲ - اس کے بعد لفظ " انما " جو استعمال ہوا ہے حصر و تاکید کے لیے ہے۔

۳ - شراب اور قمار بازی کو انصاب[۱] (وہ بت کہ جن کی کوئی مخصوص شکل و صورت نہیں تھی صرف پتھر کے ٹکڑے سے بنے ہوئے تھے) کے ساتھ ساتھ ذکر کرتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ شراب اور قمار بازی کا خطرہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ بت پرستی کے ہم پلہ قرار پایا ہے۔ اسی بنا پر پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت میں ہے :

"شارب الخمر کعابد الوثن"

شراب خوار بت پرست کی مانند ہے[۲]

۴ - شراب، قمار بازی اور اسی طرح بت پرستی اور ازلام (جو ایک قسم کی لاٹری ہے[۳]) یہ سب رجس و پلیدی کے طور پر شمار کیے گئے ہیں (انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس)۔

۵ - یہ تمام اعمال شیطانی اعمال میں سے قرار دیے گئے ہیں (من عمل الشیطٰن)۔

۶ - آخر کار ان سے اجتناب کرنے کے بارے میں قطعی حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے (فاجتنبوہ)۔

---

[۱] انصاب و نصیب کے بارے میں ہم اس تفسیر کی جلد چہارم میں بحث کر چکے ہیں۔

[۲] حاشیہ تفسیر طبری جلد ہفتم صفحہ ۳۱۔ یہی حدیث تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۶۶۹ میں امام صادقؑ سے بھی منقول ہے۔

[۳] "ازلام" کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد چہارم میں بحث کر چکے ہیں (دیکھیے صفحہ ۳۰۵ اردو ترجمہ)۔

ضمنی طور پر توجہ رہے کہ اجتناب، نہی کی نسبت زیادہ رسا مفہوم رکھتا ہے کیونکہ اجتناب کا معنی فاصلہ پر رہنا، دوری اختیار کرنا اور نزدیک نہ جانا ہے جو کہ "نہ پیو" سے کہیں بہتر اور رسا تر ہے۔

۷ - اس آیت کے آخر میں قرآن کہتا ہے کہ یہ حکم اس بنا پر دیا گیا ہے تاکہ تم کامیابی اور فلاح حاصل کرو (لعلکم تفلحون) یعنی اس کے بغیر کامیابی اور نجات ممکن نہیں ہے۔

۸ - بعد والی آیت میں شراب اور قمار بازی کے بعض واضح نقصان ذکر کیے گئے ہیں۔ پہلے کہتا ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ شراب اور قمار بازی کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت و دشمنی کی تخم ریزی کرے اور تمہیں نماز اور ذکر خدا سے باز رکھے (انما یرید الشیطٰن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ)۔

۹ - اس آیت کے آخر میں استفہام تقریری کے طور پر کہتا ہے: کیا تم اس سے بچوگے اور رک جاؤ گے (فہل انتم منتھون) یعنی کیا ان تمام تاکیدوں کے باوجود بھی ان دو عظیم گناہوں کو ترک کرنے کے بارے میں کوئی بہانہ جوئی یا شک و تردد کی گنجائش رہ گئی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر تک بھی جو گذشتہ آیات کی تصریحات کو اس لگاؤ کی وجہ سے جو (بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق) انہیں شراب سے تھا کافی نہیں سمجھتے تھے لیکن اس آیت کے نزول کے بعد کہنے لگے کہ یہ حکم کافی دوانی اور قناعت کنندہ ہے۔

۱۰ - تیسری آیت میں اس حکم کی تاکید کے طور پر پہلے تو مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کریں اور اس کی مخالفت سے پرہیز کریں۔

"واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا"

اس کے بعد مخالفین کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر انہوں نے پروردگار کے فرمان کی اطاعت سے روگردانی کی تو کیفر کردار اور سزا کے مستحق ہوں گے اور پیغمبر کی ذمہ داری اور فریضہ سوائے واضح ابلاغ و تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے (فان تولیتم فاعلموا انما علیٰ رسولنا البلٰغ المبین)۔

شراب اور قمار بازی کے مہلک اثرات

تفسیر نمونہ کی دوسری جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۱۹ کے ذیل میں ان دو اجتماعی اور معاشرتی بلاؤں کے سلسلے میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے لیکن یہاں بھی تاکید مطلب کے لیے قرآن مجید کی اقتدا کے طور پر ضروری ہے کہ کچھ اور نکات کا تذکرہ کیا جائے۔ یہ نکات ان مختلف اعداد و شمار کا مجموعہ ہیں جن میں علیحدہ علیحدہ ان نقصانات کی گہرائی اور وسعت ظاہر ہوتی ہے جن کا تعلق ان دونوں سے ہے۔

۱۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو انگلستان میں الکحل کے جنون کے بارے میں شائع ہوئے ہیں کہ جن میں اس دیوانگی کا دوسری چیزوں سے ہونے والی دیوانگی اور جنون سے موازنہ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۴۹ الکحل کے دیوانوں کے مقابلہ میں صرف ۵۳ دیوانے دوسرے اسباب کی وجہ سے ہوئے تھے[1]

---

[1] سیمپوزیوم الکحل صفحہ ۶۵۔

۲ ۔ دوسرے اعداد و شمار میں جو امریکہ کے ہسپتالوں سے ہاتھ لگے ہیں ان کے نفسیاتی مریضوں میں سے ۸۵ فیصد الکحل سے مریض تھے[1]

۳ ۔ ایک انگریز دانشور جس کا نام "بنثام" ہے لکھتا ہے: مشروبات الکحل شمالی ممالک میں انسان کو احمق و بے وقوف بناتے ہیں اور جنوبی ممالک میں دیوانہ بنا دیتے ہیں۔ پھر مزید کہتا ہے: دین اسلام نے تمام قسم کے مشروبات الکحل کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے[2]

۴ ۔ جن لوگوں نے مستی اور نشہ کی حالت میں کوئی قتل یا کسی اور جرم کا ارتکاب کیا ہے اور گھروں کے گھر ویران کر دیئے اور خاندان کے خاندان تباہ کر دیئے ہیں اگر ان کے اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو وہ ہوش ربا حد تک بہت زیادہ ہوں گے[3]

۵ ۔ فرانس میں ہر روز ۴۴۰ افراد اپنی جان الکحل کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں[4]

۶ ۔ ایک اور اعداد و شمار کے مطابق امریکہ میں ایک سال میں نفسیاتی بیماریوں سے تلف ہونے والی جانیں دوسری عالمی جنگ میں امریکیوں کی تلف ہونے والی جانوں سے دوگنی تھیں اور محققین کے نظریہ کے مطابق امریکہ میں نفسیاتی بیماریوں میں مشروبات الکحل اور سگرٹ نوشی کا بنیادی حصہ ہے[5]

۷ ۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو ایک دانشور ہوگر کے ذریعے مجلۂ علوم کی بیسویں سالگرہ کی مناسبت سے شائع ہوئے تھے ۶۰ فیصد قتل عمد، ۷۵ فیصد مار پیٹ اور زخمی کرنے کے جرائم، ۳۰ فیصد اخلاقی جرائم (جن میں محارم سے زنا کے جرائم بھی شامل ہیں) اور ۹۰ فیصد چوری چکاری کے جرائم شراب اور مشروبات الکحل کے ساتھ مربوط تھے۔ اسی دانشور کے اعداد و شمار کے مطابق ۴۰ فیصد مجرم بچے الکحل کے سابقہ اثر کے حامل ہیں[6]

۸ ۔ اقتصادی نقطہ نظر سے صرف انگلستان میں وہ نقصانات جو کاریگروں کے کارخانوں سے مے نوشی کی وجہ سے غیر حاضر رہنے سے پیدا ہوتے ہیں سال میں ۵۰ ملین ڈالر (تقریباً اسی کروڑ روپے موجودہ حساب سے) ہیں۔ یہ وہ رقم ہے جو ہزاروں نرسری، پرائمری اور ہائی سکولوں کے اخراجات پورے کر سکتی ہے[6]

۹ ۔ ان اعداد و شمار کے مطابق جو مے نوشی کے نقصانات کے سلسلے میں فرانس میں شائع ہوئے ہیں ۱۳۷ ارب فرانک سالانہ انفرادی نقصانات کے علاوہ حکومت فرانس کے مخارج میں الکحل سے مندرجہ ذیل تفاصیل کے مطابق نقصان ہوتا ہے:۔

---

[1] کتاب سمپوزیوم الکحل صفحہ ۶۶۔

[2] تفسیر طنطاوی جلد اول صفحہ ۱۶۵۔

[3] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد ۳ صفحہ ۷۹۰۔

[4] بلاهای اجتماعی قرن ما صفحہ ۲۰۵۔

[5] مجموعہ انتشارات نسل نو۔

[6] سمپوزیوم الکحل صفحہ ۶۶۔

[7] مجموعہ انتشارات نسل جوان سال دوم صفحہ ۳۳۰۔

۲۰ ارب فرانک عدالت اور قید خانے کے اخراجات۔

۴۰ ارب فرانک تعاون عمومی اور خیرات کے اخراجات۔

۱۰ ارب فرانک شراب خواری کے ہسپتالوں کے اخراجات۔

۷۰ ارب فرانک معاشرے کے امن و امان کو برقرار رکھنے کے اخراجات۔

تو اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی بیماریوں، ہسپتالوں، قتلوں، خونیں فسادات، چوریوں، زیادتیوں اور حادثوں کی تعداد میخانوں کی تعداد کے ساتھ براہِ راست منسلک ہے۔[1]

۱۰ ـ امریکہ میں اعداد و شمار کے سب سے بڑے مرکز نے ثابت کر دیا ہے کہ قمار بازی کا ۳۰ فیصد جرائم میں براہِ راست حصہ ہے۔

دوسرے اعداد و شمار کے مطابق جو قمار بازوں کے سلسلے میں شائع ہوئے ہیں، بڑے افسوس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ ۳۰ فیصد جیب تراشی، ۵۰ فیصد جنسی جرائم، ۱۰ فیصد اخلاقی خرابیاں، ۳۰ فیصد طلاقیں، ۴۰ فیصد مارپٹائی اور زخمی کرنے کے واقعات اور ۵ فیصد خودکشیاں قمار بازی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔[2]

۹۳۔ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ۧ

ترجمہ

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں۔ پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اسے مانیں۔ پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

شانِ نزول: تفسیر مجمع البیان، تفسیر طبری، تفسیر قرطبی اور بعض دوسری تفاسیر میں اس طرح آیا ہے کہ شراب و قمار بازی کی حرمت کی آیت

---

[1] نشریہ مرکز مطالعہ پیش رفت ہائے ایران (الکحل اور قمار بازی کے بارے میں)

[2] نشریہ مرکز مطالعہ پیش رفت ہائے ایران (برائے الکحل و قمار بازی)

کے نزول کے بعد بعض اصحاب پیغمبرؐ نے کہا کہ اگر ان دونوں کاموں کے یہ سب گناہ ہیں تو پھر ہمارے اُن مسلمان بھائیوں کا کیا بنے گا جو اس آیت کے نزول سے پہلے مر چکے ہیں اور انہوں نے اس وقت تک ان دونوں کاموں کو ترک نہیں کیا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اُنہیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

اس آیت میں اُن لوگوں کے بارے میں جواب دیتے ہوئے جو شراب اور قمار بازی کی حرمت کے نزول سے پہلے مر چکے تھے یا اُن لوگوں کے بارے میں کہ جن کے کانوں تک ابھی تک یہ حکم نہیں پہنچا تھا اور وہ دور دراز کے علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ایمان رکھتے تھے اور عمل صالح انجام دیتے تھے اور یہ حکم اُن تک نہیں پہنچا تھا، اگر انہوں نے شراب پی ہے یا قمار بازی کی کمائی سے کھاتے رہے تو اُن پر کوئی گناہ نہیں ہے (لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت جناح فیما طعموا[1])۔

اس کے بعد اس حکم کو اس بات کے ساتھ مشروط کرتا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لے آئیں اور عمل صالح بجا لائیں (اذا ما اتقوا و اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت)۔

پھر اس امر کی تکرار کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: پھر تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لے آؤ (ثم اتقوا و اٰمنوا)۔

اس کے بعد تیسری مرتبہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی حکم کی تکرار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پھر تقویٰ اختیار کرو اور نیکی کرو (ثم اتقوا و احسنوا)۔

آیت کے آخر میں فرمایا: خدا نیک لوگوں کو دوست رکھتا ہے (و اللہ یحب المحسنین)۔

ان تین جملوں کی تکرار کے سلسلے میں قدیم و جدید مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے، بعض انہیں تاکید پر محمول کرتے ہیں کیونکہ تقویٰ، ایمان اور عمل صالح کے موضوعات کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں پختگی کے ساتھ بار بار بیان کیا جائے اور تاکید کی جائے۔

لیکن بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ ان تینوں جملوں میں سے ہر ایک میں ایک علیحدہ اور جداگانہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے ان کے اختلاف کے سلسلے میں کئی احتمال پیش کیے ہیں کہ جن میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ جن کی کوئی دلیل اور شاہد نہیں ہے۔

شاید اس سلسلے میں بہترین بات یہ ہے کہ پہلی مرتبہ ذکر ہونے والے "تقویٰ" سے مراد وہی اندرونی اور باطنی احساسِ ذمہ داری ہے جو انسان کو دین کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنے، پیغمبر کے معجزہ میں غور و فکر کرنے اور حق کے بارے میں جستجو کرنے پر اُبھارتی ہے

---

[1] یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "طعام" زیادہ تر کھانے کی چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ پینے کی چیزوں کے لیے لیکن بعض اوقات پینے کی چیزوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً سورہ بقرہ کی آیہ ۲۴۹ میں ہے: فمن شرب منه فلیس منی ومن لم یطعمه فانه منی۔

جس کا نتیجہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک تقویٰ کا ایک مرحلہ وجود انسانی میں پیدا نہیں ہوتا اُس وقت تک اُسے تحقیقِ حق کی جستجو کی فکر لاحق نہیں ہوتی۔ اس بنا پر پہلی مرتبہ اوپر والی آیت میں تقویٰ کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے وہ تقویٰ کے اسی مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ چیز آیت کی ابتداء کے اس حصّے کے منافی نہیں ہے: لیس علی الذین امنوا وعملوا الصّٰلحٰت کیونکہ ہو سکتا ہے کہ آیت کی ابتداء میں ایمان ظاہری تسلیم کے معنی میں ہو لیکن جو ایمان تقویٰ کے بعد پیدا ہوتا ہے وہ حقیقی ایمان ہے۔

دوسری دفعہ جو تقویٰ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے وہ اُس تقویٰ کی طرف اشارہ ہے جو انسان کے اندر اور باطن میں نفوذ کر جائے کہ جس کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ ایمان مستقر و ثابت ہے، کہ عمل صالح جس کا ایک حصّہ اور جزء ہے۔ اسی لیے دوسرے مرحلے میں ایمان کے ذکر کے بعد عمل صالح کا تذکرہ نہیں ہے۔ بس اتنا فرمایا گیا ہے ثمّ اتقوا و امنوا ... یعنی یہ ایمان اس قدر نافذ و ثابت ہے کہ اس کے بعد عمل صالح کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

تیسری مرتبہ تقویٰ سے متعلق جو گفتگو ہے اس سے مراد وہ تقویٰ ہے جو اپنے بلند ترین مرحلے تک پہنچ جاتا ہے اس طور پر کہ اب اُسے حتمی فرائض کی انجام دہی کی دعوت کے علاوہ احسان یعنی نیک کاموں کی دعوت بھی دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اُن کاموں کے لیے بھی کہ جو واجبات میں داخل نہیں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ کے بارے میں تین مرتبہ کا یہ تذکرہ احساسِ ذمہ داری اور پرہیزگاری کے ایک ایک مرحلہ کی طرف اشارہ ہے، "ابتدائی مرحلہ"، "درمیانہ مرحلہ" اور "آخری مرحلہ" اور ان میں سے ہر ایک خود آیت میں ایک قرینہ رکھتا ہے کہ جس کا سہارا لے کر مقصد کو معلوم کیا جا سکتا ہے، بخلاف ان احتمالات کے جو بعض مفسرین نے ان تینوں قسم کے تقویٰ اور ایمان کے فرق کے بارے میں پیش کیے ہیں کہ جن کے لیے کوئی قرینہ اور شاہد موجود نہیں ہے۔

۹۴۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

۹۵۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَ اَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَ مَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ

اللّٰهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ ○

۹۶۔ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○

ترجمہ

۹۴۔ اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار کی اس مقدار کے ساتھ کہ (جو تمہارے قریب آجائیں اور) تمہارے ہاتھ اور نیزے اُن تک پہنچ جاتے ہیں، آزمائے گا، تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون شخص غیب پر ایمان رکھتے ہوئے خدا سے ڈرتا ہے اور جو شخص اُس کے بعد تجاوز کرے تو اُس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

۹۵۔ اے ایمان والو! حالت احرام میں شکار کو قتل نہ کرو اور جو شخص تم میں سے جان بوجھ کر اُسے قتل کرے گا تو اُسے چاہیے کہ اُس کا معادل کفارہ چوپاؤں میں سے دے۔ ایسا کفارہ کہ جس کے معادل ہونے کی دو آدمی تصدیق کریں اور وہ قربانی کی شکل میں (حریم) کعبہ میں پہنچے یا (قربانی کے بجائے) مساکین و فقرا کو کھانا کھلائے یا اس کے معادل روزے رکھے تاکہ اپنے کام کی سزا کا مزہ چکھے جو کچھ گذشتہ زمانے میں ہو چکا ہے خدا نے وہ معاف کیا اور جو شخص تکرار کرے خدا اُس سے انتقام لے گا اور خدا توانا اور صاحبِ انتقام ہے۔

۹۶۔ دریا کا شکار اور اس کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے تاکہ تم اور مسافرین اس سے فائدہ اٹھائیں لیکن جب تک تم حالت احرام میں ہو تو صحرا کا شکار تم پر حرام ہے اور خدا (کی نافرمانی) سے کہ جس کی طرف تم محشور ہو گے ڈرتے رہو۔

شانِ نزول

جیسا کہ کتاب کافی اور بہت سی تفاسیر میں منقول ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلامؐ اور مسلمان حدیبیہ والے سال عمرہ کے لیے احرام باندھ کر چل پڑے تو انہیں راستے میں بہت سے وحشی جانوروں کا اس طرح سے سامنا ہوا کہ اُن کے لیے آسان تھا کہ ہاتھ یا نیزے سے انہیں شکار کریں۔ یہ شکار اس قدر زیادہ تھے کہ بعض نے لکھا ہے کہ سواریوں کے دوش بدوش اور خیموں کے نزدیک آتے جاتے تھے تو اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو شکار کرنے سے ڈرایا اور انہیں اس خطرے سے آگاہ کیا کہ یہ امر اُن کے

لیے ایک طرح کا امتحان ہے۔

تفسیر

حالتِ احرام میں شکار کرنے کے احکام

یہ آیات عمرہ اور حج کے احکام میں سے ایک حکم یعنی حالتِ احرام میں صحرائی اور دریائی جانوروں کے شکار کا مسئلہ بیان کرتی ہیں۔ پہلے تو اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جس کا "حدیبیہ" والے سال مسلمانوں کو سامنا کرنا پڑا تھا ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان والو! خدا تمہیں شکار میں سے ایک چیز کے ساتھ آزمائے گا، ایسے شکار جو تمہارے اس قدر نزدیک ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ تم نیزہ اور ہاتھ کے ساتھ انہیں شکار کر سکتے ہو (یاایھا الذین اٰمنوا لیبلونکم اللہ بشیٔ من الصید تنالہ ایدیکم و رماحکم)۔

آیت کی تعبیر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا یہ چاہتا ہے کہ پیش بینی کے طور پر لوگوں کو ایک ایسے واقعہ سے جو انہیں پیش آنے والا تھا آگاہ کرے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام شکار کا وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں کی پہنچ میں آجانا ایک ایسا امر تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور یہ مسلمانوں کے لیے ایک قسم کی آزمائش تھی خصوصاً یہ دیکھتے ہوئے جانوروں کے گوشت سے غذا مہیا کرنے کی انہیں ضرورت بھی تھی۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ جانور وسوسہ انگیزی کی صورت میں خیموں کے اطراف میں اور ان کے گرد اگرد آتے جاتے تھے، اس قسم کی میسر غذا سے محروم رہنا، وہ بھی اس زمانے اور وقت میں اور ایسے لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ اس جملہ سے مراد کہ "تمہارے ہاتھ سے شکار کے قابل ہوں گے"، یہ ہے کہ وہ انہیں جال وغیرہ سے پکڑ سکتے تھے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حقیقتاً ان کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ خود ہاتھ سے انہیں پکڑ سکتے تھے۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر فرمایا ہے: یہ ماجرا اس لیے ہوا تھا کہ وہ لوگ جو ایمان بالغیب کی بنا پر خدا سے ڈرتے ہیں دوسرے لوگوں سے ممتاز ہو جائیں (لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب)۔

جیسا کہ ہم جلد اول میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۴۳ کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ "لنعلم" "تاکہ ہم جان لیں یا" لیعلم "تاکہ خدا جان لے" وغیرہ جیسی تعبیرات سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا کسی چیز کو جانتا نہیں اس لیے وہ چاہتا ہے کہ آزمائش اور امتحان وغیرہ کے ذریعہ سے جان لے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم چاہتے کہ اپنی واقعیتِ علمی کو عملی جامہ اور تحققِ خارجی کا لباس پہنائیں کیونکہ باطنی نیتیں اور لوگوں کی آمادگیاں، تکامل و ارتقا، اور جزا و سزا کے لیے اکیلی ہی کافی نہیں ہیں بلکہ انہیں خارجی افعال کی شکل میں ظہور پذیر ہونا چاہیے تاکہ وہ ان آثار کے حامل ہو سکیں (مزید وضاحت کے لیے مذکورہ آیہ کی تفسیر کی طرف رجوع کیجیے)۔

آیت کے آخر میں اُن اشخاص کو کہ جو اس خدائی حکم کی مخالفت کرتے ہیں دردناک عذاب کی تہدید کی گئی ہے (فمن اعتدٰی بعد ذٰلک فلہ عذاب الیم)۔ اگرچہ آیت کا آخری جملہ اجمالی طور پر حالتِ احرام میں شکار کی حرمت پر دلالت کرتا ہے لیکن بعد والی

آیت میں مزید صراحت اور قطعیت کے ساتھ اور بطور عموم حالت احرام میں شکار کے حرام ہونے کا حکم صادر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے : اے ایمان لانے والو! حالت احرام میں شکار نہ کرو (یاَیھا الذین اٰمنوا لا تقتلوا الصید و انتم حرم)۔

کیا شکار کی حرمت (جو بعد والی آیت کے قرینہ کے ساتھ صحرائی شکار ہے) صحرائی تمام اقسام شکار پر محیط ہے چاہے وہ حلال گوشت ہوں یا حرام گوشت یا حلال گوشت شکار سے مخصوص ہے۔

مفسرین اور فقہا کے درمیان اس سلسلے میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے۔

تاہم فقہا و مفسرین امامیہ میں مشہور یہ ہے کہ حکم عام ہے اور جو روایات اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہیں بعض فقہائے اہل سنت مثلاً ابو حنیفہ ہمارے ساتھ اس سلسلے میں متفق ہیں مگر دوسرے بعض مثلاً شافعی اسے حلال گوشت جانوروں کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں بہر حال یہ حکم گھریلو جانوروں کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ گھریلو جانوروں کو صید و شکار نہیں کہا جاتا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہماری روایات میں نہ صرف یہ کہ حالت احرام میں شکار کرنا حرام ہے بلکہ اس میں مدد کرنا، اشارہ کرنا اور شکار کی نشاندہی کرنا بھی حالت احرام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ یہ تصور کریں کہ صید و شکار کا مفہوم حرام گوشت جانوروں پر محیط نہیں ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جانوروں کا شکار مختلف مقاصد کے لیے انجام پاتا ہے۔ بعض اوقات مقصود اُن کے گوشت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے، بعض اوقات ان کی کھال سے نفع حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات ان کی مزاحمت کو دور کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ وہ مشہور شعر جو حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے وہ بھی عمومیت کا شاہد بن سکتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

صید الملوک ارانب و ثعالب ٭ و اذا رکبت فصیدی الابطال

بادشاہوں کے شکار خرگوش اور لومڑیاں ہیں لیکن میرا شکار، جب میں میدان جنگ میں وارد ہوتا ہوں تو شجاع اور بہادر ہوتے ہیں۔

(مزید وضاحت کے لیے فقہی کتب کی طرف رجوع کیا جائے)۔

اس کے بعد حالت احرام میں شکار کرنے کے کفارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، جو شخص جان بوجھ کر شکار کو قتل کردے تو اُسے چاہیے کہ چوپاؤں میں سے اُن جیسے جانور کفارہ میں دے یعنی انہیں قربانی کرکے ان کا گوشت فقراء و مساکین کو دے (و من قتلہ منکم متعمداً فجزاء مثل ما قتل من النعم)۔

یہاں مثل سے مراد کیا ہے ؟ کیا شکل و صورت اور مقدار میں ایک جیسا ہونا، اس معنی میں کہ مثلاً اگر کوئی شخص کسی بڑے وحشی جانور مثلاً شتر مرغ کو شکار کرتا ہے تو اُسے چاہیے کہ اس کا کفارہ اونٹ کی صورت میں دے ؟ یا اگر ہرن کا شکار کرتا ہے تو کفارہ کے لیے بھیڑ بکری کی قربانی دے جو تقریباً اس جیسی ہے ؟ یا یہ کہ مثل سے مراد قیمت میں ایک جیسا ہونا ہے ؟

فقہا اور مفسرین میں پہلا معنی ہی مشہور ہے اور آیت کا ظاہری مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے، کیونکہ حلال گوشت اور حرام گوشت کے حکم عمومی کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھیں تو بہت سے جانور ایسے ہیں جن کی قیمت ثابت و مشخص نہیں ہے کہ جس کے ذریعے ان جیسے گھریلو

جانوروں کا انتخاب کیا جا سکے اور اس کا مثل شکل وصورت اور مقدار کے مطابق ہی مل سکے ورنہ دوسری صورت میں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کہ کسی طرح سے اس شکار کی قیمت معین کی جائے اور اُس کا مثل قیمت کے لحاظ سے حلال گوشت گھریلو جانوروں میں سے انتخاب کریں۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات مثل کے معاملے میں کوئی شک و تردد پیدا ہو جائے لہٰذا قرآن نے حکم دیا ہے کہ یہ کام دو باخبر اور عادل افراد کے زیر نظر انجام پذیر ہو (یحکم به ذوا عدل منکم)۔

اس سلسلے میں کہ یہ قربانی کہاں ذبح ہو، حکم دیتا ہے کہ وہ قربانی اور "ھدی" کی صورت میں کعبہ کا ہدیہ بنایا جائے اور سرزمین کعبہ میں پہنچے (ھدیًا بالغ الکعبة)۔ ضمنی طور پر توجہ رہے کہ ہمارے فقہا کے درمیان مشہور ہے کہ احرام عمرہ کی حالت میں شکار کا کفارہ مکہ میں ذبح ہونا چاہیے اور احرام حج کی حالت میں منیٰ اور قربان گاہ میں اور یہ بات اُوپر والی آیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت احرام عمرہ کی حالت میں نازل ہوئی ہے، اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ ضروری نہیں کہ حتماً کفارہ قربانی کی صورت میں ہو بلکہ دو اور چیزوں میں سے بھی ہر ایک اُس کی جانشین ہو سکتی ہے۔ پہلا یہ کہ اُس کے برابر رقم مساکین کو کھانا کھلانے میں صرف کی جائے (او کفارة طعام مسٰکین) یا اُس کے مساوی روزے رکھے (او عدل ذٰلک صیامًا)۔

اگرچہ آیت میں اُن مساکین کی تعداد جنہیں کھانا کھلانا ہے بیان نہیں ہوئی اور نہ ہی روزوں کے دنوں کی تعداد بتائی گئی ہے لیکن ایک طرف سے ان دونوں کا ایک دوسرے سے ساتھ ہونا اور دوسری طرف یہ صراحت کہ روزوں کے درمیان موازنہ ضروری ہے، نشاندہی کرتا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جتنے مسکینوں کو وہ کھانا کھلانا چاہے کھلادے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ قربانی کی قیمت کے برابر ہونا چاہیے۔ باقی رہا یہ کہ روزہ اور مسکین کو کھانا کھلانے کے درمیان تعادل و برابری کس طرح قائم ہو، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک "مد" طعام (یعنی تقریباً ۷۵۰ گرام گندم وغیرہ) کے مقابلہ میں ایک دن روزہ رکھے اور بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر دو "مد" طعام کے مقابلہ میں ایک روزہ رکھے۔ یہ حقیقت میں اس بنا پر ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں جو اشخاص روزہ پر قدرت نہیں رکھتے تو وہ ہر دن کے بدلے میں ایک یا دو مد کھانا مساکین کو کھلائیں (اس امر کے بارے میں مزید وضاحت فقہی کتب میں ملاحظہ فرمائیں)۔

اس بارے میں کہ وہ شخص جو حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہوا ہے کیا وہ ان تین چیزوں میں سے جس کو چاہے کرے یا اُسے ترتیب کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ پہلے تو اُسے قربانی کرنا چاہیے اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو مساکین کو کھانا کھلائے اور اگر یہ بھی میسّر نہ ہو تو پھر روزہ رکھے۔ اس سلسلے میں مفسرین اور فقہا کے درمیان اختلاف ہے لیکن آیت کا ظاہر اختیار کا معنی دیتا ہے۔ یہ کفارے تو اس بنا پر ہیں کہ وہ اپنے غلط کام کی سزا اور انجام کو دیکھ لیں (لیذوق وبال امرہٖ)۔

اور اس بنا پر کہ عموماً کوئی حکم بھی گذشتہ امور کو شامل نہیں ہوتا صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا نے اُن غلط کاریوں کو جو اس سلسلے میں گذشتہ زمانے میں تم نے انجام دی ہیں معاف کر دیا ہے (عفا اللہ عما سلف)۔

۱۔ وبال جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے اصل میں "وبل" اور "وابل" سے سخت بارش کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مشکل، شاق اور سخت کام پر بھی بولا جانے لگا اور چونکہ سزا و عذاب میں بھی شدت اور سختی ہوتی ہے لہٰذا اسے وبال کہتے ہیں۔

اور جو شخص ان بار بار کے اظہار کے خطر، اور کفارہ کے حکم کی پروا نہ کرے اور پھر بھی حالت احرام میں شکار کا مرتکب ہو تو خدا ایسے شخص سے انتقام لے گا، اور خدا توانا و صاحب قدرت ہے اور بر محل انتقام لیتا ہے (ومن عاد فینتقم الله منه والله عزیز ذوانتقام)۔

مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا شکار کا کفارہ دوبارہ شکار کرنے سے دوگنا ہوتا ہے یا نہیں؟ تو آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ تکرار کی صورت میں صرف انتقام الٰہی کی تہدید اور دھمکی ہی دی گئی ہے اور اگر کفارہ کا تکرار بھی ہوتا تو صرف انتقام الٰہی کے ذکر پر اکتفا نہ کی جاتی اور تکرار کفارہ کی تصریح بھی ہوتی۔ ان روایات میں جو اہل بیت علیہم السلام کے طریق سے ہم تک پہنچی ہیں یہی بات بیان کی گئی ہے۔

بعد والی آیت میں دریائی شکار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: (حالت احرام میں) دریائی شکار اور اسے کھانا تمہارے لیے حلال ہے (احل لکم صید البحر وطعامه)۔

اس بارے میں کہ طعام اور کھانے سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد وہ مچھلیاں ہیں جو شکار کیے بغیر مر جاتی ہیں اور پانی کے اُوپر رہ جاتی ہیں، جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کیونکہ مردہ مچھلی کا کھانا حرام ہے۔ اگرچہ اہل سنت کی بعض روایات میں ان کے حلال ہونے کی صراحت موجود ہے۔

آیت کے ظاہری مفہوم سے جو بات زیادہ سے زیادہ معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ طعام سے مراد وہی خوراک ہے کہ جو شکار شدہ مچھلیوں سے تیار کی جاتی ہے کیونکہ آیت دو امور کو جائز قرار دے رہی ہے پہلے شکار کرنا اور دوسرے شکار شدہ کھانا کھانا۔

ضمناً اس تعبیر سے اس معروف فتویٰ کے لیے بھی اجمالی طور پر استفادہ ہوتا ہے جو ہمارے فقہا کے درمیان موجود ہے اور جو بری (صحرائی) جانوروں کے بارے میں ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف نہیں شکار کرنے کا اقدام حرام ہے بلکہ شکار شدہ جانور کا گوشت کھانا بھی جائز نہیں ہے۔

اس کے بعد اس حکم کے فلسفہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ اس بنا پر ہے کہ تم اور مسافر اس سے فائدہ اٹھا سکیں (متاعاً لکم وللسیارة)۔

یعنی اس غرض سے کہ تم حالت احرام میں کھانے کے لیے زحمت و مشقت میں نہ پڑو اور ایک قسم کے شکار سے فائدہ اٹھا سکو یہ اجازت تمہیں دریائی شکار کے بارے میں دی جاتی ہے۔

اور چونکہ عموماً اگر مسافر یہ چاہیں کہ شکار شدہ مچھلی اپنے ساتھ لے جائیں تو اس میں نمک ملا کر اُسے "ماہی شور" کی صورت میں تیار کر لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا جملے کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ مقیم افراد تازہ مچھلی سے اور مسافر نمک لگی مچھلی سے استفادہ کریں۔

ہم نے درج بالا آیت میں یہ پڑھا ہے کہ دریائی شکار تمہارے لیے حلال ہے۔ یہاں اشتباہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا مفہوم دریائی شکاروں کے بارے میں ایک عمومی حکم نہیں ہے، جیسا کہ بعض نے خیال کر لیا ہے۔ آیت یہاں پر دریائی شکاروں کا اصل حکم بیان کرنا نہیں چاہتی۔ بلکہ آیت کا مقصد و ہدف یہ ہے کہ وہ احرام باندھے ہوئے شخص کو اس بات کی اجازت دے کہ دریا کے وہ شکار جو احرام سے پہلے اس پر حلال تھے احرام کی حالت میں بھی وہ اُس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آیت یہاں اصل تشریع

قانون بیان نہیں کر رہی بلکہ اس کی نظر اُن قانونی خصوصیات کی طرف ہے جو پہلے سے تشریع ہو چکا ہے۔ اصطلاح میں یہ بیان حکم عمومی کے نقطہ نظر سے نہیں بلکہ آیت صرف محرم کے احکام بیان کر رہی ہے۔

مگر دوسری مرتبہ تاکید کے طور پر حکم سابق کی طرف لوٹتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب تک تم حالت احرام میں ہو صحرائی اور وحشی جانوروں کا شکار تم پر حرام ہے (وحرم علیکم صید البر ما دمتم حرما)۔

آیت کے آخر میں اُن تمام احکام کی تاکید کے لیے، جو ذکر ہو چکے ہیں فرماتا ہے: اس خدا سے ڈرو جس کی بارگاہ میں تمہیں قیامت کے دن محشور ہونا ہے (واتقوا اللہ الذی الیہ تحشرون)۔

حالتِ احرام میں شکار کی حرمت کا فلسفہ

ہمیں معلوم ہے کہ حج و عمرہ ان عبادات میں سے ہے جو انسان کو عالم مادہ سے جدا کر کے ایک ایسے ماحول میں جو روحانیت و معنویت سے معمور ہیں مستغرق کر دیتی ہیں۔ مادی زندگی کے مظاہرات، جنگ و جدال، جھگڑے فساد، جنسی ہوس رانیاں اور مادی لذات حج و عمرہ کے مراسم میں کلی طور پر چھوڑنا پڑتی ہیں اور انسان ایک قسم کی شرعی الٰہی ریاضت میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ حالت احرام میں حرمت شکار بھی اسی مقصد کے ماتحت ہے۔

علاوہ ازیں اگر خانۂ خدا کے زائر کے لیے شکار کرنا ایک مشروع اور جائز کام ہوتا تو اس آمد و رفت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جو ہر سال اس مقدس سرزمین میں ہوتی ہے، اس علاقے کے بہت سے جانوروں کی نسل کہ جو خشکی اور پانی کی کمی کی وجہ سے پہلے ہی کم ہے، ختم ہو جاتی لہٰذا یہ حکم اس علاقے کے جانوروں کی نسل کی بقا کے لیے ایک قسم کی حفاظت و ضمانت ہے۔

خصوصاً اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ حالت احرام کے علاوہ بھی حرم میں شکار اور اسی طرح اس کے درختوں اور گھاس پھونس کا اکھاڑنا ممنوع ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ حکم زندگی کے ماحول کی حفاظت اور اس علاقے کے سبزہ زاروں اور جانوروں کو فنا و نابودی سے بچانے کے مسئلہ سے نزدیکی ربط رکھتا ہے۔

یہ حکم اس قدر دقیق تشریع ہوا ہے کہ نہ صرف جانوروں کا شکار کرنا بلکہ اس سلسلہ میں مدد کرنا، یہاں تک کہ شکاریوں کو شکار کی نشاندہی کرنا اور انہیں شکار کرنے کی راستے دینا بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اہل بیتؑ کے طریق سے وارد شدہ روایات میں ہے کہ امام صادقؑ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا:

"لا تستحلن شیئاً من الصید و انت حرام ولا و انت حلال فی الحرم ولا تدلن علیہ محلا ، ولا محرما فیصطادہ ولا تشر الیہ فیستحل من اجلک فان فیہ فداء لمن تعمدہ"

ہرگز شکار میں سے کسی چیز کو حالت احرام میں حلال شمار نہ کرنا اور اسی طرح حرم کا شکار غیر حالت احرام میں بھی حلال نہیں۔ محرم و غیر محرم کو شکار کی نشاندہی بھی نہ کرنا کہ وہ شکار کرلے (یہاں تک کہ اس کی طرف اشارہ بھی نہ کرنا اور اُسے کوئی حکم نہ دینا) کہ وہ تیری وجہ سے شکار کو حلال سمجھے کیونکہ یہ کام اس شخص کا شمار ہوگا جس نے شکار کا حکم دیا ہے یا اشارہ کیا ہے اور کفارہ بھی اسی پر واجب ہوگا۔[1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

۹۷۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

۹۸۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۹۹۔ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۷۔ خدا نے کعبہ، بیت الحرام کو لوگوں کے کام کے لیے سامان مہیا کرنے کا ایک وسیلہ قرار دیا ہے اور اس طرح حرمت والا مہینہ اور بے نشان قربانیاں اور نشاندار قربانیاں، اس قسم کے (حساب شدہ اور دقیق) احکام اس لیے ہیں کہ تمہیں معلوم ہو کہ خدا جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے، جانتا ہے۔

۹۸۔ جان لو کہ خدا شدید سزا دینے والا ہے (اور اس کے باوجود) وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

۹۹۔ پیغمبرؐ کی ذمہ داری ابلاغِ رسالت (اور احکام الٰہی پہنچانے) کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے (اور وہ تمہارے اعمال کا جوابدہ نہیں ہے) اور خدا جانتا ہے کہ تم کن چیزوں کو آشکار اور کن چیزوں کو مخفی رکھتے ہو۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں حالتِ احرام میں شکار کی حرمت کے بارے میں بحث تھی۔ اس آیت میں "مکہ" کی اہمیت اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی اصلاح و ترتیب میں اس کے اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: خدا نے بیت الحرام کو لوگوں کے امر کے قیام کا ذریعہ قرار دیا (جعل اللّٰہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس)۔

یہ مقدس گھر لوگوں کے اتحاد کی علامت، دلوں کے مجتمع ہونے کا ایک وسیلہ اور مختلف رشتوں اور گرہوں کے استحکام کے لیے ایک عظیم مرکز ہے۔ اس مقدس گھر اور اس کی مرکزیت و معنویت کے سائے میں کہ جو گہری تاریخی بنیادوں پر استوار ہے، وہ اپنی بہت سی بے سامانیوں کا سامان (اور بہت سی خرابیوں اور کمزوریوں کی اصلاح) کر سکتے ہیں اور اپنی سعادت کا محل اس کی بنیادوں

حاشیہ صفحہ سابقہ۔

۱؎ وسائل الشیعہ جلد ۵ صفحہ ۷۔

پر کھڑا کر سکتے ہیں۔ اسی لیے سورہ آلِ عمران میں خانہ کعبہ کو وہ پہلا گھر بتایا گیا ہے جو لوگوں کے فائدے کے لیے بنایا گیا ہے۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ "قیاماً للناس" کے معنی کی وسعت کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان اس گھر کی پناہ میں اور حج کے اصلاحی حکم کے سائے میں اپنے تمام معاملات کی اصلاح کر سکتے ہیں۔

چونکہ ضروری تھا کہ یہ مراسم جنگ، کشمکش اور نزاع سے ہٹ کر امن و امان کے ماحول میں صورت پذیر ہوں، حرام مہینوں (وہ مہینے کہ جن میں جنگ مطلقاً حرام ہے)[2] کے اثر کی طرف اس موضوع میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے (والشھر الحرام) نیز علاوہ ازیں اس نظر سے کہ بے نشان قربانیوں (ھدی) اور نشاندار قربانیوں (قلائد) کا وجود، کہ جو مراسم حج و عمرہ میں مشغول ہونے کے دنوں میں لوگوں کو غذا مہیا کرتا ہے اور ان کی سوچ کو اس جہت سے آسودہ خاطر کرتا ہے، اس پروگرام کی تکمیل میں مخصوص اثر رکھتا ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے (والھدی و القلائد)۔

اور چونکہ یہ تمام پروگرام، قوانین اور مقرر شدہ احکام شکار، اور اسی طرح حرم مکہ و ماہ حرام وغیرہ ایک قانون ساز کی وسعتِ علم اور تدبیر کی گہرائی کا پتہ دیتے ہیں لہٰذا آیت کے آخر میں اس طرح کہتا ہے کہ: خدا نے یہ منظم پروگرام اس لیے مقرر کیے ہیں تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اس کا علم اس قدر وسیع ہے کہ جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کو جانتا ہے، اور وہ تمام چیزوں سے خصوصاً اپنے بندوں کی روحانی اور جسمانی ضروریات سے باخبر ہے (ذلك لتعلموا ان الله یعلم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض و ان الله بكل شیء علیم)۔

ہم جو کچھ سطور بالا میں کہہ آئے ہیں اسے مدنظر رکھتے ہوئے آیت کی ابتدا اور انتہا کا باہمی تعلق واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان گہرے تشریعی احکام کو وہی ذات منظم کر سکتی ہے جو قوانین تکوینی کی گہرائی سے آگاہ اور باخبر ہو۔ جب تک کوئی زمین و آسمان کے تمام جزئیات اور روح و جسم کے تخلیقی رموز سے آگاہ نہ ہو، وہ ایسے احکام کی پیش بینی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہی قانون درست اور اصلاح کنندہ ہو سکتا ہے جو قانونِ خلقت و فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔

پھر بعد والی آیت میں گذشتہ احکام کی تاکید، لوگوں کو ان کے انجام دینے کی تشویق اور مخالفین اور نافرمانوں کی تہدید کے طور پر فرماتا ہے: جان لو کہ خدا شدید العقاب (ہونے کے ساتھ ساتھ) غفور رحیم بھی ہے (اعلموا ان الله شدید العقاب و ان الله غفور رحیم)۔

نیز یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں "شدید العقاب" کو "غفور رحیم" پر مقدم رکھا گیا ہے، تو شاید یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدائی سزا کو اس کی پوری شدت کے باوجود توبہ کے پانی سے دھویا جا سکتا ہے اور خدا کی مغفرت و رحمت شاملِ حال ہو سکتی ہے۔

پھر مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: اپنے اعمال کے جواب دہ خود تمہی ہو، اور پیغمبر کی ذمہ داری تبلیغ رسالت اور احکام خدا

---

[1] آلِ عمران - ۹۶ -

[2] حرام مہینوں کے بارے میں جلد دوم میں سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۴ کے ذیل میں بحث ہو چکی ہے۔

تم تک پہنچانے کے سوا کچھ نہیں (ما علی الرسول الا البلٰغ)۔
اس کے باوجود خدا تمہاری نیتوں سے اور تمہارے سب آشکار و پنہاں اعمال سے باخبر و آگاہ ہے (و اللہ یعلم ما تبدون و ما تکتمون)۔

کعبہ کی اہمیت

کعبہ جس کا ان آیات اور گذشتہ آیات میں دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے اصل میں مادہ "کعب" سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے پاؤں کے اُوپر کی ابھری ہوئی جگہ، بعد ازاں یہ لفظ ہر قسم کی بلندی اور اُبھری ہوئی چیز کے لیے استعمال ہونے لگا اور "مکعب" کو بھی اسی لیے "مکعب" کہا جاتا ہے کہ وہ چاروں اطراف سے ابھرا ہوا ہوتا ہے۔ اُن عورتوں کو جن کے سینے تازہ تازہ ابھر رہے ہوتے ہیں "کاعب" کہا جاتا ہے جس کی جمع "کواعب" ہے، اس کی بھی یہی وجہ ہے بہر حال یہ لفظ (کعبہ) خانۂ خدا کی ظاہری بلندی کی طرف اشارہ بھی ہے اور اس کے مقام کی عزت و بلندی کی علامت بھی ہے۔
کعبہ ایک طویل اور پُر حوادث تاریخ کا حامل ہے یہ تمام حوادث بہر حال اس کی عظمت و اہمیت ہی کے باعث ظہور پذیر ہوئے ہیں۔
کعبہ کی اہمیت اس قدر ہے کہ روایات اسلامی میں اسے خراب و ویران کرنے کو پیغمبر اور امامؑ کے قتل کرنے کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ اس کی طرف دیکھنا عبادت اور اس کے گرد طواف کرنا بہترین اعمال میں سے ہے۔ یہاں تک کہ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

(لاینبغی لاحد ان یرفع بنائہ فوق الکعبۃ)

مناسب نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنا گھر کعبہ سے اُونچا بنائے۔[1]

لیکن اس طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ کعبہ کی اہمیت اور احترام قطعاً اس کی عمارت کی وجہ سے نہیں ہے، کیونکہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں حضرت امیر المومنینؑ کے ارشاد کے مطابق:

خدا نے اپنے گھر کو ایک خشک جلی ہوئی اور سخت پہاڑوں کے درمیان والی زمین میں قرار دیا ہے اور حکم دیا ہے کہ اسے بہت ہی سادہ مصالحہ سے بنایا جائے، عام اور معمولی پتھر سے۔[2]

لیکن چونکہ خانۂ کعبہ ایک قدیم ترین اور بہت ہی سابق ترین توحید اور خدا پرستی کا مرکز ہے اور مختلف ملل و اقوام کی توجہ کی مرکزیت کا نقطہ ہے لہٰذا اسے درگاہِ خداوندی سے ایسی اہمیت میسّر آئی ہے۔

۱۰۰۔ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ صفحہ ۴۸۲۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)۔

اللّٰہَ یٰاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ع

ترجمہ

۱۰۰۔ کہہ دو کہ پاک و ناپاک (کبھی) برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاکوں کی کثرت تجھے بھلی معلوم ہو، خدا (کی مخالفت) سے پرہیز کرو، اے صاحبانِ عقل و خرد! تاکہ تم فلاح و نجات حاصل کر سکو۔

تفسیر

اکثریت پاکیزگی کی دلیل نہیں

گذشتہ آیات میں مشروبات الکحل، قمار بازی، انصاب و ازلام اور حالتِ احرام میں شکار کرنے کی حرمت کے سلسلے میں گفتگو تھی، چونکہ ہو سکتا ہے بعض لوگ ایسے گناہوں کے ارتکاب کے لیے کچھ معاشروں اور علاقوں میں اکثریت کے عمل کو دستاویز قرار دیں اور اس بہانے سے کہ مثلاً فلاں شہر کی اکثریت شراب پیتی ہے یا قمار بازی کرتی ہے یا یہ کہ لوگوں کی اکثریت فلاں قسم کے حالات میں حرمتِ شکار وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتی لہٰذا وہ ان احکام پر عمل درآمد سے روگردانی کریں اور انہیں طاق نسیاں کر دیں تو اس بنا پر کہ یہ بہانہ اس مقام پر اور اس قسم کے افراد سے دیگر مواقع میں کلی طور پر چھین لیا جائے، خدا ایک بنیادی کلیہ قاعدہ مختصر سی عبارت میں بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے پیغمبر! پاک و ناپاک کبھی برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ ناپاک لوگوں کی زیادتی اور آلودہ لوگوں کی کثرت تجھے تعجب میں ڈال دے اور بھلی معلوم ہو (قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبک کثرۃ الخبیث)۔

اس بنا پر درج بالا آیت میں خبیث و طیب ہر قسم کے پاک و ناپاک وجود کے معنی میں ہے چاہے وہ پاک و ناپاک کھانے کی چیزیں ہوں یا پاک و ناپاک افکار و نظریات ہوں۔

آیت کے آخر میں صاحبانِ فکر و نظر اور اربابِ عقل و ہوش کو مخاطب کرتے ہوئے تاکید کرتا ہے کہ خدا سے ڈرو تاکہ کامران و کامیاب ہو جاؤ (فاتقوا اللّٰہ یا اولی الالباب لعلکم تفلحون)۔

لیکن یہ جو آیت میں ایک واضح چیز کی توضیح کی گئی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کوئی یہ خیال کرے کہ کچھ عوارض مثلاً پلید و ناپاک کے طرفداروں کی زیادتی جسے اصطلاح میں "اکثریت" کہتے ہیں اس چیز کی باعث بنے کہ ناپاک چیز پاک کی ہم پلہ قرار پا جائے۔ جیسا کہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض اوقات کچھ لوگ انبوہ کثیر اور اکثریت کے میلانات کے زیر اثر آ جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اگر اکثریت کسی مطلب کی طرف مائل ہو جائے تو یہ اس مطلب کے بے چون و چرا درست ہونے کی قطعی نشانی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ایسے مواقع بہت سے ہو گزرے ہیں جن میں معاشروں کی اکثریت واضح اشتباہات اور غلطیوں میں گرفتار ہوئی ہے اور مواقع اور حقیقت میں جو چیز اچھی چیز کی بری چیز سے (اور خبیث کی طیب سے) پہچان کے لیے لازمی ہے "وہ اکثریت کیفی" ہے نہ کہ "اکثریت کمی"، یعنی قوی تر، والا تر اور اعلیٰ ترین افکار اور توانا تر اور پاک ترین نظریات کی ضرورت ہے، نہ کہ طرفداروں کی کثرت

یہ مسئلہ شاید اس زمانہ کے بعض لوگوں کے ذوق کے مطابق نہ ہو کیونکہ تلقین و تبلیغ کے ذریعے بہت کوشش کی گئی ہے کہ لوگ اکثریت کے رجحانات و میلانات کو نیک و بد کے پرکھنے کی ترازو کے طور پر قبول کرلیں۔ یہاں تک کہ ان لوگوں نے یہ باور کرلیا ہے کہ "حق" وہ چیز ہے جس کو اکثریت پسند کرتی ہو اور اچھی چیز وہ ہے جس کی طرف اکثریت مائل ہو۔ حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے۔ دنیا کے بہت سے مصائب و آلام اسی طرزِ فکر کی وجہ سے ہیں۔ ہاں اگر اکثریت صحیح رہبری اور درست تعلیمات سے بہرہ مند ہو جائے اور اصطلاحی طور پر عام معنی کے لحاظ سے ایک رشید اکثریت ہو تو پھر ممکن ہے کہ اس کے میلانات نیک و بد کی پہچان کا مقیاس و میزان بن سکیں، نہ کہ وہ اکثریتیں جن کی رہنمائی نہیں ہوئی اور جو غیر رشید ہیں۔

بہرحال قرآن محل بحث آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: کبھی تمہیں بُروں اور ناپاک چیزوں کی زیادتی تعجب میں نہ ڈالے۔ دیگر مقامات پر بھی متعدد مرتبہ فرمایا ہے:

"ولکن اکثر الناس لا یعلمون"

اکثر لوگوں کے کام علم و دانش کے ماتحت نہیں ہوتے۔

ضمنی طور پر توجہ کرنا چاہیے کہ اگر آیت میں لفظ "خبیث" "طیب" پر مقدم رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ محل بحث آیت میں روئے سخن، ان لوگوں کی طرف ہے جو خبیث کی زیادتی کو اس کی اہمیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ انہیں جواب دیا جائے، اس لیے قرآن ان کے گوش گزار کرتا ہے کہ نیکی و بدی اور اچھائی و برائی کا معیار کسی بھی موقع پر کثرت و قلت اور اکثریت و اقلیت نہیں ہے، بلکہ ہر جگہ اور ہر وقت "پاکی" "ناپاکی" سے بہتر ہے اور صاحبانِ عقل و فکر کبھی کثرت سے دھوکا نہیں کھاتے۔ وہ ہمیشہ پلیدی سے دوری اختیار کرتے ہیں اگرچہ ان کے ماحول کے تمام افراد آلودہ ہوں۔ وہ پاکیزگیوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں اگرچہ ان کے معاشرے کے تمام افراد اس کے خلاف ہوں۔

۱۰۱۔ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَسْـَٔلُوا۟ عَنْ أَشْيَآءَ إِن تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِن تَسْـَٔلُوا۟ عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ ٱلْقُرْءَانُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهَا وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○

۱۰۲۔ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا۟ بِهَا كَٰفِرِينَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ اے ایمان والو! تم ایسے مسائل کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تمہارے سامنے واضح ہو جائیں تو تمہیں بُرے لگیں اور اگر قرآن کے نزول کے وقت ان کے متعلق سوال کرو تو وہ تمہارے لیے آشکار ہو جائیں گے، خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے (اور ان سے صرفِ نظر کرلیا ہے) اور خدا بخشنے والا اور حلیم ہے۔

۱۰۲۔ تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں سے ایک گروہ نے ان چیزوں کے متعلق سوال کیا تھا اور پھر ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے تھے (ہو سکتا ہے کہ تم بھی ایسے ہی ہو جاؤ)۔

شانِ نزول

اُوپر والی آیت کے شانِ نزول کے سلسلے میں کتبِ حدیث و تفسیر میں مختلف اقوال نظر آتے ہیں لیکن جو اُوپر والی آیات اور اُن کی تعبیرات کے ساتھ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے وہ، وہ شانِ نزول ہے جو تفسیر مجمع البیان میں علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے منقول ہے۔ اور وہ یہ ہے:

ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور حج کے بارے میں خدا کا حکم بیان کیا تو ایک شخص جس کا نام "عکاشہ" تھا (اور ایک روایت کے مطابق "سراقہ") نے کہا کیا یہ حکم ہر سال کے لیے ہے اور ہر سال ہمیں حج بجالانا ہو گا پیغمبرؐ نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا، لیکن اس نے اصرار کیا اور دو مرتبہ یا تین مرتبہ اپنے سوال کا تکرار کیا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: وائے ہو تم پر، کیوں اس قدر اصرار کر رہے ہو، اگر تمہارے جواب میں میں ہاں کہہ دوں تو ہر سال تم پر حج واجب ہو جائے گا اور اگر ہر سال واجب ہو گیا تو اس کی انجام دہی کی تم میں طاقت نہیں ہو گی اور اگر اس کی مخالفت کی تو گنہگار ہو گے، لہٰذا جب تک میں تم سے کوئی چیز بیان نہ کروں تم اس پر اصرار نہ کیا کرو کیونکہ (ایک چیز) اُن امور میں سے جو (بعض) گذشتہ اقوام کی ہلاکت کا سبب بنی یہ تھی کہ وہ ہٹ دھرمی کرتے تھے اور بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے تھے، اور اپنے پیغمبر سے زیادہ سوال کرتے تھے، اس بنا پر جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی توانائی کے مطابق اُسے انجام دو۔

"اذا امرتکم من شیء فأتوا منہ ما استطعتم"

اور جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو اجتناب کیا کرو، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انہیں اس کام سے روکا گیا [1]

کہیں اس سے اشتباہ نہ ہو کہ اس شانِ نزول سے مراد — جیسا کہ ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے — یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے لیے راہ پرسش و سوال اور مطالب علمی سمجھنا بند کر دیا جائے، کیونکہ قرآن تو خود اپنی آیات میں صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے اس کا اہلِ علم سے سوال کریں۔

"فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" [2]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر درمنثور" اور "المنار" میں محلِ بحث آیت کے ذیل میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہ شانِ نزول نقل کی گئی ہے۔

[2] نحل ـ ۴۳

بلکہ اس سے مراد بے جا سوال، بہانہ سازیاں اور ہٹ دھرمیاں ہیں۔ یہ طریقۂ کار زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں کی خرابی، گفتگو کرنے والے کی مزاحمت اور اس کے سلسلۂ گفتگو اور پروگرام کی پراگندگی کا سبب بنتا ہے۔

تفسیر

غیر مناسب سوالات

اس میں شک نہیں کہ سوال کرنا حقائق کو سمجھنے کی کلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کم پوچھتے ہیں کم جانتے ہیں۔ آیات و روایاتِ اسلامی میں بھی مسلمانوں کو تاکیدی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ وہ نہیں جانتے پوچھیں، لیکن چونکہ ہر قانون کا کوئی نہ کوئی استثنائی پہلو ہوتا ہے لہٰذا تعلیم و تربیت کی یہ بنیاد بھی استثنا سے خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات کچھ مسائل کا مخفی رہنا اجتماعی نظام کی حفاظت اور لوگوں کی مصلحتوں کے پیش نظر بہتر ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر واقعیت اور حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے کے لیے جستجو کرنا اور پے در پے سوال کرنا نہ صرف یہ کہ فضیلت نہیں رکھتا، بلکہ مذموم و ناپسندیدہ بھی ہے۔ مثلاً زیادہ تر ڈاکٹر اسی میں مصلحت جانتے ہیں کہ سخت اور وحشت ناک بیماریوں کو بیمار سے مخفی رکھیں۔ بعض اوقات صرف ساتھ والے لوگوں کو اصل ماجرا کی خبر دیتے ہیں، اس شرط کے ساتھ کہ بیمار سے چھپائے رکھیں، کیونکہ تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ بہت سے لوگ اگر اپنی بیماری کے گہرے پن سے باخبر ہو جائیں تو وحشت و سرگردانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ وحشت انہیں مار نہ ڈالے تو کم از کم بیماری سے صحت یابی میں تاخیر کا سبب ضرور بن جاتی ہے۔

لہٰذا ایسے مواقع پر بیمار کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے ہمدرد طبیب کے سامنے سوال و اصرار کرنے لگے کیونکہ اس کا بار بار اصرار بعض اوقات طبیب پر میدان کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے کہ وہ اپنی آسودگی اور دوسرے بیماروں کی خبرگیری کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں دیکھتا کہ اس "ہٹ دھرم" بیمار کے لیے حقیقت واضح کر دے، اگرچہ اسے اس سے بہت نقصانات اٹھانا پڑیں۔

اسی طرح لوگ اپنے ساتھیوں کے بارے میں خوش گمانی کے محتاج ہیں اور اس عظیم سرمایے کی حفاظت کے لیے بہتر یہی ہے کہ ایک دوسرے کے حالات کی تمام تفصیلات سے باخبر نہ ہوں، کیونکہ آخرکار ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے، اور تمام کمزوریوں کا فاش ہو جانا، لوگوں کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنے میں مشکلات پیدا کر دے گا۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ ایک فرد جو موثر شخصیت کا مالک ہے، اتفاق سے کسی پست اور نچلے خاندان میں پیدا ہوا ہے اب اگر اس کا سابقہ حال فاش ہو جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کے وجود کی تاثیر معاشرے میں متزلزل ہو جائے۔ اس لیے اس قسم کے مواقع پر لوگوں کو کسی طرح بھی اصرار نہیں کرنا چاہیے اور کسی جستجو میں نہیں پڑنا چاہیے۔

یا یہ کہ مبارزات اجتماعی کے بہت سے منصوبے ایسے ہوتے ہیں جنہیں عملی شکل دینے تک پوشیدہ رہنا چاہیے اور ان کے افشا پر اصرار کرنا معاشرے کی کامیابی پر منفی طور پر اثر انداز ہوگا۔

یہ اور ان جیسے کئی ایک مواقع ایسے ہیں جن میں سوال کرنا صحیح نہیں ہے اور رہبر اور قائدین کو جب تک وہ بہت زیادہ دباؤ اور فشار میں نہ ہوں ان کا جواب نہیں دینا چاہیے۔

قرآن زیر نظر آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! ایسے امور کے افشا کے متعلق سوال نہ کرو کہ جو موجب رنج و تکلیف ہوں (یاایہا الذین اٰمنوا لا تسئلوا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤکم)۔

لیکن اس سبب سے کہ بعض افراد کی طرف سے پے در پے سوالات کا ہونا اور ان کا جواب نہ دینا ممکن ہے دوسروں کے لیے شک و شبہ کا باعث بن جائے اور بہت سے مفاسد پیدا کر دے تو مزید کہتا ہے: اگر ایسے مواقع پر زیادہ اصرار کرو گے تو آیاتِ قرآن کے ذریعے تمہارے لیے افشا ہو جائیں گے اور تم زحمت و تکلیف میں پڑ جاؤ گے (وان تسئلوا عنہا حین ینزل القراٰن تبد لکم)۔

یہ جو ان کے افشا کرنے کو نزول قرآن کے زمانے کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سوالات ایسے مسائل سے مربوط تھے جنہیں وحی کے ذریعے ہی واضح اور روشن ہونا تھا۔

مزید ارشاد ہوتا ہے، یہ خیال نہ کرو کہ اگر خدا کچھ مسائل بیان کرنے سے سکوت اختیار کرتا ہے تو وہ اُن سے غافل تھا بلکہ وہ تمہارے لیے وسعت چاہتا ہے اور انہیں معاف کر دیا ہے اور خدا بخشنے والا علیم و بردبار ہے (عفا اللہ عنہا واللہ غفور حلیم)۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ان اللہ افترض علیکم فرائض فلا تضیعوھا وحد لکم حدوداً فلا تعتدوھا ونہی عن اشیاء فلا تنتہکوھا وسکت لکم عن اشیاء ولم یدعہا نسیاناً فلا تتکلفوھا"

خدا نے کچھ واجبات تمہارے لیے مقرر کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو اور کچھ حدود تمہارے لیے نافذ کی ہیں اُن سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے اُن کی پردہ دری نہ کرو اور کچھ امور سے خاموش رہا ہے اور ان کے پوشیدہ رکھنے کو اس نے بہتر سمجھا ہے اور یہ پوشیدہ رکھنا نسیان اور بھول چوک کی وجہ سے ہرگز نہیں تھا۔ ایسے امور کے افشاء اور ظاہر کرنے پر اصرار نہ کرنا[1]

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے کہا جائے کہ اگر ان امور کا افشا کرنا لوگوں کی مصلحت کے خلاف ہے تو پھر اصرار کی صورت میں اُسے کیوں افشاء کیا جاتا ہے؟

اس کی دلیل وہی ہے جس کی طرف اُوپر اشارہ ہو چکا ہے کہ بعض اوقات اگر پے در پے سوالات کے مقابلے میں سکوت اور خاموشی اختیار کر لی جائے تو اُس سے کئی دوسرے مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں، بدگمانیاں سر اٹھا لیتی ہیں، اور لوگوں کے اذہان خراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اگر طبیب بیمار کے پے در پے سوالات کے جواب میں سکوت اختیار کرے تو

---

[1] مجمع البیان آیہ محل بحث کے ذیل میں۔

بعض اوقات ہو سکتا ہے یہ امر بیمار کو طبیب کے بارے میں بیماری کی اصل تشخیص کے سلسلے میں شک میں ڈال دے اور وہ یہ خیال کرے کہ اصولی طور پر اس کی بیماری کی شناخت نہیں ہو سکی۔ لہٰذا وہ طبیب کی ہدایات پر عمل نہ کرے تو اس صورت میں طبیب کے پاس بیماری کے انتشار کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اگر یہ بیمار اس طریقے سے کئی ایک مشکلات اور دشواریاں پیدا کرے گا۔

بعد والی آیت میں اس آیت کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: گذشتہ اقوام میں سے بھی بعض لوگ اسی قسم کے سوالات کیا کرتے تھے اور جب انہیں جواب دیا گیا تو مخالفت اور نافرمانی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (قد سألھا قوم من قبلکم ثم اصبحوا بھا کٰفرین)۔

اس سلسلے میں کہ یہ اشارہ گذشتہ اقوام میں سے کس قوم سے مربوط ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا تو یہ خیال ہے کہ اس کا تعلق حضرت عیسٰیؑ کے اپنے شاگردوں کے ذریعہ مائدۂ آسمانی کی درخواست سے مربوط ہے کہ جس کے صورت پذیر ہو جانے کے بعد بعض مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس کا ربط حضرت صالحؑ سے معجزہ طلب کرنے کے ساتھ ہے لیکن ظاہراً یہ تمام احتمالات صحیح نہیں ہیں کیونکہ آیت ایسے سوال کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے جس کا معنی "پوچھنا" اور کشف مجہول کرنا ہے نہ کہ وہ سوال جس کا معنی تقاضا کرنا اور کسی چیز کی درخواست کرنا ہے۔ گویا لفظ "سوال" کا دونوں معنی میں استعمال ہونا اس قسم کے اشتباہ کا سبب بنا ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ جماعت بنی اسرائیل مراد ہو کہ جب وہ ایک جرم (قتل) کی تحقیق کے سلسلے میں ایک گائے کے ذبح کرنے پر مامور ہوئے تھے (جس کی توضیح جلد اول میں گزر چکی ہے) تو انہوں نے موسٰیؑ سے ٹیڑھے سوال کیے اور گائے کی جزئیات کے بارے میں ایسے پے در پے سوالات کیے جن کے بارے میں کوئی خاص حکم انہیں نہیں دیا گیا تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے کام اپنے اوپر اتنا سخت کر لیا تھا کہ ایسی گائے کا ہاتھ آنا اس قدر مشکل اور قیمتی ہو گیا کہ قریب تھا کہ اس سے صرف نظر کر لیں۔

"واصبحوا بھا کٰفرین" — اس جملے کے بارے میں دو احتمال پائے جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ "کفر" سے مراد نافرمانی اور مخالفت ہو جیسا کہ اوپر اشارہ کر چکے ہیں اور دوسرا یہ کہ کفر اپنے مشہور معنیٰ میں ہو، کیونکہ بعض اوقات ایسے تکلیف دہ جوابات سُننا جو سننے والے کے ذہن پر بوجھ ہوں اس بات کا سبب بنتے ہیں کہ وہ اصل موضوع اور کہنے والے کی صلاحیت کا ہی انکار کرنے پر آمادہ ہو جائے، مثلاً یہ کہ بعض اوقات طبیب کی طرف سے ایک تکلیف دہ جواب کا سننا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ بیمار اپنی طرف سے مخالفت کا اظہار کرے اور اس کی صلاحیت کا ہی انکار کر دے اور اس تشخیص کو بڑھاپے کا نتیجہ قرار دے یا یہ کہے کہ طبیب مخبوط الحواس ہے۔

اس بحث کے آخر میں ہم یہ نکتہ پھر دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ زیر بحث آیات کسی صورت میں بھی منطقی، علمی، تہذیبی اور تربیتی سوالات کی راہ لوگوں پر بند نہیں کرتیں بلکہ یہ پابندی منحصر طور پر صرف بے جا اور نامناسب سوالات اور ایسے امور کے متعلق جستجو سے مربوط ہے جس کے پوچھنے کی نہ صرف یہ کہ ضرورت و احتیاج نہیں ہے بلکہ ان کا چھپا رہنا ہی بہتر بلکہ بعض اوقات تو لازمی اور ضروری ہوتا ہے۔

۱۰۳۔ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝

۱۰۴۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۰۳۔ خدا نے کوئی "بحیرہ"، "سائبہ"، "وصیلہ"، "حام" قرار نہیں دیا[۱] لیکن جو لوگ کافر ہو گئے انہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا اور ان میں سے زیادہ تر سمجھتے نہیں ہیں۔

۱۰۴۔ اور جس وقت ان سے کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ۔ تو وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے پایا ہے وہ ہمارے لیے کافی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کچھ نہیں جانتے تھے اور انہوں نے ہدایت حاصل نہیں کی تھی۔

تفسیر

آیت میں پہلے تو چار غیر مناسب "بدعات" کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جو زمانہ جاہلیت کے عربوں میں موجود تھیں انہوں نے کچھ جانوروں کے بارے میں کسی جہت سے علامت اور نشانی مقرر کر رکھی تھی اور ان کا گوشت کھانا ممنوع قرار دے رکھا تھا یہاں تک کہ ان کا دودھ کا پینا، اون کاٹنا اور ان پر سواری کرنا جائز شمار نہیں کرتے تھے۔ بعض اوقات ان جانوروں کو آزاد چھوڑ دیتے تھے کہ جہاں چاہیں چلے جائیں اور کوئی شخص ان سے متعرض نہ ہوتا۔ یعنی عملی طور پر اس جانور کو بے کار اور فضول چھوڑ دیتے تھے۔

---

[۱] یہ چار قسم کے گھریلو جانوروں کی طرف اشارہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ان سے استفادہ ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ اسلام نے اس بدعت کا خاتمہ کر دیا۔

لہٰذا قرآن مجید کہتا ہے : خدا ان احکام میں سے کسی کو بھی قانونی طور پر قبول نہیں کرتا نہ اس نے بحیرہ قرار دیا نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام (ما جعل اللّٰہ من بحیرۃ ولا سائبۃ ولا وصیلۃ ولا حام)۔

باقی رہی ان چار قسم کے جانوروں کی تشریح اور وضاحت تو وہ یہ ہے :

۱۔ بحیرہ : اس جانور کو کہتے ہیں کہ جس نے پانچ مرتبہ بچہ جنا ہو کہ جن میں سے پانچواں بچہ مادہ یا ایک روایت کے مطابق نر ہو، ایسے جانور کے کان میں ایک وسیع سوراخ کر دیتے تھے اور اُسے اس کے حال پر آزاد چھوڑ دیتے تھے اور اسے ذبح یا قتل نہیں کرتے تھے۔

"بحیرہ" بحر کے مادہ سے وسعت اور پھیلاؤ کے معنی میں ہے۔ عرب سمندر کو بحر اس کی وسعت کی بنا پر ہی کہتے ہیں اور بحیرہ کو جو اس نام سے پکارتے تھے تو یہ اس وسیع شگاف کی وجہ سے تھا جو اُس کے کان میں وہ کر دیتے تھے۔

۲۔ سائبہ وہ اونٹنی جس نے بارہ یا ایک روایت کے مطابق دس بچے جنے ہوں اُسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کوئی اس پر سوار نہیں ہوتا تھا اور وہ جس چراگاہ میں جاتی آزاد تھی اور جس گھاٹ اور چشمے سے چاہتی پانی پیتی۔ کوئی اس سے مزاحمت کا حق نہیں رکھتا تھا۔ کبھی کبھار صرف اس کا دودھ دوہ لیتے اور مہمان کو پلاتے (سائبہ سیب کے مادہ سے، پانی جاری ہونے، اور چلنے میں آزادی کے معنی میں ہے)۔

۳۔ وصیلہ اس گوسفند کو کہتے تھے جس نے سات دفعہ بچہ جنا ہو اور ایک روایت کے مطابق اس گوسفند کو کہتے تھے جو دو بچے کو ایک ہی مرتبہ جنم دے (وصیلہ وصل کے مادہ سے۔ ہے جس کا معنی ہے باہم پیوستگی) ایسے جانور کو قتل کرنا بھی حرام سمجھتے تھے۔

۴۔ حام: "مادہ حمایت" کا اسم فاعل ہے، جو حمایت کرنے والے کے معنی میں ہے۔ حام اُس نر جانور کو کہتے ہیں جس سے مادہ جانوروں کی تلقیح اور جفتی میں استفادہ کیا جاتا ہے۔ جب عرب دس مرتبہ اس جانور سے جفتی میں استفادہ کر لیتے اور ہر دفعہ اس کے نطفہ سے بچہ پیدا ہو جاتا تو کہتے کہ اس جانور نے اپنی پشت کی حمایت کی ہے یعنی اب کوئی شخص اس پر سوار ہونے کا حق نہیں رکھتا (ایک معنی اس کا "حمی" ، نگہداری، رکاوٹ اور ممنوعیت بھی ہے)۔

اُوپر والے چار عناوین کے معنی میں مفسّرین کے درمیان اور احادیث کے اندر دوسرے احتمال بھی نظر آتے ہیں لیکن سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ مراد ایسے جانور تھے جنہوں نے حقیقت میں اپنے مالکوں کی زیادہ بار بار نتیجہ بخش طور پر خدمت کی ہو، وہ بھی ان کی اس خدمت کے صلے میں ان جانوروں کے لیے ایک قسم کے احترام اور آزادی کے قائل ہو جاتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ ان تمام مواقع پر جانوروں کی خدمات کے بدلے میں شکر گزاری اور قدر دانی کی روح کارفرما نظر آتی ہے اور اس لحاظ سے ان کا عمل قابلِ احترام تھا چونکہ ان جانوروں کے بارے میں ان سے استفادہ نہ کرنا ایک ایسا احترام تھا جس کا کوئی مفہوم نہ تھا علاوہ ازیں ایک قسم کا مال کا اتلاف، نعمات الٰہی کا ضیاع اور انہیں معطل کرنا بھی شمار ہوتا تھا سب چیزوں کو چھوڑتے ہوئے یہ جانور اس احترام کی وجہ سے جانکاہ تکالیف اور مصائب میں گرفتار ہو جاتے تھے کیونکہ عملی طور پر بہت کم افراد اس کے لیے تیار ہوتے تھے کہ انہیں صحیح غذا مہیا کریں اور ان کی حفاظت اور نگہداری کریں اور اگر اس چیز کو مدنظر رکھا جائے کہ یہ جانور بہت زیادہ سن کے ہوتے تھے تو مزید اندازہ ہوگا کہ وہ تکلیف دہ حالت میں بے پناہ محرومیوں میں زندگی بسر

کرتے تھے یہاں تک کہ مر جاتے انہی وجوہ کی بناء پر اسلام نے سختی سے ان امور سے منع کیا۔

ان سب باتوں کو چھوڑتے ہوئے کئی ایک روایات اور تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ ان سب چیزوں کو یا ان میں سے بعض کو بتوں کے لیے انجام دیتے تھے اور درحقیقت انہیں بت کی نذر کرتے تھے۔ لہٰذا اس صورت میں اسلام کا اس کام سے مبارزہ بت پرستی سے مقابلہ بھی تھا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض روایات کے مطابق جب اُن میں سے بعض جانور طبعی موت مرجاتے تو بعض اوقات اُن کے گوشت سے گویا بطور تبرک و تیمن استفادہ کرتے جو بذاتِ خود ایک قبیح فعل تھا۔[1]

اس کے بعد فرماتا ہے: کافر لوگ اور بت پرست ان چیزوں کی خدا کی طرف نسبت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ قانونِ الٰہی ہے (ولکن الذین کفروا یفترون علی اللہ الکذب) اُن میں سے اکثر اس بارے میں تھوڑا سا بھی غور و فکر نہیں کرتے تھے اور اپنی عقل کو کام میں نہیں لاتے تھے، بلکہ دوسروں کی اندھی تقلید کرتے تھے (واکثرھم لا یعقلون)۔

بعد والی آیت میں ان کی بے تکی اور غیر مناسب تحریکوں کی دلیل و منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جب اُن سے یہ کہا جائے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کی طرف اور پیغمبر کی طرف آؤ، تو وہ اس کام سے روگردانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے لیے تو ہمارے بڑوں کے رسم و رواج اور ان کے طور طریقے اور دستور کافی ہیں (و اذا قیل لھم تعالوا الی ما انزل اللہ و الی الرسول قالوا حسبنا ما وجدنا علیہ اٰباءنا)۔

حقیقت میں انکی غلط کاریاں اور بُت پرستیاں ایک دوسری قسم کی بت پرستی سے پھوٹتی تھیں۔ وہ اپنے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں کے بے ہودہ رسم و رواج اور طور طریقوں کو بلا قید و شرط اختیار کرتے تھے۔ گویا وہ صرف "بڑوں" اور "آباؤ اجداد" سے نسبت کو اپنے عقیدہ اور عادات و رسوم کی صحت و درستی کے لیے کافی سمجھتے تھے۔

قرآن صراحت سے انہیں جواب دیتا ہے: کیا ایسا نہیں کہ اُن کے آباؤ اجداد صاحب علم و دانش نہیں تھے اور انہیں ہدایت حاصل نہیں ہوئی تھی (اولو کان اٰباءھم لا یعلمون شیئًا و لا یھتدون)۔

یعنی اگر تمہارے وہ بڑے بوڑھے اور بزرگ جن پر تم اپنے عقیدہ اور اعمال کے لیے تکیہ کیے ہوئے ہو، ارباب علم و دانش اور ہدایت یافتہ ہوتے تو تمہارا ان کی پیروی کرنا جاہل کا عالم کی تقلید کرنے کے زمرے میں شمار ہوتا، لیکن اس صورت میں جبکہ تم خود بھی جانتے ہو کہ وہ کوئی چیز تم سے زیادہ نہیں جانتے تھے بلکہ شاید تم سے بھی پیچھے تھے تو اس حالت میں تو تمہارا معاملہ جاہل کا جاہل کی تقلید کرنے کا واضح مصداق ہے، جو کہ عقل و خرد کے ترازو میں بہت ہی ناپسندیدہ فعل ہے۔

چونکہ اُوپر والے جملے میں قرآن نے لفظ "اکثر" استعمال کیا ہے اس لیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس جہالت و تاریکی کے ماحول میں بھی ایک سمجھدار اقلیت اگرچہ وہ کمزور تھی، موجود تھی، جو ایسے اعمال کو حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۸۶۔

اپنے بزرگوں اور بڑوں کے نام کا بت

منجملہ اُن امور کے جو زمانہ جاہلیت میں بڑی شدت کے ساتھ رائج تھے ایک اپنے بزرگوں اور بڑوں پر فخر کرنا اور پرستش کی حد تک بلاقید و شرط ان کی شخصیات، افکار، عادات اور رسوم کا احترام کرنا تھا۔ قرآن نے بھی اس امر کا مختلف آیات میں ذکر کیا ہے۔ نیز یہ امر زمانہ جاہلیت سے مخصوص نہیں تھا بلکہ آج بھی بہت سی اقوام و ملل میں موجود ہے اور شاید یہ ایک نسل سے دوسری نسل کی طرف خرافات اور بے ہودہ چیزیں پھیلنے اور منتقل ہونے کے اصلی عوامل میں سے ایک ہے۔ گویا "موت" گزرے ہوئے لوگوں کے لیے ایک قسم کی معصومیت اور تقدس پیدا کر دیتی ہے اور انہیں احترام و تقویٰ کے حالے میں لے لیتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قدردانی کی روح اور اصول انسانی کے احترام کا تقاضا یہی ہے کہ آباؤ اجداد اور اپنے بزرگوں کو محترم سمجھا جائے لیکن اس معنی میں نہیں کہ انہیں معصوم عن الخطاء جان لیا جائے اور ان کے افکار و آداب پر تنقید، تحقیق اور تجسس چھوڑ ہی دیا جائے اور ان کی بے ہودہ باتوں کی بھی اندھی پیروی اور تقلید اختیار کر لی جائے۔

یہ عمل حقیقت میں ایک قسم کی بت پرستی اور جاہلانہ منطق ہے، بلکہ ضروری یہ ہے کہ ان کے حقوق اور مفید افکار و سنن کے احترام کے باوجود، ان کے غلط مراسم اور طور طریقوں کو سختی سے کچلا جائے۔ خاص طور پر جبکہ آئندہ نسلیں زمانہ گزرنے کے ساتھ علم و دانش کی ترقی اور زیادہ تجربات کی بناء پر عام طور سے گذشتہ نسلوں کی نسبت زیادہ دانا اور ہوشمند ہیں اور کوئی عقل و خرد گذشتہ لوگوں کی اندھی تقلید کی اجازت نہیں دیتی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض علماء یہاں تک کہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اس کمزور منطق سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور بعض اوقات بڑے ہی حیرت انگیز طریقے سے مضحکہ خیز خرافات کو عملاً قبول کر لیتے ہیں مثلاً بعض اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں سال کے آخر میں آگ کے اوپر سے کودتے ہیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اپنے بڑوں کی آتش پرستی کو زندہ رکھ سکیں اور درحقیقت ان کی یہ منطق زمانۂ جاہلیت کے بدوؤں کی سی منطق کے سوا اور کچھ نہیں۔

بے دلیل تضاد

تفسیر المیزان میں تفسیر درمنثور سے اہلِ سنت کے علماء کے ایک گروہ سے منقول ہے کہ ابوالاحوص نامی ایک شخص سے مروی ہے، وہ کہتا ہے:

> میں پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے پرانا اور بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس مال و دولت ہے؟ میں نے کہا جی ہاں! پیغمبرؐ نے فرمایا: کس قسم کا مال ہے؟ میں نے کہا: ہر قسم کا مال میرے پاس موجود ہے! اونٹ، گوسفند، گھوڑے وغیرہ۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: جب خدا تجھے کوئی چیز دے تو ضروری ہے کہ اس کے آثار بھی تم میں دکھائی دیں (نہ یہ کہ اپنی ثروت کو ایک طرف رکھ دو اور غریبوں

مسکینوں کی طرح زندگی بسر کرو)۔

اس کے بعد فرمایا: کیا تمہارے اونٹوں کے بچے پھٹے ہوئے کانوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں یا سالم کانوں کے ساتھ، میں نے کہا: یقیناً صحیح سالم کانوں کے ساتھ، کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اونٹنی کٹے ہوئے کان والا بچہ جنے؟ تو آپ نے فرمایا: پھر تو لازماً خود تم ہی تلوار ہاتھ میں لے کر ان میں سے بعض کے کانوں کو چیرتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ "بحر" ہے اور کچھ دوسروں کے کانوں کو کاٹ کر کہتے ہو کہ یہ "صرم" ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں ایسا ہی کرتا ہوں فرمایا: ہرگز ایسا کام نہ کرو، جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے، وہ تیرے لیے حلال ہے، اس کے بعد آپ نے (اس آیت کی) تلاوت کی: (ما جعل من بحیرۃ و لا سائبۃ و لا وصیلۃ و لا حام) (المیزان جلد ۶ صفحہ ۱۷۰)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال کے ایک حصے کو معطل اور بے مصرف چھوڑ دیتے تھے اور کنجوسی کر کے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے۔ دراصل یہ ایک بے دلیل تضاد تھا۔

۱۰۵۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا یَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۰۵۔ اے ایمان والو! اپنے اوپر نظر رکھو، جب تمہیں ہدایت حاصل ہو جائے تو ان لوگوں کی گمراہی جو گمراہ ہو چکے ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی، تمام چیزوں کی بازگشت خدا کی طرف ہے اور وہ تمہیں اس عمل سے جو تم کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا۔

تفسیر

ہر شخص اپنے کام کا جواب دہ ہے

گذشتہ آیت میں زمانہ جاہلیت کے لوگوں کی اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کے متعلق گفتگو تھی۔ قرآن نے واضح طور پر انہیں ڈرایا کہ اس قسم کی تقلید عقل ومنطق کی رو سے درست نہیں ہے۔ اس کے بعد فطری طور پر یہ سوال ان کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر ہم ایسے مسائل میں اپنا معاملہ اپنے بزرگوں سے الگ کر لیں تو پھر ان کی سرنوشت کیا ہوگی، علاوہ ازیں اگر ہم اس قسم کی تقلید سے دست بردار ہو جائیں تو ایسی ہی تقلید کرنے والے دیگر بہت سوں کے بارے میں کیا صورت ہوگی۔ زیر نظر آیت اس قسم کے سوالات کے جواب میں کہتی ہے: اے ایمان لانے والو! تم اپنے ہی جوابدہ ہو، اگر تم ہدایت یافتہ ہو گئے تو دوسروں کی گمراہی چاہے وہ تمہارے اپنے بڑے ہوں یا ہم عصر دوست واحباب) تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گی (یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا

یضرکم من ضل اذا اهتدیتم)۔ اس کے بعد قیامت، حساب کتاب اور ہر کسی کے اعمال کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم سب نے خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے اور تم میں سے ہر ایک کا حساب الگ ہوگا اور جو کچھ تم نے انجام دیا اس سے تمہیں آگاہ کیا جائے گا (الی الله مرجعکم جمیعا فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

ایک سوال کا جواب

اس آیت کے بارے میں بہت زیادہ آوازیں بلند ہوئی ہیں بعض نے یہ خیال کر لیا ہے کہ اس آیت کے درمیان اور امر معروف و نہی از منکر "کے حکم کے درمیان کہ جو اسلام کا ایک قطعی اور مسلم حکم ہے ایک قسم کا تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ تم اپنے حالات کی طرف توجہ کرو (اور اپنے ہی متعلق سوچ بچار کرو اور اپنی حالت میں مگن رہو) دوسروں کا انحراف اور کجروی تمہاری حالت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

اتفاقاً روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کا اشتباہ آیت کے نزول کے زمانے میں بھی بعض کم علم لوگوں میں پایا جاتا تھا۔

"جبیر ابن نفیل" کہتے ہیں:

میں چند اصحاب پیغمبر کے حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا اور میں ان میں سب سے زیادہ کم سن تھا۔ انہوں نے امر معروف اور نہی از منکر کے متعلق گفتگو شروع کر دی، میں ان کی باتوں کے درمیان بول پڑا اور میں نے کہا کہ کیا خدا قرآن میں یہ نہیں کہتا: (یا ایہا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم) اس بنا پر امر بمعروف اور نہی از منکر کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔ اچانک ان سب نے مجھے سرزنش کی اور کہنے لگے: تم قرآن کی ایک آیت کو اس کا معنی سمجھے بغیر الگ کر رہے ہو۔ میں اپنی گفتگو سے بہت ہی شرمندہ ہوا اور انہوں نے اپنا مباحثہ جاری رکھا۔ جب وہ وہاں سے مجلس برخاست کر کے اٹھنے لگے، تو میری طرف رُخ کر کے کہنے لگے: تو کم سن نوجوان ہے اور تو نے قرآن کی ایک آیت کو اس کا معنی سمجھے بغیر اسے باقی سے الگ کر لیا ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ تم ایسے زمانے کو پاؤ کہ تم یہ دیکھو کہ بخل لوگوں پر چھایا ہوا ہے، اور ان پر اس کی فرمانروائی ہے، ہوا و ہوس لوگوں کا پیشوا ہے اور ہر شخص صرف اپنی ہی رائے پسند کرتا ہے۔ ایسے زمانے میں تم صرف اپنی ہی خیر مناؤ، دوسروں کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی (یعنی آیت ایسے زمانے کے ساتھ مربوط ہے)۔

ہمارے زمانے کے بعض آرام پرست بھی جب دو عظیم خدائی فرائض امر بمعروف اور نہی از منکر کی انجام دہی کی گفتگو ہوتی ہے تو جوابدہی سے اپنے کندھوں کو خالی رکھنے کے لیے اس آیت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے معنی میں تحریف کرتے ہیں۔ حالانکہ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ان دو احکام کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔

کیونکہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ ہر شخص کا حساب کتاب الگ الگ ہے اور دوسروں کی گمراہی، مثلاً اپنے گزرے ہوئے بزرگوں یا غیروں کی گمراہی ہدایت یافتہ لوگوں کی ہدایت پر کوئی ضرب نہیں لگاتی، یہاں تک کہ اگر وہ بھائی بھائی بھی ہوں، یا باپ بیٹا ہوں لہٰذا تم ان لوگوں کی پیروی نہ کرو اور خود اپنے آپ کو بچاؤ (غور کیجئے)۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ آیت اس موقع کی طرف اشارہ کرتی ہے جس وقت امر بمعروف اور نہی از منکر کارگر نہ ہوں، یا ان کی تاثیر کے حالات موجود نہ ہوں۔ بعض اوقات کچھ لوگ ایسے موقع پر پریشان ہو جاتے ہیں، کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ تمہارے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے کیونکہ تم نے اپنے فرض کی انجام دہی کر دی ہے اور انہوں نے قبول نہیں کیا، یا ان میں قبول کرنے کی اہلیت اور اسباب موجود نہیں تھے، اس بنا پر کوئی نقصان تمہیں نہیں پہنچے گا۔

یہی مفہوم اُس حدیث میں جو ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں موجود ہے۔ اسی طرح بعض دوسری احادیث میں نقل ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے اس آیت کے متعلق سوال ہوا تو آپؐ نے فرمایا:

"ایتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر فاذا رأيت دنيا مؤثرة وشحا مطاعا وهوى متبعا واعجاب كل ذي رأي برأيه فعليك بخويصة نفسك وذرعوامهم"

"امر بمعروف و نہی از منکر کرو، لیکن جب دیکھو کہ لوگ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں اور مقدم سمجھتے ہیں بخل اور ہوا و ہوس ان پر حکمران ہے اور ہر شخص صرف اپنی ہی رائے کو پسند کرتا ہے (اور اس کے کان کسی دوسرے کی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں) تو اپنے آپ میں لگ جاؤ اور لوگوں کو چھوڑ دو"[1]

بہر حال اس میں شک نہیں کہ امر بمعروف اور نہی از منکر ارکانِ اسلام میں سے اہم ترین مسئلہ ہے، جس کی جوابدہی سے کسی طرح بھی سبکدوشی ممکن نہیں، صرف ان مواقع پر یہ دونوں فرائض ساقط ہو جاتے ہیں جب ان کے اثر انداز ہونے کی اُمید نہ ہو، اور لازمی ضروری شرائط ان میں موجود نہ ہوں[2]

۱۰۶۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّا اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ○

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۶۸۴۔

[2] اس سلسلے میں تفصیل اسلامی احکام جاننے کے لیے امام خمینی کی توضیح المسائل کے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے باب کی طرف رجوع فرمائیں، نیز دیگر متعلقہ اسلامی کتب کا مطالعہ کریں (مترجم)۔

۱۰۷۔ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۱۰۸۔ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ ع

ترجمہ

۱۰۶۔ اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو وصیت کرتے وقت اپنے میں سے دو عادل افراد کو بلالو، یا اگر تم سفر میں ہو اور تمہیں موت آپہنچے (اور راستے میں تمہیں کوئی مسلمان نہ ملے) تو اغیار میں سے دو افراد، اور اگر شہادت ادا کرتے وقت ان کے سچے ہونے میں شک کرو تو انہیں نماز کے بعد روک رکھو تاکہ وہ یہ قسم کھائیں کہ ہم حق کو کسی چیز کے بدلے فروخت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اگرچہ ہمارے رشتہ داروں کے بارے میں ہو اور ہم خدائی شہادت کو نہیں چھپاتے کہ مبادا ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں۔

۱۰۷۔ اور اگر اطلاع حاصل ہو جائے کہ وہ دونوں گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انہوں نے حق کو چھپایا ہے) تو دو اور افراد کہ جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے ان کی جگہ قرار پائیں گے اور خدا کی قسم کھائیں گے کہ ہماری گواہی ان دونوں کی گواہی کی نسبت حق کے زیادہ قریب ہے اور ہم تجاوز و زیادتی کے مرتکب نہیں ہوئے اور اگر ہم نے ایسا کیا ہو تو ہم ظالمین میں سے ہوں گے۔

۱۰۸۔ یہ کام زیادہ سبب بنے گا کہ وہ حق کی گواہی دیں (اور خدا سے ڈریں) اور یا (لوگوں سے) ڈریں کہ (ان کا جھوٹ فاش ہو جائے گا اور) ان کی قسموں کی جگہ دوسری قسمیں لے لیں گی اور خدا (کی مخالفت) سے ڈرو اور کان دھر کر بات سنو اور خدا فاسقین کی ہدایت نہیں کرتا۔

شانِ نزول

مجمع البیان اور بعض دوسری تفاسیر میں درج بالا آیات کی شانِ نزول کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ مسلمانوں میں سے "ابن ابی ماریہ" نامی ایک شخص دو عرب عیسائیوں کی ہمراہی میں جن کے نام "تمیم" اور "عدی" تھے اور وہ دونوں بھائی تھے تجارت کے ارادے سے مدینہ سے نکلا۔ اثنائے راہ میں "ابن ابی ماریہ" جو مسلمان تھا بیمار ہوگیا اس نے وصیت نامہ لکھا اور اسے اپنے سامان میں چھپا دیا اور اپنا مال اپنے دو ہمسفر عیسائیوں کے سپرد کرتے ہوئے وصیت کی کہ وہ اسے اس کے رشتہ داروں تک پہنچا دیں وہ مرگیا۔ اُس کے ہمسفر دونوں افراد نے اس کا مال واسباب کھولا اور اس میں سے گراں قیمت اور زیادہ اہم چیزیں اٹھالیں اور باقی مال وارثوں کو پہنچا دیا۔ وارثوں نے جب سامان کھولا تو انہیں اس میں اُن چیزوں میں سے جو "ابن ابی ماریہ" اپنے ساتھ لے گیا تھا کچھ چیزیں نہ ملیں۔ اچانک اُن کی نظر وصیت نامے پر پڑی۔ انہوں نے دیکھا کہ تمام چوری شدہ مال کی تفصیل اس میں درج ہے۔ انہوں نے اُن دو ہمسفر عیسائیوں کے سامنے ماجرا پیش کیا۔ انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جو کچھ اس نے ہمیں دیا وہ ہم نے تمہارے سپرد کردیا۔ مجبوراً انہوں نے پیغمبرؐ سے شکایت کی تو زیرِ نظر آیات نازل ہوئیں جن میں اس سلسلے میں حکم بیان کیا گیا۔

لیکن اس شانِ نزول سے کہ جو کتاب کافی میں بیان ہوئی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پہلے تو دوسرے مال ومتاع کا انکار کیا اور معاملہ پیغمبرؐ کی خدمت میں لایا گیا۔ پیغمبرؐ کے پاس چونکہ ان دو افراد کے خلاف کوئی دلیل موجود نہیں تھی تو انہیں قسم کھانے پر آمادہ کیا اور اُن سے قسم لینے کے بعد انہیں بری کردیا۔ لیکن کچھ وقت نہیں گزرا تھا کہ اُن دونوں آدمیوں کے پاس سے مالِ متنازعہ میں سے کچھ مال مل گیا اور اس طرح سے اُن کا جھوٹ ثابت ہوگیا۔ ماجرا پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا گیا پیغمبرؐ انتظار میں ہی تھے کہ درج بالا آیات نازل ہوئیں۔ اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ مرنے والے کے ورثا قسم کھائیں اور پھر آپؐ نے مال ان کے سپرد کردیا۔

تفسیر

اسلام کے اہم ترین مسائل میں سے ایک حفظِ حقوق اور لوگوں کے اموال اور مکمل عدالت اجتماعی کے اجراء کرنے کا مسئلہ ہے۔ اُوپر والی آیات اس حصہ سے مربوط احکام کا ایک گوشہ ہیں۔

پہلے اس بنا پر کہ وارثوں کے حقوق مرنے والے کے مال میں سے ضائع نہ ہوں اور پسماندگان، یتیم اور چھوٹے بچوں کا حق پائمال نہ ہو، صاحب ایمان افراد کو حکم دیتا ہے اور اُن سے یہ کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! جب تم میں سے کسی کو موت آگھیرے تو وصیت کرتے وقت دو عادل افراد کو گواہی کے لیے بلاؤ اور اپنا مال امانت کے طور پر ورثا کے حوالے کرنے کے لیے ان کے سپرد کرو (یاایھا الذین اٰمنوا شھادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا عدل منکم)۔

یہاں عدل سے مراد وہی عدالت ہے جو گناہ کبیرہ وغیرہ سے پرہیز کرنے کے معنی میں ہے۔ البتہ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ہے کہ عدالت سے مراد "امورِ مالی میں امانت" اور "عدمِ خیانت" ہو مگر یہ کہ دوسرے دلائل سے ثابت ہو کہ اس سے مزید شرائط بھی

اس سلسلے میں ضروری ہیں۔

"منکم" سے مراد یعنی تم مسلمانوں میں سے، غیر مسلم افراد کے مقابلے میں ہے کہ جس کی طرف بعد والے جملے میں اشارہ ہوگا۔

البتہ اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہاں عام شہادت کے متعلق بحث نہیں ہے، بلکہ یہ وہ شہادت ہے جو وصیت کے ساتھ وابستہ ہے، یعنی یہ دونوں افراد وصی بھی ہیں اور گواہ بھی۔ باقی رہا یہ احتمال کہ یہاں پر دو گواہوں کے علاوہ ایک تیسرے شخص کا وصی کے طور پر انتخاب بھی ضروری ہے تو وہ ظاہر آیت کے خلاف اور شانِ نزول کے مخالف ہے، کیونکہ ہم شان نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ ابن ماریہ کے ہمسفر صرف دو افراد تھے کہ جنہیں اس نے اپنی میراث پر وصی اور گواہ ٹھہرایا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: اگر تم مسافرت میں ہو اور تم پر موت کی مصیبت آپڑے (اور مسلمانوں میں سے کوئی وصی اور شاہد تمہیں نہ مل سکے) تو اس مقصد کے لیے غیر مسلمانوں میں سے دو افراد کا انتخاب کرلو (او اٰخران من غیرکم ان انتم ضربتم فی الارض فاصابتکم مصیبۃ الموت)۔

اگرچہ آیت میں اس موضوع سے متعلق کوئی بات دکھائی نہیں دیتی کہ غیر مسلموں میں سے وصی و شاہد کا انتخاب مسلمانوں میں سے کسی مسلمان کے نہ ملنے کے ساتھ مشروط ہے البتہ یہ بات واضح ہے کہ مراد ایسی صورت میں ہی ہے جب مسلمان تک رسائی نہ ہو اور مسافرت کی قید کا ذکر بھی اسی وجہ سے ہوا ہے۔ اسی طرح کلمہ "او" اگرچہ عام طور پر اختیار کے لیے آتا ہے لیکن یہاں بھی بہت سے دوسرے مواقع کی طرح "ترتیب" ہی منظور ہے، یعنی پہلے تو مسلمانوں میں سے انتخاب ہونا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر غیر مسلموں میں سے انتخاب کرو۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے یہاں صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہی مراد ہیں کیونکہ اسلام مشرکوں اور بت پرستوں کی اہمیت کا کبھی قائل نہیں ہوا۔

پھر حکم دیتا ہے کہ گواہی دینے کے وقت، رفعِ شک کی غرض سے، ان دونوں افراد کو نماز کے بعد اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اللہ کی قسم کھائیں (تحبسونھما من بعد الصلوٰۃ فیقسمان باللہ ان ارتبتم) اور ان کی شہادت اس طرح سے ہونا چاہیے کہ وہ یہ کہیں کہ: ہم اس بات پر آمادہ نہیں ہیں کہ حق کو مادی منافع کی خاطر بیچ ڈالیں اور ناحق گواہی دیں اگرچہ ہمارے رشتہ داروں اور عزیزوں کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو (لا نشتری بہ ثمنا ولو کان ذا قربیٰ) اور ہم کبھی خدائی گواہی کو نہیں چھپائیں گے کیونکہ اس طرح تو ہم گنہگاروں میں سے ہو جائیں گے (ولا نکتم شہادۃ اللہ انا اذاً لمن الاٰثمین)۔

اس حقیقت پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ:

اولاً یہ تمام لوازمات شک و شبہ اور اتہام کی صورت میں ادائے شہادت کے سلسلے میں ہیں۔

دوسرا یہ کہ ظاہر آیت کے مطابق مسلمان اور غیر مسلم میں اس نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں ہے بلکہ حقیقت میں یہ تو اتہام کے پیش نظر مال کی حفاظت کے لیے ایک طرح کی محکم ضمانت ہے اور یہ بات شہادت عدلین کو بغیر قسم کے قبول کرلینے کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ حکم عدم اتہام کے مواقع کے ساتھ مربوط ہے، لہٰذا اس بنا پر نہ تو اس آیت کا حکم منسوخ ہوا ہے اور نہ ہی یہ غیر مسلموں کے ساتھ مخصوص ہے (غور کیجیے گا)۔

تیسرا یہ کہ نماز سے مراد غیر مسلموں کی صورت میں از روئے اصول وقاعدہ خود ان کی ہی نماز ہونا چاہیے کہ جو ان میں توجہ اور خوف خدا پیدا کرتی ہے باقی رہا مسلمانوں کے بارے میں تو ایک گروہ کا نظریہ تو یہ ہے کہ اس سے مراد خاص طور پر نماز عصر ہے اور اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں بھی اس بارے میں اشارہ ہوا ہے لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے اور وہ ہر نماز کے لیے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہماری روایات میں خصوصیت کے ساتھ نماز عصر کا ذکر استحبابی پہلو رکھتا ہو کیونکہ نماز عصر میں لوگ زیادہ تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ علاوہ ازیں فیصلہ اور قضاوت کا وقت بھی مسلمانوں کے نزدیک زیادہ تر یہی ہوتا تھا۔

چوتھا یہ کہ شہادت کے لیے نماز کے وقت کا انتخاب اس بنا پر تھا کیونکہ اس موقع پر انسان میں خدا خوفی کی روح بیدار ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ [1]

زمان ومکان کی حالت انسان کو حق کی طرف متوجہ کردیتی ہے، یہاں تک کہ بعض فقہاء نے کہا ہے کہ اگر گواہی کے لیے مکہ میں ہوں تو بہتر ہے خصوصاً کعبہ کے پاس "رکن" و "مقام" کے درمیان کہ جو بہت ہی مقدس جگہ ہے اور اگر مدینہ میں ہوں تو پیغمبرؐ کے منبر کے پاس یہ شہادت ادا ہو۔

بعد والی آیت میں ایسے موقع کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ دونوں گواہ خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے حق کے خلاف گواہی دی ہے۔ جیسا کہ آیت کی شان نزول میں بیان ہوا ہے۔ ایسے موقع کے لیے حکم یہ ہے کہ: اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ گناہ، جرم اور تعدی کے مرتکب ہوئے ہیں اور انہوں نے حق کو پامال کردیا ہے تو دوسرے دو آدمی اُن لوگوں میں سے لیے جائیں گے جن پر پہلے گواہوں نے ظلم کیا ہے یعنی مرنے والے کے ورثا میں سے اور وہ اپنا حق ثابت کرنے کے لیے گواہی دیں گے (فان عثر علی انهما استحقا اثما فاخران يقومان مقامهما من الذين استحق عليهم الاوليان)۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں کہا ہے کہ یہ آیت معنی اور اعراب کے لحاظ سے پیچیدہ ترین اور مشکل ترین آیات قرآن میں سے ہے۔ لیکن دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اس قدر پیچیدہ بھی نہیں ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ لفظ "اثم" (گناہ) کے قرینہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہاں "استحق" سے مراد جرم اور دوسرے کے حق پر تجاوز ہے اور دوسرے یہ کہ "اولیان" یہاں "اولان" کے معنی میں ہے یعنی وہ دو گواہ کہ جنہیں پہلے گواہی دینا چاہیے تھی اور اب وہ راہ راست سے منحرف ہو گئے ہیں۔ بنا بریں آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ اگر کوئی ایسی اطلاع مل جائے کہ پہلے والے دو گواہ غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں تو دو اور افراد ان کی جگہ لیں گے یہ دو گواہ ان لوگوں میں سے ہوں گے کہ جن پر پہلے دو گواہوں نے زیادتی اور تجاوز کیا ہے [2]

---

[1] عنکبوت - ۴۵ -

[2] اس بنا پر اعراب کے لحاظ سے "آخران" مبتدا ہے اور " يقومان مقامهما " خبر ہے اور "اولیان" "استحق" کا فاعل ہے " والذين " ورثاء کے معنی میں ہے جن پر ظلم ہوا ہے اور جار و مجرور " من الذين " کا "اخران" کی صفت ہوگا (غور کیجئے گا)۔

آیت کے ذیل میں دوسرے دو گواہوں کی ذمہ داری یوں بیان کی گئی ہے: وہ خدا کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی پہلے دو افراد کی گواہی کی نسبت زیادہ صحیح اور حق کے زیادہ قریب ہے اور ہم تجاوز اور کسی ظلم و ستم کے مرتکب نہیں ہوں گے اور اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے قرار پائیں گے (فیقسمان باللہ لشھادتنا احق من شھادتھما وما اعتدینا انا اذا لمن الظلمین)۔

حقیقت میں مرنے والے کے اولیاء پہلے سے اس کے مال و متاع کے بارے میں مسافرت کے وقت یا مسافرت کے علاوہ جو کچھ جانتے ہیں اس کی بنیاد پر گواہی دیں گے کہ پہلے دو گواہ ظلم و خیانت کے مرتکب ہوئے ہیں، اور یہ گواہی مشاہدہ حس کی بنا پر ہے نہ کہ حدس و قرائن کی رو سے۔

زیر بحث آیت کے آخر میں درحقیقت ان احکام کا فلسفہ بیان ہو رہا ہے جو شہادت کے سلسلے میں پہلی آیات میں گزر چکے ہیں کہ اگر اوپر والے حکم کے مطابق عمل ہو یعنی دونوں گواہوں کو نماز کے بعد جماعت کی موجودگی میں گواہی کے لیے طلب کریں اور ان کی خیانت ظاہر ہونے کی صورت میں دوسرے افراد ورثاء میں سے ان کی جگہ لے لیں اور حق کو واضح کریں تو یہ لائحہ عمل اس بات کا سبب بنے گا کہ گواہ گواہی کے معاملے میں غور و خوض سے کام لیں گے اور خدا کے خوف یا خلق خدا کے ڈر سے واقع کے مطابق گواہی دیں گے (ذٰلک ادنی ان یأتوا بالشھادۃ علی وجھھا او یخافوا ان ترد ایمان بعد ایمانھم)۔

درحقیقت یہ کام اس بات کا سبب بنے گا کہ ان میں خدا کے سامنے یا بندگانِ خدا کے سامنے زیادہ سے زیادہ بازپرس کا خوف پیدا ہو جائے اور وہ حق کے مرکز سے روگرداں نہ ہوں۔

آیت کے آخر میں تمام گذشتہ احکام کی تاکید کے لیے ایک حکم دیا گیا ہے:

پرہیزگاری اختیار کرو اور فرمان خدا کان لگا کر سنو اور یہ جان لو کہ خدا فاسق گروہ کو ہدایت نہیں کرتا (واتقوا اللہ واسمعوا واللہ لا یھدی القوم الفسقین)۔

۱۰۹۔ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○

ترجمہ

۱۰۹۔ اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور انہیں کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا تو وہ کہیں گے ہمیں تو پتہ نہیں تو خود تمام پوشیدہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔

تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیات کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ گذشتہ آیات کے ذیل میں جو حق و باطل کی شہادت کے مسئلہ

کے ساتھ مربوط تھیں، تقویٰ اور حکم خدا کی مخالفت سے ڈرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس آیت میں کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جس دن خدا پیغمبروں کو جمع کرے گا اور ان سے رسالت اور ان کی ماموریت کے بارے میں سوال کرے گا اور ان سے کہے گا کہ لوگوں نے تمہاری دعوت کا کیا جواب دیا تھا (یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَیَقُوۡلُ مَاذَاۤ اُجِبۡتُمۡ)۔

وہ اپنے کسی بھی قسم کے ذاتی علم کی نفی کرتے ہوئے تمام حقائق کو علم پروردگار کے ساتھ وابستہ کرکے کہیں گے: خداوندا! ہمیں کوئی علم نہیں ہے تو ہی تمام پوشیدہ اور چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہ ہے (قالوا لاعلم لنا انک انت علام الغیوب)۔

اس طرح تمہارا ایسے علام الغیوب خدا اور ایسی عدالت سے سامنا ہوگا، اس لیے تم اپنی گواہیوں میں حق و انصاف کو ملحوظ نظر رکھو۔ یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

پہلا: یہ کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و مرسلین اپنی اُمت کے گواہ اور شاہد ہیں جب کہ اُوپر والی آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے علم کی نفی کرتے ہیں اور تمام چیزوں کو خدا کے سپرد کر رہے ہیں۔

لیکن ان دونوں باتوں کے درمیان کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ دونوں باتیں دو علیٰحدہ علیٰحدہ مرحلوں کے ساتھ مربوط ہیں۔ پہلے مرحلہ میں جس کی طرف زیرِ بحث آیت میں اشارہ ہے انبیاء علیہم السلام نے پروردگار کے سوال کے جواب میں اظہارِ ادب کیا ہے اور اپنے آپ سے علم کی نفی کی ہے اور تمام چیزوں کو خدا کے علم سے وابستہ کیا ہے، لیکن بعد کے مرحلوں میں اپنی اُمت کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اس کو واضح کریں گے اور اس کی گواہی دیں گے، یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح سے کہ بعض اوقات استاد اپنے شاگرد سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کے سوال کا جواب دو اور شاگرد پہلے تو اظہار ادب کے طور پر اپنے علم کو استاد کے علم کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر قرار دیتا ہے اور پھر جو کچھ وہ جانتا ہے اسے بیان کرتا ہے۔

دوسرا: یہ کہ انبیاء علیہم السلام اپنے سے علم کی نفی کیسے کریں گے حالانکہ وہ عام عادی علم کے علاوہ بہت سے مخفی حقائق پروردگار کی تعلیم کے ذریعے جانتے ہیں۔

اگرچہ اس سوال کے جواب میں مفسّرین نے طرح طرح کی بحثیں کی ہیں لیکن ہمارے عقیدے کے مطابق یہ بات بالکل واضح و روشن ہے کہ یہاں پر انبیاء علیہم السلام کی مراد یہ ہے کہ وہ اپنے علم کو خدا کے علم کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے، ہماری ہستی اس کی بے پایاں ہستی کے سامنے کوئی چیز ہی نہیں ہے اور ہمارا علم اس کے علم کے سامنے کوئی علم ہی شمار نہیں ہوتا اور خلاصہ یہ ہے کہ "ممکن" جو کچھ بھی ہو "واجب" کے مقابلے میں کوئی چیز ہی نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں اگرچہ انبیاء علیہم السلام کا علم و دانش اپنے مقام پر بہت زیادہ ہے لیکن جب اس کا قیاس علم پروردگار کے ساتھ کیا جائے گا تو وہ کوئی شے شمار نہیں ہوگا۔

حقیقت میں عالم واقعی وہ ذات ہے کہ جو ہر جگہ اور ہر وقت حاضر و ناظر ہو اور تمام ذراتِ عالم کے ایک دوسرے سے

لہ جو کچھ اُوپر کہا جا چکا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراب کے لحاظ سے "یوم" "اتقوا" کا مفعول ہے کہ جو اس کی تقدیر ہے اور پہلی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

وسل و پیوند سے باخبر ہو اور اس جہان کی تمام خصوصیات سے کہ جو ایک وحدت کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ ملا ہوا ہے، آگاہ ہو اور یہ صفت صرف خداوند تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے۔

ہم نے اب تک جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت پیغمبروں اور اماموں سے ہر قسم کے علم غیب کی نفی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے خیال کر رکھا ہے کیونکہ علم غیب ذاتی طور پر تو اس ہستی سے ہی مربوط ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ حاضر ہو۔ اس کے علاوہ کوئی بھی بالذات اس قسم کے علم کا حامل نہیں ہے بلکہ جتنا خدا نے اُسے علم غیب دیا ہے اتنا ہی وہ جانتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات اس چیز کی گواہ ہیں کہ جن میں سے سورۂ جن کی آیہ ۲۶ میں ہے:

"عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ۔ إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ"

خداوند تعالیٰ عالم الغیب ہے اور سوائے ان رسولوں کے کہ جنہیں اس نے برگزیدہ کیا ہے اور کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا۔

نیز سورہ ہود کی آیہ ۴۹ میں ہے:

"تِلْكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ"

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تجھ پر وحی کرتے ہیں۔

ان آیات اور ان جیسی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم غیب ذات خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن جس شخص کے لیے وہ جتنا مصلحت سمجھتا ہے اسے تعلیم دیتا ہے اور اس کی کمیت و کیفیت اس کی خواہش اور مشیت سے مربوط ہے۔

۱۱۰۔ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۖ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۖ وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي ۖ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي ۖ وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ

ترجمہ

۱۱۰۔ وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ بن مریم سے کہا کہ اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے جب میں نے روح القدس کے ذریعے تیری تقویت کی کہ تو گہوارے میں اور بڑے ہو کر لوگوں سے گفتگو کرتا تھا، اور جب میں نے تجھے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دی اور جب کہ تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا اور اس میں پھونکتا تھا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور مادر زاد اندھے اور برص کی بیماری والے کو تو میرے حکم سے شفا دیتا تھا اور مردوں کو (بھی) تو میرے حکم سے زندہ کرتا تھا اور جب میں نے بنی اسرائیل کو تجھے اذیت وتکلیف پہنچانے سے باز رکھا جب تو ان کے پاس واضح دلائل لے کر آیا تھا لیکن اُن میں سے کافروں کی ایک جماعت نے کہا کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا کچھ نہیں۔

تفسیر

مسیحؑ پر انعاماتِ الٰہی

یہ آیت اور سورۂ مائدہ کے آخر تک بعد والی آیات حضرت عیسیٰؑ کی سرگذشت اور ان نعمات سے مربوط ہیں جو آنجناب اور ان کی اُمت کو بخشی گئیں اور وہ یہاں پر مسلمانوں کی بیداری اور آگاہی کے لیے بیان ہوئی ہیں پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب خدا نے عیسیٰ ابن مریم سے فرمایا کہ تم اُس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر کی ہے (اذ قال الله یٰعیسی ابن مریم اذکر نعمتی علیك وعلی والدتك)۔

اس تفسیر کے مطابق اوپر والی آیات ایک مستقل بحث شروع کر رہی ہیں جو مسلمانوں کے لیے تربیتی پہلو رکھتی ہے اور اس کا اسی دنیا کے ساتھ ربط ہے۔ لیکن بعض مفسرین مثلاً طبرسی، بیضاوی اور ابوالفتوح رازی نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کا ضمیمہ ہے اور اس کا ربط ان سوالات اور باتوں سے ہے جو خداوند تعالیٰ قیامت کے دن پیغمبروں سے کرے گا اور اس بنا پر "قال" جو فعل ماضی ہے یہاں "یقول" یعنی فعل مضارع کے معنی میں ہو گا۔ لیکن یہ احتمال ظاہر آیت کے خلاف ہے، خاص طور پر جبکہ معمول یہ ہے کہ کسی کے لیے نعمتوں کا شمار کرنا اس میں روحِ شکر گزاری زندہ کرنے کی غرض سے ہوتا ہے۔ جبکہ قیامت میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں آئے گا۔ اس کے بعد اپنی نعمات کا ذکر شروع کر دیا ہے، پہلے کہتا ہے: میں نے تجھے روح القدس کے ذریعے تقویت دی ہے (اذ ایدتك بروح القدس)۔

روح القدس کے معنی کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد اوّل میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے[1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

خلاصہ یہ کہ ایک احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وحی لانے والا فرشتہ یعنی جبرئیل ہو۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس سے مراد وہی غیبی طاقت ہو جو حضرت عیسیٰؑ کو معجزے دکھانے اور رسالت کے کام سرانجام دینے کے لیے تقویت دیتی تھی اور یہ چیز انبیاءؑ کے علاوہ دوسروں میں بھی ضعیف تر درجہ میں موجود ہوتی ہے۔ نعمات الٰہی میں سے دوسری نعمت تجھ پر یہ ہے کہ روح القدس کی تائید کے ذریعے تو لوگوں کے ساتھ گہوارے میں اور پختہ کار ہو کر گفتگو کرتا تھا (تکلم الناس فی المھد و کھلاً)۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تیری گہوارہ کی باتیں بھی بڑے ہونے کے بعد کی باتوں کی مانند پختہ اور جچی تلی ہوتی تھیں اور وہ بچوں کی طرح بے وزن نہیں ہوتی تھیں۔

تیسری نعمت یہ ہے کہ میں نے تجھے کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی (و اذ علمتک الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل)۔ کتاب کے ذکر کے بعد تورات و انجیل کا تذکرہ جبکہ وہ بھی آسمانی کتابوں میں سے ہیں حقیقت میں اجمال کے بعد تفصیل کی صورت میں ہے۔

چوتھی نعمت یہ ہے کہ تو میرے حکم سے پرندے کی شکل کی ایک چیز مٹی سے بناتا تھا اس کے بعد اس میں پھونکتا تھا تو وہ میرے حکم سے ایک زندہ پرندہ ہو جاتی تھی (و اذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فتکون طیرًا باذنی)۔

پانچویں نعمت یہ ہے کہ تو میرے اذن سے مادرزاد اندھے اور برص کی بیماری میں مبتلا شخص کو شفا دیتا تھا (و تبرئ الاکمہ والابرص باذنی)۔ اور تو میرے اذن سے مُردوں کو بھی زندہ کیا کرتا تھا (و اذ تخرج الموتی باذنی) اور بالآخر میری نعمتوں میں سے ایک اور نعمت تجھ پر یہ تھی کہ میں نے بنی اسرائیل کو تجھے نقصان پہنچانے سے اس وقت باز رکھا جب کہ ان کے کافر تیرے واضح اور روشن دلائل کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں کھلا جادو کہنے لگے۔ میں نے اس تمام شور و غل اور سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کے مقابلے میں تیری حفاظت کی تاکہ تو اپنی دعوت کو آگے بڑھا سکے (و اذ کففت بنی اسرائیل عنک اذ جئتھم بالبینات فقال الذین کفروا منھم ان ھٰذا الا سحر مبین)۔

یہاں پر ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں چار مرتبہ لفظ "باذنی" (میرے حکم سے) دہرایا گیا ہے تاکہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے غلو اور ادعائے الوہیت کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ یعنی جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اگرچہ بہت عجیب و غریب اور حیرت انگیز تھا اور خدائی کاموں کے ساتھ شباہت رکھتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی کام خود عیسیٰؑ کی طرف سے نہیں تھا بلکہ یہ سب کام خدا کی طرف سے انجام پذیر ہوتے تھے۔ وہ ایک بندۂ خدا تھے اور خداوند تعالیٰ کے تابع فرمان تھے اور ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ خدائے لایزال کی قدرت سے تھا۔

ہو سکتا ہے یہ کہا جائے کہ یہ تمام کی تمام نعمتیں حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ مربوط تھیں تو اس آیت میں ان نعمتوں کو ان کی والدہ جناب مریمؑ کے لیے بھی نعمت کیوں شمار کیا گیا۔

حاشیہ صفحہ سابقہ
۱؎ تفسیر نمونہ جلد اول (اردو ترجمہ) صفحہ ۲۶۰۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ جو نعمت بیٹے تک پہنچتی ہے وہ حقیقت میں اس کی ماں کو بھی پہنچتی ہے کیونکہ دونوں ایک اصل سے ہیں اور ایک ہی درخت کی شاخ اور جڑ ہیں۔

ضمنی طور پر جیسا کہ ہم سورہ آل عمران کی آیہ ۴۹ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں یہ آیت اور اسی قسم کی آیات اولیاء خدا کی ولایت تکوینی کے واضح دلائل میں سے ہیں کیونکہ مسیح کے قصے میں مردوں کو زندہ کرنے، مادر زاد اندھوں اور لاعلاج بیماروں کو شفا دینے کو مسیح کی ذات کی طرف منسوب کیا گیا ہے البتہ اذن و فرمانِ خدا کے ساتھ۔

اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات عین ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ عالم تکوین میں تصرف کرنے کے لیے اس قسم کی قدرت کسی شخص کے اختیار میں دے دے کہ وہ کبھی کبھی اس قسم کے اعمال انجام دے لیا کرے اور اس آیت کی تفسیر انبیاءؑ کے دعا کرنے اور خدا کی طرف سے ان کی دعا قبول ہونے کے ساتھ کرنا مکمل طور پر ظواہر آیات کے خلاف ہے۔ البتہ اولیاء خدا کی ولایت تکوینی سے ہماری مراد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جیسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس مقدار سے زیادہ کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ مزید وضاحت کے لیے جلد دوم کی طرف رجوع کریں[1]۔

۱۱۱۔ وَ اِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَ بِرَسُوْلِیْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ○

۱۱۲۔ اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ هَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّكَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○

۱۱۳۔ قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَ نَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ نَكُوْنَ عَلَیْهَا مِنَ الشّٰهِدِیْنَ ○

۱۱۴۔ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَ اٰخِرِنَا وَ اٰیَةً مِّنْكَ ۚ وَ ارْزُقْنَا وَ اَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ○

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ صفحہ ۳۲۳ (اردو ترجمہ)۔

۱۱۵۔ قَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مُنَزِّلُهَا عَلَیْكُمْ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّیْۤ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُهٗۤ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ۟۠

ترجمہ

۱۱۱ ۔ اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے پر ایمان لاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلمان ہیں۔

۱۱۲۔ وہ وقت کہ جب حواریوں نے یہ کہا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تیرا پروردگار آسمان سے مائدہ نازل کر سکتا ہے تو اس نے (جواب میں) کہا اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اللہ سے ڈرو۔

۱۱۳۔ وہ کہنے لگے (ہم یہ بات بری نیت سے نہیں کہتے بلکہ) ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل (آپ کی رسالت پر) مطمئن ہو جائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچی بات کہی ہے اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔

۱۱۴۔ عیسیٰؑ نے عرض کیا اے خدا! اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے مائدہ نازل فرما تا کہ وہ ہمارے اول و آخر کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے نشانی ہو اور ہمیں روزی عطا فرما، تو بہترین روزی دینے والا ہے۔

۱۱۵۔ خداوند تعالیٰ نے (اس کی دعا قبول فرمائی اور) کہا: میں اُسے تم پر نازل کروں گا، لیکن جو شخص تم میں سے اس کے بعد کافر ہو جائے گا (اور وہ انکار کی راہ اختیار کرے گا) اُسے میں ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے ویسی سزا کسی کو نہ دی ہوگی۔

تفسیر

حواریوں پر مائدہ کے نزول کا واقعہ

اس بحث کے بعد جو مسیح اور ان کی والدہ کے بارے میں نعمات الٰہی کے سلسلہ میں گذشتہ آیات میں بیان ہو چکی ہے ان آیات میں اُن نعمات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو حواریوں یعنی حضرت عیسیٰؑ کے نزدیکی اصحاب و انصار کو بخشی گئی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے، اُس وقت کو یاد کرو جب ہم نے حواریوں کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ پر اور میرے بھیجے ہوئے مسیح پر ایمان لے آؤ تو انہوں نے میری دعوت کو قبول کر لیا اور کہا کہ ہم ایمان لے آئے، خدایا! گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور تیرے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں (واذ اوحیت الی الحواریین ان اٰمنوا بی و برسولی قالوا اٰمنا واشھد باننا مسلمون)۔

البتہ یہ بات ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ لفظ وحی قرآن کریم میں ایک وسیع معنی کا حامل ہے اور ان وحیوں میں منحصر نہیں ہے کہ جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہیں بلکہ وہ الہام بھی جو مختلف افراد کے دلوں پر ہوتے ہیں اس کے مصداق ہیں اور اسی لیے مادر موسیٰ کے بارے میں (سورہ قصص آیہ ۷ میں) وحی کا لفظ آیا ہے[1] یہاں تک کہ حیوانات کے طبعی و فطری الہامات کے لیے بھی قرآن میں لفظ وحی استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھیوں کے لیے ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے وہ وحی مراد ہو جو حضرت مسیح کے ذریعے اور معجزات کی شکل میں ان کی طرف بھیجی جاتی تھی، ہم نے حواریوں کے بارے میں یعنی حضرت عیسیٰؑ کے اصحاب اور شاگردانِ خاص کے لیے جلد دوم صفحہ ۳۲۳ پر بحث کی ہے[2]

اس کے بعد مائدہ آسمانی کے نزول کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: مسیح کے اصحاب خاص نے حضرت عیسیٰؑ سے کہا کیا تیرا پروردگار ہمارے لیے آسمان سے غذا بھیج سکتا ہے (اذ قال الحواریون یا عیسی ابن مریم ھل یستطیع ربک ان ینزل علینا مائدۃ من السماء)۔

"مائدہ" لغت میں خوان، دسترخوان اور طبق کو بھی کہا جاتا ہے اور اُس غذا کو بھی کہتے ہیں جو اُس میں رکھی ہوئی ہو۔ اصل میں یہ "مید" کے مادہ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی حرکت دینے اور ہلانے کے ہیں اور شاید دسترخوان اور غذا پر مائدہ کا اطلاق اس نقل و انتقال کی وجہ سے ہی ہو جو اُن میں صورت پذیر ہوتا رہتا ہے۔

حضرت مسیح نے اس مطالبہ پر کہ جس میں ایسے ایسے معجزات و آیات دکھانے کے باوجود شک اور تردد کی بو آ رہی تھی، غور کیا اور انہیں تنبیہ کی اور کہا کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا سے ڈرو (قال اتقوا اللہ ان کنتم مؤمنین)۔

لیکن انہوں نے جلد ہی حضرت عیسیٰؑ کو بتا دیا کہ ہمارا اس مطالبہ سے کوئی غلط مقصد نہیں ہے اور نہ ہی اس میں ہماری کسی ہٹ دھرمی کی غرض پوشیدہ ہے بلکہ ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم اس مائدہ میں سے کھائیں (اور آسمانی غذا کے کھانے سے نورانیت ہمارے دل میں پیدا ہو گی، کیونکہ غذا مسلمہ طور پر روح انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے، اس کے علاوہ) ہمارے دلوں میں راحت پیدا ہو گی اور اطمینان حاصل ہو گا اور یہ عظیم معجزہ دیکھنے سے ہم علم الیقین کی سرحد تک پہنچ جائیں گے اور یہ جان لیں گے کہ آپ

---

[1] واوحینا الی ام موسی ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ...... ہم نے موسیٰ کی والدہ پر وحی کی کہ اُسے دودھ پلاؤ اور جب اس کے بارے میں تمہیں ڈر ہو تو اُسے دریا میں پھینک دو۔

[2] اُردو ترجمہ میں دیکھئے۔

نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ سچ ہے تاکہ ہم اس پر گواہی دے سکیں (قالوا نرید ان نأکل منھا وتطمئن قلوبنا ونعلم ان قد صدقتنا ونکون علیھا من الشاھدین)۔

جب حضرت عیسیٰ ان کے اس مطالبہ میں ان کی حسن نیت سے آگاہ ہوئے تو ان کی درخواست کو بارگاہ خداوندی میں اس طرح سے بیان فرمایا کہ خداوندا ہمارے لیے آسمان سے مائدہ بھیج جو ہمارے اوّل و آخر کے لیے عید ہو اور تیری طرف سے ایک نشانی شمار ہو اور ہمیں رزق عطا فرما کہ تو ہی بہترین روزی رساں ہے (قال عیسی ابن مریم اللّٰھم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیداً لاولنا واٰخرنا واٰیۃ منک وارزقنا وانت خیر الرازقین)۔

اس میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ان کی درخواست کو بہت ہی عمدہ طریقے سے بارگاہ خداوندی میں پیش کیا، جس میں حق طلبی کی روح کا اظہار بھی پایا جاتا ہے اور اجتماعی و عمومی مصالح کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس دعا کو کہ جو حسن نیت اور خلوص کے ساتھ دل سے نکلی تھی قبول کر لیا اور اُن سے فرمایا کہ میں اس قسم کا مائدہ تم پر نازل کروں گا لیکن اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس مائدہ کے اترنے کے بعد تمہاری ذمہ داری بہت سخت ہو جائے گی اور اس قسم کا واضح معجزہ دیکھنے کے بعد جس شخص نے راہ کفر اختیار کی تو اُسے ایسی سزا دوں گا کہ عالمین میں سے کسی کو ایسی سزا نہیں دی ہوگی (قال اللّٰہ انی منزلھا علیکم فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذاباً لا اعذبہ احداً من العٰلمین)۔

چند ضروری نکات کی یاد دہانی

ان آیات میں چند ایسے نکات ہیں کہ جن کا مطالعہ کرنا ضروری ہے:

(۱) مائدہ کے مطالبہ سے کیا مراد تھی: اس میں تو شک نہیں ہے کہ حوارئین اس درخواست میں کوئی بُرا ارادہ نہیں رکھتے تھے اور ان کا مقصد حضرت عیسیٰ کے مقابلے میں ہٹ دھرمی کرنا نہیں تھا بلکہ مزید اطمینان کی جستجو تھا تاکہ ان کے دلوں کی گہرائیوں میں جو شکوک و شبہات اور وسوسے باقی ہیں وہ بھی دور ہو جائیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی مطلب کو استدلال کے ذریعے یہاں تک کہ کبھی کبھی تجربہ کی بنیاد پر بھی ثابت کر لیتا ہے لیکن جب مسئلہ زیادہ اہم ہوتا ہے تو بہت سے وسوسے اور شکوک و شبہات اس کے دل کے گوشوں میں باقی رہ جاتے ہیں لہٰذا اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ یا تو بار بار کے تجربے اور آزمائش کے ذریعے اور یا استدلال علمی کو عینی مشاہدات کے ساتھ بدل کر شکوک و شبہات اور وسوسوں کو اپنے دل کی گہرائیوں سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ باوجود اس کے کہ ایمان و یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے پھر بھی خداوند تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ مسئلہ معاد کا اپنی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کریں تاکہ ان کا وہ ایمان جو از روئے علم تھا "عین الیقین" اور شہود سے بدل جائے۔

لیکن اس سبب سے کہ حواریوں کے مطالبہ کا ظاہری طور پر جو مطلب نکلتا تھا وہ بہتا ہوا معلوم ہوتا تھا لہٰذا حضرت عیسیٰ نے اسے بہانہ جوئی پر محمول کیا اور ان پر اعتراض کیا، لیکن جب انہوں نے کافی وضاحت کے ساتھ اپنا مقصد روشن کر دیا تو حضرت عیسیٰ نے بھی ان کی بات کو تسلیم کر لیا۔

۲۔ ھَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ سے کیا مراد ہے؟ سلسلہ طور پر ابتدا میں یہ جملہ یہی معنی دیتا ہے کہ حواریین نزول مائدہ کے سلسلے میں قدرت خدا میں شک رکھتے تھے لیکن اس کی تفسیر میں اسلامی مفسرین کے بعض بیانات جالب نظر ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ درخواست انہوں نے ابتدائے کار میں کی تھی، جب کہ وہ مکمل طور پر صفات خداوندی سے آشنا نہیں ہوئے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان کی مراد یہ تھی کہ کیا خداوند تعالیٰ کے نزدیک اس میں مصلحت ہے کہ وہ اس قسم کا مائدہ ہم پر نازل کر دے۔ جیسا کہ مثال کے طور پر ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ میں اپنی ساری دولت فلاں شخص کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ یعنی میں اس میں مصلحت نہیں سمجھتا، نہ یہ کہ میں قدرت نہیں رکھتا۔ تیسرا یہ کہ " یستطیع " کا معنی "یستجیب " ہو۔ کیونکہ مادہ طوع کا معنی انقیاد و مطیع ہونا ہے اور جب وہ باب استفعال میں چلا جائے تو پھر اس سے یہ مطلب لیا جاسکتا ہے۔ اس بنا پر اس جملے کا یہ معنی ہوگا کہ کیا تیرا پروردگار ہماری اس بات کو قبول کرے گا کہ آسمانی مائدہ ہم پر نازل کرے۔

۳۔ یہ آسمانی مائدہ کیا تھا: یہ آسمانی مائدہ جن چیزوں پر مشتمل تھا ان کے بارے میں قرآن میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لیکن احادیث میں کہ جن میں سے ایک حدیث امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھانا چند روٹیاں اور چند مچھلیاں تھیں۔ شاید اس قسم کے معجزے کے مطالبے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے بنی اسرائیل پر مائدہ آسمانی اُترا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ سے اسی قسم کا تقاضا کیا۔

۴۔ کیا ان پر کوئی مائدہ نازل ہوا: باوجود اس کے کہ مذکورہ بالا آیات نزول مائدہ کو تقریباً صراحت کے ساتھ بیان کر رہی ہیں کیونکہ خداوند تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے نزول مائدہ کی تردید کی ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ جب حواریین نے نزول مائدہ کے بعد کی سخت ذمہ داری کا احساس کیا تو انہوں نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا لیکن حق بات یہ ہے کہ مائدہ ان پر نازل ہوا۔

۵۔ عید کسے کہتے ہیں: عید لغت میں مادہ عود سے ہے جس کے لغوی معنی بازگشت (لوٹ آنا) کے ہیں۔ اسی لیے ان دنوں کو جن میں کسی قوم و ملت کی مشکلات برطرف ہو جاتی ہیں، اور وہ پہلے جیسی کامیابیوں اور راحتوں کی طرف پلٹ آتی ہے، عید کہا جاتا ہے۔ اسلامی عیدوں کو اس مناسبت سے عید کہا جاتا ہے کہ ماہ مبارک رمضان میں ایک مہینے کی اطاعت کے بعد یا حج کا عظیم فریضہ انجام دینے کی وجہ سے روح میں پہلی سی فطری صفائی اور پاکیزگی لوٹ آتی ہے اور وہ آلودگیاں جو خلاف فطرت ہیں ختم ہو جاتی ہیں۔ چونکہ نزول مائدہ کا دن کامیابی، پاکیزگی اور خدا پر ایمان لانے کی طرف بازگشت کا دن تھا لہٰذا حضرت عیسیٰؑ نے اس کا نام عید رکھا۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے مائدہ کا نزول اتوار کے دن ہوا تھا لہٰذا شاید عیسائیوں کے نزدیک اتوار کے احترام کی علتوں میں سے ایک علت یہ بھی ہو۔

حضرت علی علیہ السلام سے نقل شدہ ایک روایت میں ہے کہ:۔

"و کل یوم لا یعصی اللہ فیہ فھو یوم عید"

یعنی ہر وہ دن کہ جس میں خداوند تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے وہ عید کا دن ہے۔[1]

---

[1] نہج البلاغۃ کلمات قصار ۴۲۸۔

یہ بھی اسی امر کی طرف اشارہ ہے کیونکہ گناہ کو چھوڑنے کا دن کامیابی، پاکیزگی اور فطرت اولیہ کی طرف لوٹنے کا دن ہے۔

۶۔ عذاب شدید کس بنا پر تھا؟: یہاں پر ایک اہم نکتہ ہے جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ جب ایمان مرحلہ شہود اور علم الیقین کو پہنچ جائے یعنی حقیقت کو آنکھ سے دیکھ لے اور کسی قسم کے تردد اور وسوسے کی گنجائش باقی نہ رہے تو پھر ایسے شخص کی ذمہ داری اور مسؤلیت بہت ہی زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اب یہ وہ سابق انسان نہیں ہے کہ جس کا ایمان پایۂ شہود پر نہیں تھا اور کبھی کبھار اس میں وسوسے پیدا ہو جاتے تھے۔ وہ ایمان اور ذمہ داری کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ اب اس کی تھوڑی تقصیر اور کوتاہی بھی مجازات شدید اور سخت سزا کا سبب بنے گی۔ اسی لیے تو انبیاء اور اولیاء خدا کی مسؤلیت بہت سخت تھی اس طرح کہ وہ ہمیشہ اس سے وحشت و پریشانی میں رہتے تھے۔ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اس قسم کی باتوں کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اصولی طور پر ہر کسی کو معلوم ہے کہ اس کے شہر اور علاقے میں کئی بھوکے ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں اس سے باز پرس ہوگی۔ لیکن جب وہ اپنی آنکھ سے دیکھ لے کہ ایک بے گناہ انسان بھوک کی شدت سے فریاد کر رہا ہے تو اب اس کی جوابدہی کی صورت بدل جائے گی اور سخت تر ہو جائے گی۔

۷۔ عہد جدید اور مائدہ: موجودہ چاروں انجیلوں میں مائدہ کے بارے میں اس طرح کی گفتگو نہیں ہے جس طرح کہ ہم قرآن مجید میں دیکھتے ہیں۔ اگرچہ انجیل یوحنا باب ۲۱ میں ایک بیان ایسا موجود ہے کہ جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف سے لوگوں کو کھانا کھلانے اور ان کی طرف سے روٹی اور مچھلی کے ساتھ معجزانہ طور پر دعوت کا ذکر کیا گیا ہے لیکن تھوڑی سی توجہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا مائدہ آسمانی اور حواریوں کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے[1]

کتاب "اعمال رسولان" میں بھی جو "عہد جدید" کی ایک کتاب ہے، پطرس نامی ایک حواری پر نزول مائدہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ بھی اس بحث سے الگ چیز ہے کہ جس کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں، لیکن کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ بہت سے ایسے حقائق ہیں کہ جو حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل ہوئے تھے مگر وہ موجودہ انجیلوں میں نہیں ہیں، ایسے ہی جیسا کہ بہت سے ایسے مطالب ہیں جو انجیلوں میں لکھے ہوئے ہیں مگر وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پر نازل نہیں ہوئے تھے لہٰذا اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے نزول مائدہ کے واقعہ کے سلسلے میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوگی[2]

۱۱۶۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَ اُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَ

---

[1] الہدیٰ الی دین المصطفیٰ۔ جلد ۲ صفحہ ۲۲۹۔

[2] حوالہ سابقہ۔

لَآ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ ○

۱۱۷۔ مَا قُلۡتُ لَهُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِهٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیۡ وَرَبَّکُمۡ ۚ وَ کُنۡتُ عَلَیۡهِمۡ شَهِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡهِمۡ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡهِمۡ ؕ وَاَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَهِیۡدٌ ○

۱۱۸۔ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ○

ترجمہ

۱۱۶۔ وہ وقت یاد کرو جب خداوند تعالیٰ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ دو خدا بنا لو۔ وہ جواب دیں گے کہ تیری ذات پاک ہے، مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جو میرے لائق نہیں ہے۔ اگر میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوگی تو اس کا تجھے ضرور علم ہوگا۔ تُو ان سب باتوں کو جانتا ہے کہ جو میرے نفس و روح میں ہیں۔ لیکن میں جو کچھ تیری ذات پاک میں ہے اُسے نہیں جانتا، کیونکہ تو تمام اسرار اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔

۱۱۷۔ مجھے تو نے جس کام پر مامور کیا تھا میں نے اُس کے سوا اُن سے اور کوئی بات نہیں کہی تھی۔ میں نے تو اُن سے یہی کہا تھا کہ اُس خدا کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں تو اس وقت تک ہی اُن کا نگران اور گواہ تھا جب تک کہ میں اُن کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھا لیا تو پھر تُو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔

۱۱۸۔ (اس صورت میں) اگر تُو انہیں سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں (اور وہ تیری سزا سے بچ نکلنے کی قدرت نہیں رکھتے) اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو توانا و حکیم ہے (نہ تیری سزا عدم حکمت کی نشانی ہے اور نہ ہی تیری بخشش کمزوری کی علامت ہے)۔

تفسیر

حضرت مسیح کی اپنے پیروکاروں کے شرک سے بیزاری

یہ آیات قیامت کے دن خدا کی حضرت مسیحؑ سے گفتگو کے بارے میں ہیں اور دلیل اس کی یہ ہے کہ بعد کی چند آیات میں ہے کہ:

هذا یوم ینفع الصّدقین صدقهم

آج کا دن وہ دن ہے کہ جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ دے گی۔

اور یہ بات مسلم ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

اس کے علاوہ (فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم) کا جملہ اس پر دوسری دلیل ہے کہ یہ گفتگو مسیحؑ کی نبوت و رسالت کا زمانہ گزرنے کے بعد کی ہے اور آیت کی ابتدا "قال" کے جملے کے ساتھ کرنا کہ جو فعل ماضی کے لیے ہے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا کیونکہ قرآن میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ قیامت سے مربوط مسائل زمان ماضی کی شکل میں بیان کیے گئے ہیں اور یہ چیز قیامت کے قطعی و یقینی ہونے کی دلیل ہے یعنی اس کا زمانہ آئندہ میں واقع ہونا ایسا مسلم ہے گویا کہ وہ زمانہ ماضی میں واقع ہو چکا ہے لہٰذا اسے فعل ماضی کے صیغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

بہرحال پہلی آیت یہ کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ قیامت کے دن حضرت عیسیٰؑ سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ اپنا معبود قرار دو اور ہماری پرستش کرو (و اذ قال اللّٰه یٰعیسی ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی و امی الٰهین من دون اللّٰه)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی ہے بلکہ صرف توحید اور عبادتِ خدا کی دعوت دی ہے۔ لیکن اس استفہام کا مطلب یہ ہے کہ اُن سے اُن کی اُمت کے سامنے اقرار لے کر اُن کی اُمت کا جرم ثابت کیا جائے۔

مسیح علیہ السلام اس سوال کے جواب میں انتہائی احترام کے ساتھ چند جملے کہیں گے۔

۱۔ پہلے خداوند تعالیٰ کو ہر قسم کے شریک و شبیہ سے پاک بیان کرتے ہوئے کہیں گے: اے خدا! تو ہر قسم کے شریک سے پاک ہے (قال سبحٰنک)۔

۲۔ کس طرح ممکن ہے کہ میں ایسی بات کہوں جو میرے لیے شائستہ اور مناسب نہیں ہے (و ما یکون لی ان اقول ما لیس لی بحق)۔

حقیقت میں نہ صرف اس بات کے کہنے کی وہ اپنے سے نفی کرتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ بنیادی طور پر میں اس قسم کا کوئی حق ہی نہیں رکھتا اور اس قسم کی گفتگو میرے مرتبہ و مقام کے ساتھ ہرگز سازگار ہی نہیں۔

۳۔ اس کے بعد پروردگار عالم کے علم بے پایاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: میری گواہ یہ حقیقت ہے

کہ اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو تجھے اس کا علم ضرور ہوتا کیونکہ تو اس سے بھی آگاہ ہے جو میری روح کے اندر ہے جب کہ میں اس سے بے خبر ہوں جو تیری ذات پاک میں ہے۔ کیونکہ تو علام الغیوب ہے اور تمام رازوں اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے (ان کنت قلته فقد علمته تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک انک انت علام الغیوب)[1]۔

۴۔ میں نے جو بات ان سے کہی ہے وہ صرف وہی تھی جس کے لیے تو نے مجھے مامور کیا تھا اور وہ یہ کہ میں انہیں تیری عبادت کی طرف دعوت دوں اور ان سے کہوں کہ اس خدائے یگانہ کی پرستش کرو کہ جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے (ما قلت لهم الا ما امرتنی به ان اعبدوا الله ربی وربکم)۔

۵۔ اور جس وقت تک میں ان کے درمیان رہا ان کا نگران و گواہ تھا، اور میں نے انہیں راہ شرک اختیار نہیں کرنے دیا، لیکن جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اٹھا لیا تو پھر تو ہی ان کا نگران و نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے (وکنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم وانت علی کل شئ شهید)[2]۔

۶۔ ان تمام باتوں کے باوجود پھر بھی حکم تو تیرا ہی چلے گا اور جو تو چاہے گا وہی ہو گا۔ اب اگر تو انہیں ان کے اس عظیم انحراف پر سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور وہ تیری اس سزا سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکیں گے اور تیرا یہ حق تیرے نافرمان بندوں کے لیے ثابت ہے اور اگر تو انہیں بخش دے اور ان کے گناہوں کی طرف سے چشم پوشی کرے تو تو توانا و حکیم ہے نہ تو تیری بخشش ہی کمزوری کی علامت ہے اور نہ ہی تیری سزا حکمت و حساب سے خالی ہے (ان تعذبهم فانهم عبادک وان تغفر لهم فانک انت العزیز الحکیم)۔

دو سوال اور ان کا جواب

۱۔ کیا عیسائیوں کی تاریخ میں کہیں دیکھا گیا ہے کہ وہ مریم کو اپنا معبود قرار دیتے ہوں۔ یا یہ کہ وہ صرف تثلیث یعنی تین خداؤں "باپ خدا"، "بیٹا خدا" اور "روح القدس" کے قائل تھے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ان کے نظریہ کے مطابق "روح القدس"، "باپ خدا" اور "بیٹا خدا" کے درمیان واسطہ ہے اور وہ مریم کے علاوہ ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ عیسائی حضرت مریم کو خدا تو نہیں جانتے تھے لیکن اس کے باوجود اُن کے اور ان کے مجسمے کے سامنے مراسم عبادت سرانجام دیتے رہتے تھے جیسا کہ بت پرست بتوں کو خدا نہیں سمجھتے تھے پھر بھی انہیں عبادت میں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور زیادہ واضح الفاظ میں "الله" بمعنی خدا اور "إله" بمعنی معبود میں فرق ہے، عیسائی جناب مریم کو إله یعنی معبود جانتے تھے نہ کہ خدا۔

---

[1] یہاں پر لفظ نفس کا اطلاق روح اور جان کے معنی میں نہیں ہے بلکہ نفس کا ایک معنی ذات ہے (جیسے کہتے ہیں وہ بنفس نفیس آئے)۔

[2] "توفی" کے معنی کے بارے میں اور یہ کہ اس سے مراد مرنا نہیں ہے، سورہ آل عمران کی آیہ ۵۵ کے ذیل میں صفحہ ۴۱ پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔ (جلد ۲ اردو ترجمہ)۔

ایک مفسر کی تعبیر کے مطابق اگرچہ کوئی عیسائی فرقہ لفظ الٰہ اور معبود کا اطلاق جناب مریم پر نہیں کرتا بلکہ انہیں صرف خدا کی ماں سمجھتے ہیں، لیکن عملی طور پر اس کے سامنے خضوع وخشوع اور مراسم عبادت بجا لاتے ہیں، چاہے یہ نام ان کے لیے رکھیں یا نہ رکھیں۔ اس کے بعد وہ مزید کہتا ہے کہ کچھ ہی عرصہ پہلے کی بات ہے کہ بیروت میں عیسائیوں کے مجلہ "مشرق" کے ساتویں سال کے نویں شمارے میں پاپ پیوس نہم کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر حضرت مریم کی شخصیت کے بارے میں چند قابل ملاحظہ مطالب منتشر ہوئے تھے اس شمارہ میں پوری صراحت کے ساتھ لکھا تھا کہ مشرقی گرجوں میں بھی مغربی گرجوں کی طرح حضرت مریم کی عبادت کی جاتی ہے۔ اسی مجلہ کے پانچویں سال کے چودھویں شمارے میں ایک مقالہ انستاس کرملی کے قلم سے لکھا ہوا درج تھا جس میں یہ کوشش کی گئی تھی کہ حضرت مریم کی عبادت کے مسئلہ کے سلسلہ میں عہد عتیق اور تورات سے بھی کوئی دلیل پیدا کی جائے۔ چنانچہ وہ سانپ (شیطان) اور عورت (حوا) کی دشمنی کی داستان کو مریم کے عنوان سے تفسیر کرتا ہے۔ اس بنا پر حضرت مریم کی پرستش اور عبادت ان میں موجود ہے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ایسے الفاظ میں جس سے شفاعت کی بو آتی ہے اپنی اُمت کے مشرکین کے بارے میں کیوں گفتگو کرتے ہیں اور یہ کیوں عرض کرتے ہیں کہ اگر تو انہیں بخش دے تو تو عزیز و حکیم ہے۔

اس کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ کا ہدف شفاعت ہوتا تو آپ یوں فرماتے کہ (انك انت الغفور الرحیم) کیونکہ خدا کا غفور و رحیم ہونا مقام شفاعت کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کی عزیز و حکیم کے ساتھ توصیف کر رہے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے شفاعت اور بخشش کی درخواست منظور نہیں ہے بلکہ اس میں ہدف اصلی اپنی ذات سے ہر قسم کے اختیار کی نفی کرنا اور معاملہ کو پروردگار کے سپرد کرنا ہے یعنی یہ کام تیرے ہی ہاتھ میں ہے اگر چاہے تو بخش دے اور اگر چاہے تو سزا دے دے اگرچہ نہ تیری سزا بغیر دلیل کے ہے اور نہ ہی تیری بخشش بغیر علت وسبب کے ہے اور ہر حالت میں میری قدرت و توانائی سے تو باہر ہی ہے۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے درمیان کسی گروہ نے اپنے اشتباہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے توبہ کی راہ اختیار کر لی ہو اور یہ جملہ اُس گروہ کے بارے میں ہو۔

۱۱۹۔ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

لہ تفسیر المنار جلد ہفتم صفحہ ۲۶۳۔

۱۲۰۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۱۱۹۔ خدا کہتا ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی فائدہ بخشے گی۔ ان کے لیے جنت کے باغات ہیں جن کے (درختوں) کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، خدا اُن سے راضی و خوشنود ہوگا اور وہ خدا سے راضی اور خوشنود ہوں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

۱۲۰۔ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان تمام چیزوں کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

عظیم کامیابی

روزِ قیامت خداوند تعالیٰ کی حضرت عیسیٰؑ سے گفتگو جس کی تشریح گذشتہ آیات میں ہو چکی ہے کے ذکر کے بعد اس آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس گفتگو کے بعد یوں فرماتا ہے: آج کا دن وہ دن ہے جس میں سچوں کو اُن کی سچائی فائدہ دے گی (قال اللّٰه هٰذا يوم ينفع الصّٰدقين صدقهم)۔

یقیناً اس جملے میں صدق و راستی سے مراد دنیا میں گفتار و کردار اور راستی و سچائی ہے جو آخرت میں مفید ہوگی ورنہ آخرت کی سچائی اور راستی جو کہ محل تکلیف ہی نہیں ہے وہ کوئی بھی فائدہ نہیں دے گی اس کے علاوہ اس دن کی تو حالت و کیفیت ہی ایسی ہوگی کہ کوئی شخص سچائی کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہ سکے گا۔ یہاں تک کہ سب ہی گنہگار و خطاکار اپنے اپنے اعمال بد کا اعتراف کریں گے اور یوں اس دن جھوٹ بولنے کا کوئی وجود ہی نہ ہوگا۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا اور اپنی رسالت کا کام انجام دیا اور سچائی اور درستی کے سوا انہوں نے اور کوئی راستہ اختیار نہیں کیا، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے سچے پیرو یا باقی تمام انبیاء علیہم السلام کے سچے پیروکار کہ جو اس دنیا میں سچائی کی راہ پر گامزن ہوئے۔ وہ اپنے اعمال سے پوری طرح بہرہ مند ہوں گے۔

ضمناً اس جملے سے اجمالی طور پر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدق و راستی میں تمام نیکیوں کا خلاصہ آجاتا ہے۔ گفتار میں

صداقت و راستی اور عمل میں صداقت و راستی اور قیامت کے دن صرف صداقت و راستی ہی وہ سرمایہ ہے کہ جو کام آئے گا۔ اس کے علاوہ اور کچھ کام نہیں آئے گا۔

اس کے بعد سچوں کو ملنے والی جزا کے بارے میں یوں بیان کرتا ہے: ان کے لیے بہشت کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (لھم جنٰت تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھا ابدًا)۔

اور اس مادی نعمت سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں (رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ)۔

اور اس میں شک نہیں کہ یہ عظیم نعمت جو مادی اور معنوی نعمت کی جامع ہے بہت بڑی کامیابی شمار ہوگی (ذٰلک الفوز العظیم)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں بہشت کے باغوں کا اس کی تمام نعمتوں کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد خدا کی اپنے بندوں سے خوشنودی اور بندوں کی خدا سے خوشنودی کی نعمت کا ذکر ہے اور اس کے بعد (ذٰلک الفوز العظیم) کا جملہ ہے۔ اس سے اس حقیقت کی نشاندہی ہوتی ہے کہ طرفین کی یہ رضایت و خوشنودی کس قدر اہمیت کی حامل ہے (خدا کی بندوں سے خوشنودی اور بندوں کی خدا سے خوشنودی)۔

کیونکہ عین ممکن ہے کہ انسان اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتوں میں غرق ہو لیکن جب وہ یہ احساس کرے گا کہ اس کا مولیٰ اور اس کا معبود و محبوب اس سے ناراض ہے تو وہ تمام نعمتیں اس کی روح کے لیے تلخی اور اذیت کا سبب بن جائیں گی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کو ہر چیز میسر ہو لیکن جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس پر راضی اور قانع نہ ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ تمام نعمتیں اس کیفیت کے ساتھ اس کو خوش بخت نہیں رکھ سکتیں اور اسے اندرونی تکلیف ہمیشہ آزار میں رکھے گی اور روحانی اطمینان جو کہ سب سے بڑی نعمت الٰہی ہے اس سے چھین لے گی۔

علاوہ ازیں جب خدا کسی سے خوش ہوگا تو جو کچھ وہ چاہے گا خدا اسے دے گا اور جب یہ اس کو وہ کچھ دے دے، جو وہ چاہتا ہے، تو وہ بھی اس سے خوش ہوگا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ خدا انسان سے خوش ہو اور وہ بھی اپنے خدا سے راضی ہو۔

آخری آیت میں آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پر خدا کی حاکمیت و مالکیت کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اس کی قدرت کی عمومیت تمام چیزوں پر بیان ہوئی ہے (للہ ملک السمٰوٰت و الارض وما فیھن وھو علٰی کل شیء قدیر) یہ تذکرہ حقیقت میں خدا سے بندوں کی رضا و خوشنودی کی دلیل اور علت کے عنوان سے آیا ہے کیونکہ جو ہستی تمام چیزوں پر قدرت رکھتی ہو اور جو سراسر عالم ہستی پر حکومت رکھتی ہو وہ قدرت رکھتی ہے کہ جو کچھ اس کے بندے اس سے چاہیں وہ انہیں بخش دے اور انہیں خوشنود و راضی کرے۔

ضمنی طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے یہاں مریم کی پرستش کے سلسلے میں عیسائیوں کے عمل کے غلط ہونے کی طرف

اشارہ ہو کیونکہ عبادت کے لائق تو صرف وہ ذات ہے جو سراسر عالم آفرینش پر حکمران ہو نہ کہ مریم جو کہ مخلوق ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ۔

یہاں ــــ سورہ مائدہ ــــ کی تفسیر اختتام کو پہنچتی ہے۔

سورۂ انعام

مکّی سُورہ ———— ١٦٥ آیات

سورۂ انعام

شرک کی مختلف اقسام اور بت پرستی کے خلاف جہاد

کہا جاتا ہے کہ یہ انہترواں (۶۹) سورہ ہے جو مکہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔ البتہ اس کی چند آیات کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ یہ چند آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔ لیکن اُن روایات سے جو اہل بیت کے طریق سے ہم تک پہنچی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی تمام آیات ایک جگہ نازل ہوئی ہیں۔ اس بنا پر وہ سب کی سب "مکی" ہوں گی۔

اس سورہ کا بنیادی ہدف اور مقصد دوسری مکی سورتوں کی طرح ہی تین اصولوں "توحید" "نبوت" اور "قیامت" کی طرف دعوت دینا ہے۔ لیکن سب سے بڑھ کر اس میں مسئلہ توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ کیا گیا ہے اور وہ اس طور پر کہ اس سورہ کی آیات کے اہم حصّے میں روئے سخن مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہی ہے اور اسی مناسبت سے بعض اوقات بحث کا سلسلہ مشرکین کے اعمال و کردار اور بدعات تک پہنچ جاتا ہے۔

بہرحال اس سورہ کی آیات میں تدبر و تفکر جو انتہائی جاندار اور واضح و روشن دلائل پر مشتمل ہے، انسان کے اندر روح توحید و خدا پرستی کو زندہ کرتا ہے اور شرک کی بنیادوں کو اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ شاید اسی معنوی وابستگی اور مسئلہ توحید کی باقی سب مسائل پر اولیت کی بنا پر ہی اس سورہ کی تمام آیات یکجائی طور پر ایک ہی دفعہ نازل ہوئی ہیں۔

اور وہ روایات جو اس سورہ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس امر کے سبب سے ہی ہیں ہم بارہا پڑھتے ہیں کہ سورہ انعام کے نزول کے وقت ستر ہزار فرشتے اسے لے کر نازل ہوئے تھے، اور جو شخص اس سورہ کو پڑھے (اور اس کے سائے میں اس کی روح و جان سرچشمۂ توحید سے سیراب ہو) تو وہ تمام فرشتے اس کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سورہ کی آیات میں غور و فکر کرنا مسلمانوں میں سے روح نفاق و پراگندگی کو نکال باہر کرے اور کانوں کو سننے والا آنکھوں کو دیکھنے والا اور دلوں کو دانا بنا دے۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اس سورہ سے صرف اس کے الفاظ کے پڑھنے پر قناعت کرتے ہیں اور اپنی ذاتی اور خاص مشکلات کے حل کے لیے طویل و عریض تقریبات اور نشستیں منعقد کرتے ہیں جنہیں "ختم انعام" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مسلّم طور پر اگر ان تقریبات میں سورہ کے مضامین میں غور و فکر کیا جائے تو نہ صرف مسلمانوں کی شخصی و ذاتی مشکلات حل ہوں گی بلکہ ان کی عمومی مشکلات بھی حل ہو جائیں گی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ قرآن کو ایک ایسے سلسلہ اوراد کے طور سے دیکھتے ہیں کہ جس میں ایسی خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو راز ہی راز ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ہیں اور اس کے الفاظ کو پڑھنے کے علاوہ کچھ بھی تو غور نہیں کرتے۔ حالانکہ قرآن سارے

کا سارا سبق ہے اور مدرسہ، ایک پروگرام ہے اور بیداری، ایک رسالت ہے اور علم آگہی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ ۬ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ○

۲. هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ حمد و ستائش اُس خدا کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور نور کو ایجاد کیا لیکن کافر خدا کے لیے شریک و شبیہ قرار دیتے ہیں حالانکہ اس کی توحید اور یکتائی کی دلیلیں تخلیق کائنات میں ظاہر و عیاں ہیں۔

۲۔ وہ وہی ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اُس نے ایک مدت مقرر کی (تاکہ انسان درجہ کمال کو پہنچ جائے اور حتمی اجل اُسی کے پاس ہے (اور وہ اس سے آگاہ ہے) اس کے باوجود تم (مشرک لوگ اس کی توحید و یکتائی یا اس کی قدرت میں) شک و شبہ رکھتے ہو اور اس کا انکار کرتے ہو۔

تفسیر

اس سورہ کا خداوند تعالیٰ کی حمد و ستائش کے ساتھ آغاز ہوا ہے۔

پہلے عالم کبیر (آسمان و زمین) اور ان کے نظاموں کی پیدائش کے طریق سے اور اس کے بعد "عالم صغیر یعنی انسان" کی آفرینش کے راستے سے لوگوں کو اصل توحید کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ پہلے کہتا ہے: حمد و ثنا اس خدا کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (الحمد للہ الذی خلق السمٰوٰت و الارض)۔

وہ خدا جو نور و ظلمت دونوں کا مبداء ہے، دو خداؤں کی پرستش کا عقیدہ رکھنے والوں کے نظریے کے برخلاف وہی تنہا تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ (وجعل الظلمات و النور) لیکن مشرکین و کفار بجائے اس کے کہ اس نظام واحد سے توحید

کا سبق حاصل کریں اپنے پروردگار کے لیے شریک وشبیہ قرار دیتے ہیں (ثم الذین کفروا بربھم یعدلون)[1]۔
یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ مشرکین کے عقیدہ کو لفظ "ثم" کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جو کہ لغت عرب میں (ترتیب با فاصلہ کے لیے) بولا جاتا ہے، اور اس سے اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ابتدا میں تمام نوع بشر میں توحید ایک اصل فطری اور عقیدہ عمومی کی حیثیت سے موجود تھی اور شرک بعد میں اس اصل فطری سے ایک انحراف کی صورت میں پیدا ہوا۔

اس بارے میں کہ آسمان وزمین کی پیدائش کے سلسلہ میں لفظ "خلق" اور نور وظلمت کے بارے میں لفظ "جعل" کیوں استعمال کیا گیا ہے، مفسرین نے طرح طرح کے خیالات ظاہر کیے ہیں، لیکن وہ بات جو ذہن سے قریب تر معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ خلقت کسی چیز کے اصل وجود کے بارے میں ہے اور جعل ان خواص وآثار وکیفیات کے بارے میں ہوتا ہے جو اس کے بعد وجود پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ نور وظلمت تبعی پہلو رکھتے ہیں اس لیے انہیں جعل سے تعبیر کیا گیا ہے۔
یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام سے ایک حدیث اس آیت کی تفسیر میں نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:
یہ آیت حقیقت میں تین قسم کے انحراف کرنے والے گروہوں کو جواب دے رہی ہے۔ پہلا گروہ مادہ پرستوں کا ہے جو دنیا کو ازلی "قدیم" سمجھتے تھے اور خلق وآفرینش کے منکر تھے۔ دوسرا گروہ دو خداؤں کی پرستش کرنے والوں کا ہے جو نور وظلمت کو دو مستقل مبدا قرار دیتے تھے۔ تیسرا گروہ مشرکین عرب کا ہے، جو خدا کے لیے شریک وشبیہ کے قائل تھے۔ یہ ان کا رد بھی ہے[2]

کیا تاریکی بھی مخلوقات میں سے ہے

اُوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح نور خدا کی مخلوق ہے اسی طرح ظلمت بھی اس کی مخلوق ہے، حالانکہ فلاسفہ اور علم طبیعات (PHYSICS) کے علماء میں یہ مشہور ہے کہ "ظلمت" عدم نور کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ معدوم کو مخلوق کا نام نہیں دیا جا سکتا اس بنا پر زیر بحث آیت میں ظلمت کو کس طرح خدا کی مخلوق شمار کیا گیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ظلمت ہمیشہ ظلمت مطلقہ کے معنی میں نہیں ہوتی۔ بلکہ زیادہ تر فراواں قوی نور کے مقابلے میں بہت کم اور ضعیف نور کے لیے بھی ظلمت کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً ہم سب کہتے ہیں "تاریک رات" حالانکہ یہ بات مسلم ہے کہ رات میں ظلمتِ مطلقہ نہیں ہوتی۔ بلکہ رات کی تاریکی ہمیشہ کم رنگ ستاروں کے نور کی آمیزش

---

[1] یعدلون، مادہ عدل (بر وزن حفظ) سے ہے جس کے معنی مساوی اور ہم وزن کے ہیں اور یہاں شریک وشبیہ کا قائل ہونے کے معنی میں ہے۔
[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۰۱۔

رکھتی ہے یا دوسرے منابع نور سے ملی ہوئی ہوتی ہے اس بنا پر آیت کا معنی و مفہوم یہ ہوگا کہ خدا نے تمہارے لیے دن کی روشنی اور رات کی تاریکی قرار دی ہے کہ جن میں سے ایک کا نور بہت قوی ہے اور دوسرے کا نور بہت کمزور ہے اور یہ بات واضح و بدیہی ہے کہ اس قسم کی ظلمت مخلوق خدا میں سے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ تو صحیح ہے کہ ظلمت مطلقہ ایک ایسا امر ہے جسے عدم کہا جاتا ہے لیکن کوئی بھی امر معدوم جب مخصوص حالات میں واقع ہو تو حتماً اور یقیناً اس عدم کا سرچشمہ ایک امر وجودی ہی ہوتا ہے۔ یعنی وہ چیز جو ظلمت مطلقہ کو مخصوص حالات میں معین اہداف و مقاصد کے لیے وجود میں لاتی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وسائل وجودی سے استفادہ کرے۔ مثلاً ہم چاہتے ہیں کہ ایک مخصوص وقت کے لیے کمرے کو ایک عکس ظاہر کرنے کے لیے تاریک کریں، تو اس کے لیے ہم مجبور ہیں کہ کسی تدبیر سے نور کو روکیں تاکہ اس معین وقت میں تاریکی پیدا ہو جائے تو ایسی ظلمت مخلوق ہے (مخلوق بالتبع) اور اصطلاحی طور پر اگرچہ عدم مطلق مخلوق نہیں ہے لیکن عدم خاص وجود ہی کا ایک حصہ ہے اور وہ مخلوق ہے۔

نور رمز وحدت ہے اور ظلمت رمز پراگندگی

ایک دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ یہ آیات قرآن میں نور صیغہ مفرد کے ساتھ ہے اور ظلمت جمع کی صورت میں (ظلمات)۔

ممکن ہے کہ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ ظلمت (خواہ حسی ہو یا معنوی) ہمیشہ پراگندگیوں، جدائیوں اور دوریوں کا سرچشمہ ہوتی ہے جبکہ نور رمز وحدت و اجتماع ہے۔

ہم نے اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ہم گرمی کی کسی رات میں صحن کے درمیان یا بیابان کے اندر ایک چراغ روشن کرتے ہیں تو ہر قسم کے جانور تھوڑی سی دیر میں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور واقعی زندگی مختلف صورتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ لیکن جب ہم اس "چراغ" کو بجھا دیتے ہیں تو اُن میں سے ہر ایک کسی طرف چل دیتا ہے اور سب پراگندہ اور منتشر ہو جاتے ہیں۔ اجتماعی اور معنوی مسائل میں بھی یہی صورت ہے۔ علم، قرآن اور ایمان کا نور سرمایہ وحدت ہے اور جہل، کفر اور نفاق کی تاریکی پراگندگی کا سبب ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۃ خدا پرستی اور توحید کی بنیادوں کو دلوں میں مستحکم کرنے کے لیے پہلے انسان کو عالم کبیر کی طرف متوجہ کرتی ہے اور بعد والی آیت میں عالم صغیر یعنی انسان کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ اس سلسلے میں انتہائی حیرت انگیز مسئلہ یعنی اس کی خاک اور گیلی مٹی سے پیدائش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ وہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں گیلی مٹی سے پیدا کیا (ھو الذی خلقکم من طین)۔

یہ صحیح ہے کہ ہماری خلقت ہمارے ماں باپ سے ہوئی ہے نہ کہ خاک سے لیکن چونکہ سب سے پہلے انسان کی پیدائش خاک اور گیلی مٹی سے ہوئی تھی لہٰذا ہمیں اسی طرح خطاب کرنا درست ہے۔

اس کے بعد انسان کی عمر کے کمال کو پہنچنے کے مراحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اس کے بعد ایک مدت

مقرر کی کہ جس میں انسان روئے زمین میں پرورش پا کر کمال کو پہنچے (ثم قضیٰ اجلاً)۔

اجل اصل میں "مدت معین" کے معنی میں ہے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخری وقت یا موقع کو بھی اجل کہا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ اجلِ دَین آپہنچا یعنی قرض کی ادائیگی کا وقتِ آخر آپہنچا ہے۔ یہ جو موت کے آجانے کو اجل کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان کی عمر کا آخری لمحہ اس موقع پر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس بحث کی تکمیل کے لیے قرآن کہتا ہے: اجل مسمیٰ خدا کے پاس ہے (و اجل مسمی عندہ)۔

اس کے بعد کہتا ہے: تم مشرک لوگ اس پیدا کرنے والے کے بارے میں کہ جس نے انسان کو بے قدر و قیمت اور حقیر چیز یعنی گیلی مٹی سے پیدا کیا ہے اور تمہیں ایسے ایسے حیرت انگیز مرحلوں سے گزارا ہے، شک کرتے ہو اور انکار کا راستہ اختیار کرتے ہو۔ تم نے بتوں جیسی حقیر مخلوق کو خدا کا ہم پلہ قرار دے لیا ہے یا تم مردوں کے زندہ کرنے اور قیامت کے برپا کرنے کے بارے میں خداوند تعالیٰ کی قدرت میں شک و شبہ رکھتے ہو (ثم انتم تمترون)۔

اجل مسمیٰ کیا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ لفظ "اجل مسمیٰ" اور "اجلاً" آیت میں دو الگ الگ معانی کے لیے ہے اور یہ جو بعض نے دونوں کو ایک ہی معنی میں لیا ہے تو یہ لفظ "اجل" کے تکرار کے ساتھ، خصوصاً دوسری مرتبہ "مسمیٰ" کے ہوتے ہوئے کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔

اسی لیے مفسرین نے ان دونوں کے فرق کے بارے میں کئی شقیں کی ہیں لیکن جو کچھ قرآن کریم کی دوسری تمام آیات کے قرینے سے اور اسی طرح اُن روایات سے جو اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وسیلہ سے ہم تک پہنچی ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا فرق اس بات میں ہے کہ جب "اجل" اکیلا ہو تو یہ غیر حتمی عمر، مدت اور وقت کے معنی میں ہوتا ہے۔ اور "اجل مسمیٰ" حتمی عمر اور معین مدت کے معنی میں ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "اجل مسمیٰ" طبعی موت کو کہتے ہیں اور "اجل" وقت سے پہلے آنے والی موت ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ بہت سی موجودات اپنی طبعی و فطری ساخت اور ذاتی استعداد و قابلیت کے مطابق ایک طولانی مدت تک باقی رہ سکتی ہیں لیکن یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس مدت کے دوران کچھ ایسی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں جو انہیں ان کی آخری عمر طبیعی تک پہنچنے سے روک دیں، مثلاً ایک تیل سے جلنے والا چراغ، اس کے تیل کی مقدار کے پیش نظر ممکن ہے کہ بیس گھنٹے روشنی دینے کی استعداد رکھتا ہو۔ لیکن ایک آندھی کا جھونکا یا بارش کا چھینٹا یا اس کی نگہداشت نہ کرنا اس کی کوتاہ عمری کا سبب بن جائے۔

اگر چراغ کو کسی ایسی رکاوٹ کا سامنا نہ ہو اور تیل کے آخری قطرے تک جلتا ہوا خاموش ہو جائے تو وہ اپنی حتمی اجل کو پہنچ گیا ہے اور اگر اس سے پہلے ہی کچھ رکاوٹیں چراغ کی خاموشی کا سبب بن جائیں تو اس کی عمر کی مدت کو "اجل غیر حتمی" کہیں گے۔

ایک انسان کے بارے میں بھی معاملہ اسی طرح ہے۔ اگر اس کی بقا کے لیے تمام شرائط فراہم ہوں اور موانع برطرف ہوں تو اس کی ساخت اور استعداد اس بات کی مقتضی ہوگی کہ وہ ایک طولانی مدت تک زندگی بسر کرے، اگرچہ اس مدت نے آخر کار ختم ہو جانا ہے اور اس کی ایک حد ضرور ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ غذا میں بدپرہیزی کے اثر سے یا مختلف چیزوں کی عادت میں مبتلا ہونے یا خودکشی کرنے یا کچھ گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے اس مدت سے بہت پہلے ہی مر جائے تو موت کی پہلی صورت کو "اجل مسمی" اور دوسری صورت کو اجل غیر حتمی کہتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں حتمی اجل اس صورت میں ہے جب ہم تمام علل و اسباب پر نظر رکھیں اور اجل غیر حتمی اس صورت میں ہے جب صرف مقتضیات کی طرف دیکھیں۔ اس دونوں طرح کی اجل کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سے مطالب واضح ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ کہ ہم روایات میں پڑھتے ہیں کہ صلۂ رحمی عمر کو زیادہ اور قطع رحمی عمر کو کم کر دیتی ہے (یہاں عمر اور اجل سے مراد غیر حتمی اجل ہے)۔

ایک آیت میں ہے کہ:

"فاذا جاء اجلهم لا يستأخرون ساعة و لا يستقدمون"

جب انکی (موت) اجل آجاتی ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتی ہے اور نہ آگے[1]

تو یہاں اجل سے مراد وہی حتمی موت ہے۔

اس بنا پر یہ آیت اس موقع سے مربوط ہے جب انسان اپنی آخری عمر کو پہنچ گیا ہو۔ لیکن وہ موتیں جو قبل از وقت واقع ہو جائیں اُن پر اس آیت کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

اور ہر صورت میں اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ دونوں اجلیں خدا ہی کی طرف سے معین ہوتی ہیں، ایک مطلق طور پر اور دوسری مشروط اور معلق طریقے سے، بالکل اسی طرح جیسے کہ ہم کہتے ہیں کہ یہ چراغ بیس گھنٹوں کے بعد بلا شرط خاموش ہو جائے گا، اور یہ بھی ہم کہہ دیتے ہیں کہ اگر آندھی چل پڑی تو دو ہی گھنٹوں کے بعد بجھ جائے گا۔ یہ بات انسانوں، قوموں اور ملتوں کے بارے میں بھی اسی طرح ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص یا فلاں قوم فلاں مقدار عمر کے بعد قطعی و یقینی طور پر ختم ہو جائے گی اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ ظلم و ستم، نفاق و اختلاف، اور سہل انگاری و سستی اختیار کریں گے تو اس مدت کے ایک تہائی عرصے میں ہی ختم ہو جائے گی۔ دونوں اجلیں خدا کی طرف سے ہیں ایک مطلق ہے اور دوسری مشروط۔

امام صادق علیہ السلام سے اوپر والی آیت کے ذیل میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"هما اجلان اجل محتوم و اجل موقوف"

یہ دو قسم کی اجلوں کی طرف اشارہ ہے، اجل حتمی اور اجل مشروط۔

دوسری احادیث میں جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں اس بات کی تصریح ہو گئی ہے کہ اجل غیر حتمی (مشروط) آگے

---

[1] اعراف آیہ ۳۴۔

پیچھے ہو سکتی ہے لیکن اجل حتمی قابلِ تغیر نہیں ہے[1]

۳۔ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۖ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ○

ترجمہ

۳۔ اور آسمانوں اور زمین میں خدا تو وہی ہے جو تمہاری پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے اور آشکار کو بھی اور جو کچھ تم (انجام دیتے ہو اور) کسب کرتے ہو اس سے بھی باخبر ہے۔

تفسیر

اس آیت میں توحید اور خداوند تعالیٰ کی یگانگی کے سلسلے میں گذشتہ بحث کی تکمیل کی گئی ہے اور اُن لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو موجودات کی ہر نوع کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ خداؤں کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ بارش کا خدا، جنگ کا خدا، صلح کا خدا، آسمان کا خدا وغیرہ وغیرہ۔ کہتا ہے: وہی ہے وہ خدا کہ جس کی الوہیت تمام آسمانوں اور زمین پر حکومت کرتی ہے ــــ (وھو اللہ فی السمٰوٰت و فی الارض)[2]

یعنی اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ تمام چیزوں کا خالق وہی ہے تو ان سب کا مدبر و مدیر بھی وہی ہوگا۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین بھی خالق اور آفریدگار اللہ ہی کو جانتے تھے لیکن تدبیر و تصرف بتوں کے ہاتھ سمجھتے تھے۔

آیت انہیں جواب دیتی ہے کہ جو ذات خالق ہے تمام چیزوں میں تدبیر و تصرف بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خداوند تعالیٰ ہر جگہ حاضر ہے، آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور کوئی جگہ اُس سے خالی نہیں ہے یہ بات نہیں ہے کہ وہ جسم ہے یا اُس کا کوئی مکان ہے بلکہ وہ تمام جگہوں پر احاطہ رکھتا ہے۔

یہ بات ضروری ہے کہ جو ہر جگہ حکومت کرتا ہو اور ہر چیز کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہو اور وہ ہر جگہ حاضر ہو، وہ تمام اسرار اور پوشیدہ باتوں کو بھی جانتا ہے لہٰذا بعد والے جملے میں کہتا ہے کہ: ایسا خدا وہی ہے جو تمہارے پوشیدہ اور آشکار امور کو جانتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو اس سے بھی باخبر ہے (یعلم سرکم و جھرکم و یعلم ما تکسبون)۔

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ "سر" و "جھر" آیت میں انسانوں کے اعمال اور ان کی نیتوں پر بھی محیط ہے اس بناء پر

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۷۰۴۔

[2] اس جملے کی ترکیب کے سلسلہ میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ "ھو" مبتدا ہے اور "اللہ" خبر ہے، اور "فی السمٰوٰت ..... " کا جار مجرور اس فعل سے متعلق ہے جو لفظ اللہ سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت میں جملہ کا معنی اس طرح ہے "ھو المتفرد فی السمٰوٰت بالالوھیۃ"

" ماتکسبون " (جو کچھ انجام دیتے ہو) کی ضرورت نہیں ہے ۔ لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "کسب" عمل کے نتیجوں اور روحانی حالت کے معنی میں اچھے اور برے اعمال کا حاصل ہے ۔ یعنی وہ تمہارے اعمال اور نیتوں سے بھی باخبر ہے اور اُن کے اثرات سے بھی جو یہ اعمال تمہاری روح میں پیدا کرتے ہیں ۔ بہرحال اس جملہ کا ذکر انسانوں کے اعمال کے سلسلہ میں تاکید کے لیے ہوا ہے ۔

۴ ۔ وَمَا تَأْتِيهِمْ مِنْ آيَةٍ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ○

۵ ۔ فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ ۖ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنْبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ○

ترجمہ

۴ ۔ کوئی نشانی اور آیات خدا میں سے کوئی آیت اُن تک نہیں پہنچی مگر یہ کہ وہ اُس سے منہ پھیر لیتے ہیں ۔

۵ ۔ انہوں نے حق کا انکار کر دیا جب کہ وہ ان کی طرف آیا ، لیکن جس بات کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے بہت جلد انہیں اس کی اطلاع مل جائے گی اور وہ اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہو جائیں گے ۔

تفسیر

ہم بیان کر چکے ہیں کہ سورہ انعام میں زیادہ تر روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور قرآن مجید ان کی بیداری اور آگاہی کے لیے طرح طرح کے وسائل و ذرائع سے کام لیتا ہے ۔ یہ آیت اور بہت سی دوسری آیات جو اس کے بعد آئیں گی اسی موضوع سے متعلق ہیں ۔

اس آیت میں حق اور خدائی نشانیوں کے مقابلے میں مشرکین کے تکبر ، لاپرواہی اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے : وہ ایسے ہٹ دھرم اور لاپرواہ ہیں کہ پروردگار کی نشانیوں میں سے جس نشانی کو بھی دیکھتے ہیں فوراً اس سے منہ پھیر لیتے ہیں (وما تأتیھم من آیۃ من آیٰت ربھم الا کانوا عنھا معرضین)[1]

---

[1] یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ لفظ " آیۃ " نکرہ سیاق نفی میں ہے ، لہٰذا عمومیت کا فائدہ دے گا یعنی وہ کسی بھی آیت اور کسی بھی نشانی کے مقابلے میں نہیں ٹھہرتے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے ۔

یعنی ہدایت وراہ یابی کی سب سے پہلی شرط ہی جو کہ تحقیق و جستجو ہے ان میں موجود نہیں ہے۔ نہ صرف یہ کہ حق کو حاصل کرنے کا جوش وولولہ اور عشق اُن میں موجود نہیں ہے، کہ وہ ان پیاسوں کی طرح جو پانی کے پیچھے دوڑتے ہیں حق کی تلاش میں ہوں، بلکہ اگر صاف وشفاف پانی کا چشمہ بھی ان کے گھر کے سامنے جوش مارنے لگے، تو وہ اس کی طرف سے مُنہ پھیر لیں اور بالکل اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ خواہ یہ آیات ان کے پروردگار کی طرف سے ہی کیوں نہ ہوں (ربھم) اور ان کی تربیت وتکامل کے لیے ہی کیوں نہ نازل ہوئی ہوں۔

یہ صورت زمانہ جاہلیت اور مشرکین عرب میں ہی منحصر نہیں، اب بھی ہم بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ جو ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گئے ہیں لیکن وہ خدا اور مذہب کے بارے میں تحقیق وجستجو کرنے کی ایک لمحہ کے لیے بھی زحمت اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں یہ تو معمول بات ہے اگر اتفاق سے کوئی کتاب یا تحریر اس سلسلے کی ان کے ہاتھ میں آجائے تو اس کی طرف نگاہ تک نہیں کرتے، اور اگر کوئی شخص اس بارے میں اُن سے گفتگو کرے تو وہ سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ ہٹ دھرم جاہل اور بے خبر لوگ ہیں جو ممکن ہے بعض اوقات عالم کے لباس میں ملبوس ہوں۔

اس کے بعد ان کے اس عمل کے نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب حق ان کے پاس آیا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی حالانکہ اگر وہ پروردگار کی آیات اور نشانیوں میں غور وفکر کرتے تو وہ حق کو اچھی طرح سے دیکھ لیتے اور پہچان لیتے اور اُسے باور کر لیتے (فقد کذبوا بالحق لما جاء ھم) اور اس تکذیب اور جھٹلانے کا نتیجہ وہ بہت جلدی پالیں گے اور اس کی خبر کہ جس کا انہوں نے مذاق اڑایا تھا اُن تک پہنچ جائے گی (فسوف یأتیھم انبٰؤا ما کانوا بہ یستھزءون)۔

اوپر والی آیات میں درحقیقت کفر کے تین مراحل کی طرف اشارہ ہوا ہے جس میں مرحلہ بہ مرحلہ شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پہلا مرحلہ اعراض وروگردانی کا ہے اس کے بعد تکذیب اور جھٹلانے کا مرحلہ ہے اور بعد میں حقائق اور آیات خدا کے استہزاء تمسخر اور مذاق اڑانے کا مرحلہ ہے۔

یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان کفر کی راہ میں کسی ایک مرحلہ پر رکتا نہیں ہے، بلکہ جس قدر وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کی شدت انکار، عداوت، حق سے دشمنی اور خدا سے بیگانگی میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔

آیت کے آخر میں جو تہدید کی گئی ہے اس سے منظور یہ ہے کہ آئندہ چل کر جلدی یا بدیر بے ایمانی کا بُرا انجام دنیا اور آخرت میں ان کا دامن پکڑے گا۔ بعد کی آیات بھی اس تفسیر کی گواہ اور شاہد ہیں۔

۶۔ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ

بَعۡدِهِمۡ قَرۡنًا اٰخَرِيۡنَ ○

ترجمہ

۶۔ کیا انہوں نے دیکھا نہیں ہے کہ ہم نے کتنی گذشتہ اقوام کو ہلاک کیا ہے وہ قومیں کہ (جو تم سے کہیں زیادہ طاقتور تھیں اور) جنہیں ہم نے ایسی توانائیاں عطا کی تھیں جو تمہیں نہیں دی ہیں، ہم نے ان کی طرف پے در پے بارشیں بھیجیں اور ان کی (آبادیوں) کے نیچے نہریں جاری کیں (لیکن جب انہوں نے سرکشی اور طغیانی کی تو) ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیا، اور ان کے بعد ہم دوسری قوم کو وجود میں لے آئے۔

تفسیر

سرکشی کرنے والوں کی سرگذشت

اس آیت کے بعد قرآن بت پرستوں اور مشرکین کو بیدار کرنے کے لیے شرک و بت پرستی کے مختلف محرکات کی مناسبت سے ایک مرحلہ وار ترتیبی پروگرام پیش کرتا ہے۔ پہلے تو عامل غرور کو ختم کرنے کے لیے کہ جو طغیان و سرکشی کے اہم عوامل میں سے ایک عامل ہے کام کا آغاز کرتا ہے اور اقوام گذشتہ کی کیفیت اور ان کے دردناک انجام کی یاددہانی کرانے کے ساتھ اُن افراد کو کہ جن کی آنکھوں کے اُوپر غرور کا پردہ پڑا ہوا ہے تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: کیا انہوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم نے کیسی کیسی قومیں اُن سے پہلے ہلاک کر دیں وہ ایسی قومیں تھیں جنہیں ہم نے روئے زمین کی وہ توانائیاں دے رکھی تھیں جو تمہارے اختیار میں نہیں دیں (الم یروا کم اهلکنا من قبلهم من قرن مکنٰهم فی الارض مالم نمکن لکم)
اُن میں سے ایک یہ ہے کہ: ہم نے اُن کے لیے یکے بعد دیگرے برکت والی بارشیں بھیجیں (وارسلنا السماء علیهم مدرارًا)[1]۔

اور دوسرا یہ ہے کہ جاری پانی کی نہریں ان کی آبادیوں کے نیچے جاری کی ہیں اور ان کے اختیار میں دی ہیں (وجعلنا الانهٰر تجری من تحتهم)۔

لیکن جب انہوں نے سرکشی کا راستہ اختیار کر لیا تو ان امکانات میں سے کوئی چیز بھی انہیں خدائی سزا سے نہ بچا سکی اور ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے نیست و نابود کر دیا (فاهلکنٰهم بذنوبهم)۔

---

[1] مدرار۔ اصل میں "در" کے مادہ سے ہے جس کا معنی دودھ ہے۔ بعد میں دوسری بہنے والی چیزوں مثلاً بارش کے برسنے پر بھی بولا جانے لگا۔ اور مدرار مبالغہ کا صیغہ ہے اور ارسلنا السماء حقیقت میں زیادہ مبالغے کے لیے ہے۔

ان کے بعد ہم دوسری قوموں کو ان کی جگہ لے آئے (و انشأنا من بعدھم قرنا اٰخرین)۔

کیا گذشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ ان کے لیے باعث عبرت نہیں ہونا چاہیے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار اور مستی غرور سے ہوشیار نہیں ہوجانا چاہیے۔ کیا وہ خدا جس نے گذشتہ لوگوں کے لیے یہ عمل کیا ہے، یہ قدرت نہیں رکھتا کہ وہی ان کے ساتھ بھی کرے؟

چند اہم نکات

۱۔ "قرن" اگرچہ عموماً طویل زمانہ کے معنی میں (مثلاً سو سال، ستر سال یا تیس سال کے لیے) آیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی۔ جیسا کہ اہل لغت نے تصریح کی ہے ایسی جمعیت اور قوم کو بھی کہا جاتا ہے کہ جو ایک ہی زمانے میں موجود رہی ہو۔ اصولی طور پر قرن مادہ اقتران سے ہے اور نزدیکی کے معنی دیتا ہے اور چونکہ عصر واحد اور قریب والے زمانے کے لوگ ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں لہٰذا انہیں بھی اور ان کے زمانے کو بھی قرن کہا جاتا ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی آیات میں بارہا اس امر کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ مادی وسائل کی فراوانی کم ظرف افراد کے غرور وغفلت کا باعث بن جاتی ہے، کیونکہ وہ ان چیزوں کی اپنے پاس موجودگی کی صورت میں اپنے آپ کو پروردگار عالم کی طرف سے بے نیاز سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ وہ اس بات کی طرف سے غافل ہوتے ہیں کہ اگر ہر ہر لحظہ کے لیے اور ہر ہر ثانیہ کے لیے خداوند تعالیٰ کی کمک اور امداد اُن تک نہ پہنچے تو وہ نابود ہوجائیں اور بالکل ختم ہوجائیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

"اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰٓی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی"

انسان طغیان وسرکشی کرتا ہے جب وہ اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے[1]

۳۔ یہ تنبیہ صرف بت پرستوں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ قرآن آج بھی اس مشینی دور کی سرمایہ دار دنیا کو بھی کہ جو وسائل زندگی فراہم ہونے کی وجہ سے بادۂ غرور سے سرمست ہوچکی ہے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ گزرے ہوئے لوگوں کی حالت کو فراموش نہ کرے کہ وہ کن ہولوں کے اثر سے کس طرح تمام چیزوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، ہوسکتا ہے کہ تم بھی ایک اور عالمی جنگ کی ایک چنگاری سے سب کچھ ہاتھ سے دے بیٹھو اور اپنے صنعتی تمدن سے پہلے والے زمانے کی طرف پلٹ جاؤ۔ تمہیں اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ ان کی بدبختی کا سبب گناہ، ظلم وستم، ناانصافی اور عدم ایمان کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ یہی کچھ تمہارے معاشرے میں بھی آشکار ہوچکا ہے۔

حقیقتاً فراعنہ مصر، ملوک سبا، سلاطین کلدہ وآشور اور قیصران روم کی تاریخ اور ان کی بے حساب ناز ونعمت والی افسانوی زندگی کا مطالعہ اور اس کے بعد اس دردناک انجام کا مطالعہ کہ کس طرح ان کے ظلم اور کفر نے ان کی

---

[1] علق۔ آیہ ۶ و ۷۔

زندگی کے دفتر کو لپیٹ کر رکھ دیا، ہر شخص کے لیے اور ہم سب کے لیے ایک عظیم اور واضح درس عبرت ہے۔

۷۔ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوهُ بِأَيْدِيهِمْ لَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ ○

ترجمہ

۷۔ اگر ہم کاغذ پر (لکھی ہوئی کوئی) کتاب تجھ پر نازل کرتے اور وہ (دیکھنے کے علاوہ) اسے اپنے ہاتھوں سے چھوتے بھی تو پھر بھی کفار یہی کہتے کہ یہ تو کھلے جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرمی کا آخری درجہ

ان کے انحراف کے اسباب میں سے دوسری چیز تکبر اور ہٹ دھرمی ہے کہ جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے۔ کیونکہ عام طور پر متکبر لوگ ہی ہٹ دھرم ہوتے ہیں، کیونکہ تکبر انہیں حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہی بات ان کی ہٹ دھرمی کا سبب بن جاتی ہے، اور وہ ہر واضح دلیل اور روشن برہان کا اسی طرح سے انکار کرتے ہیں خواہ ان کا وہ انکار بدیہیات کے انکار تک پہنچ جائے، جیسا کہ ہم نے بارہا خود اپنی آنکھوں سے متکبر اور خودخواہ افراد میں اس بات کا مشاہدہ کیا ہے۔

قرآن اس مقام پر بعض بت پرستوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نضر بن حارث، عبداللہ بن ابی امیہ اور نوفل بن خویلد تھے انہوں نے پیغمبرؐ سے یہ کہا تھا کہ ہم صرف اس صورت میں ایمان لائیں گے جب خدا کی طرف سے چار فرشتوں کے ساتھ ہم پر خط نازل ہوگا۔ قرآن کہتا ہے: اگر اسی طرح جیسا کہ ان کا مطالبہ ہے کسی کاغذ کے صفحہ پر ہی کوئی تحریر یا اس کی مانند ہی کوئی اور چیز تم پر نازل کر دیں اور مشاہدہ کرنے کے علاوہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے چھوئیں بھی پھر بھی وہ یہی کہیں گے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا جادو ہے (ولو نزلنا علیک کتابًا فی قرطاس فلمسوہ بایدیھم لقال الذین کفروا ان ھٰذا الا سحر مبین)۔

یعنی ان کی ہٹ دھرمی کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ وہ روشن ترین محسوسات کا بھی یعنی ان باتوں کا بھی جو دیکھنے اور چھونے سے معلوم ہو سکتی ہیں انکار کر دیتے ہیں اور جادو کا بہانہ کرکے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں حقائق کے ثبوت کے لیے ان نشانیوں کے دسویں حصہ پر ہی قناعت کر لیتے ہیں اور اسے ہی قطعی اور مسلم جان لیتے ہیں۔ یہ بات صرف اس وجہ سے ہے کہ خودخواہی، تکبر اور شدید ہٹ دھرمی نے ان کی روح پر سایہ

ڈال رکھا ہے۔

ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "قرطاس" کا معنی ہر وہ چیز ہے کہ جس پر لکھتے ہیں خواہ وہ چیز کاغذ ہو یا چمڑا یا تختیاں آج قرطاس صرف کاغذ کو کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جن چیزوں پر لکھا جاتا ہے اُن میں سے کاغذ کا ہی سب سے زیادہ رواج ہے۔

۸۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ○

۹۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ○

۱۰۔ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۸۔ انہوں نے کہا کہ اس کے اُوپر کوئی فرشتہ کیوں نہ نازل ہوا (تاکہ لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے میں اس کی مدد کرتا) لیکن اگر ہم کوئی فرشتہ بھیج دیتے (اور اصل امر محسوس طور پر مشاہدہ میں آجاتا) تو پھر تو معاملہ ہی صاف ہو جاتا (اور ایسی صورت میں اگر وہ مخالفت کریں گے) تو پھر انہیں مہلت نہیں دی جائے گی (اور وہ سب کے سب ہلاک ہو جائیں گے)۔

۹۔ اور اگر اُسے فرشتہ قرار دیتے تو یقیناً اُسے بھی ایک مرد کی صورت میں ہی لاتے پھر بھی (ان کے خیال کے مطابق تو) ہم معاملہ کو اُن پر مشتبہ ہی چھوڑ دیتے جیسے وہ دوسروں پر معاملہ مشتبہ بناتے ہیں۔

۱۰۔ (اس حالت سے پریشان نہ ہو) تجھ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا تھا لیکن آخر کار جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے ان کے دامن کو پکڑ لیا (اور ان پر عذاب الٰہی نازل ہو گیا)۔

تفسیر

بہانہ تراشیاں

کفر اور انکار کے اسباب میں سے ایک اور سبب بہانہ جوئی ہے۔ اگرچہ بہانہ جوئی کی علت بھی دوسرے عوامل مثلاً تکبر و خود خواہی وغیرہ ہی ہے، لیکن یہ آہستہ آہستہ ایک منفی فکر کی شکل اختیار لیتی ہے اور یہ خود حق کے مقابلے میں سر تسلیم خم نہ کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

اُن بہانہ تراشیوں میں سے کہ جو مشرکین پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں کیا کرتے تھے اور قرآن مجید کی کئی آیات میں ان کی طرف اشارہ بھی ہوا ہے اور زیر بحث آیت میں بھی اس کا بیان ہوا ہے، ایک یہ ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ پیغمبر نے اتنے عظیم کام کو اکیلے ہی اپنے ہاتھ میں کیوں لے لیا ہے۔ اس ماموریت میں کوئی اور موجود، جو نوع بشر میں سے نہ ہو بلکہ فرشتوں کی جنس سے ہو، اس کی ہمراہی کیوں نہیں کرتا۔ کیا ایسا انسان کہ جو ہماری ہی جنس سے ہو تنہا بار رسالت کو اپنے کندھے پر اُٹھا سکتا ہے؟ (وقالوا لولا انزل علیه ملك)۔

حالانکہ آپ کی نبوت کے ثبوت میں واضح نشانیوں اور روشن دلائل کے ہوتے ہوئے اِن بہانہ تراشیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نہ تو فرشتہ انسان سے زیادہ قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی اس سے زیادہ رسالت کے لیے استعداد بلکہ انسان اُس سے کئی درجے زیادہ اہل ہے قرآن دو جملوں کے ساتھ کہ جن میں سے ہر ایک اپنے اندر ایک استدلال رکھتا ہے اُنہیں جواب دیتا ہے۔

پہلا یہ کہ اگر فرشتہ نازل ہو جائے اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائیں، تو اُن سب کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے گا (ولو انزلنا ملكا لقضي الامر ثم لا ينظرون)۔

لیکن یہ بات کہ فرشتے کے آنے اور اس کی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمراہی سے منکرین کیوں موت اور ہلاکت میں گرفتار ہوں گے، اس کی دلیل وہی ہے کہ جس کی طرف قبل کی چند آیات میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اگر نبوت کا محسوس طور پر مشاہدہ ہو جائے، یعنی فرشتے کے آنے سے غیب شہود میں بدل جائے اور تمام چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو پھر تو اتمام حجت کا آخری مرحلہ بھی پورا ہو جائے گا کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کسی دلیل کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ تو ان حالات میں اگر کوئی مخالفت کرے گا تو اس کی سزا اور عذاب یقینی ہو جائے گا۔ لیکن خداوند تعالیٰ بندوں پر اپنے لطف و رحمت کی وجہ سے اور اس غرض سے کہ اُن کے پاس نظر ثانی کے لیے موقع باقی رہے یہ کام نہیں کرتا۔ مگر خاص مواقع پر کہ جہاں وہ یہ جانتا ہے کہ مد مقابل اُسے قبول کرنے کی مکمل استعداد رکھتا ہے یا ایسے مواقع پر جہاں جانب مخالف نابود ہونے کا مستحق ہے، یعنی اُس نے ایسے عمل انجام دیئے ہوں کہ وہ خدائی سزا کا مستحق بن گیا ہو، تو اس موقع پر اس کے تقاضے کے مطابق ترتیب اثر دیا جاتا ہے اور جب وہ قبول نہیں کرتا تو اس کی نابودی کا حکم صادر ہو جاتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام رہبری اور لوگوں کی تربیت کے ذمہ دار ہونے اور ان کے لیے عملی نمونہ پیش کرنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لازماً نوع بشر میں سے ہوں اور ان کے ہم رنگ وہم صفات ہوں اور تمام غرائز وصفات انسانی اُن میں موجود ہوں کیونکہ فرشتہ، علاوہ اس کے کہ وہ انسان کے لیے دیکھنے کے قابل نہیں ہے، اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ انسان کے لیے نمونۂ عمل بن سکے کیونکہ نہ وہ انسان کی ضروریات اور تکالیف سے آگاہ ہے اور نہ ہی وہ اس کے غرائز وخواہشات سے آشنا ہے۔ اسی دلیل سے اس کی رہبری ایسے موجود کے لیے کہ جو ہر لحاظ سے اس سے مختلف ہے بالکل ناکارہ ہوگی۔

لہٰذا قرآن دوسرے جواب میں کہتا ہے: اگر ہم اُسے فرشتہ قرار دیتے اور اُن کے مطالبے پر عمل کرتے تو پھر بھی ہمارے لیے یہ لازم تھا کہ ہم انسان کی تمام صفات کو اس میں پیدا کرتے اور اسے صورت وسیرت میں مرد بناتے (ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلاً)۔[1]

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اُس سے واضح ہو جاتا ہے کہ "لجعلناہ رجلا" سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ ہم اسے صرف انسانی شکل دے دیں گے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے، بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم اُسے ظاہر وباطن کے لحاظ سے صفاتِ انسانی سے متصف کریں گے۔

اس کے بعد اس کا نتیجہ پیش کرتا ہے کہ اس حالت میں وہ ہم پر پھر انہی سابقہ اعتراضات کو دہراتے کہ کسی انسان کو رہبر کے طور پر کیوں مامور کیا گیا ہے اور حقیقت کو ہم پر پوشیدہ رکھا ہے (وللبسنا علیھم ما یلبسون)۔

لبس (بروزن درس) پردہ پوشی اور اشتباہ کاری کے معنی میں ہے اور لُبس (بروزن قفل) لباس پہننے کے معنی میں ہے پہلے کی ماضی لبس (بروزن ضرب) ہے اور دوسرے کی ماضی لَبِس (بروزن حسب ہے) اور یہ بات واضح ہے کہ آیت میں پہلے والا مفہوم، یعنی اگر ہم فرشتے کو بھیجتے تو ضروری تھا کہ وہ انسانی صورت وسیرت میں ہو، اس حالت میں ان کے عقیدے کے مطابق ہم نے لوگوں کو اشتباہ اور خطا میں ڈالا ہوتا اور وہ پھر ہمارے لیے انہی سابقہ نسبتوں کو دہراتے جس طرح کہ وہ خود نادان اور بے خبر لوگوں کو اشتباہ اور خطا میں ڈالتے ہیں اور حقیقت کا چہرہ اُن سے چھپاتے ہیں۔ اس بنا پر "لبس" اور پردہ پوشی کی خدا کی طرف نسبت ان کے زاویہ نگاہ سے ہے۔

آخر میں خداوند تعالیٰ پیغمبر کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے: ان کی مخالفت، ہٹ دھرمی اور سخت گیری سے پریشان نہ ہوں کیونکہ آپ سے پہلے کے پیغمبروں میں سے بھی بہت سے پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا، لیکن آخر کار جس چیز کا وہ تمسخر کیا کرتے تھے اُسی نے اُن کے دامن کو پکڑا اور ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا (ولقد استھزئ برسل من قبلک فحاق بالذین سخروا منھم ما کانوا بہ یستھزءون)۔

---

[1] جعلناہ کی ضمیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، اور اس کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے کہ جو پیغمبر کے ساتھ اس کی نبوت کو مستحکم کرنے کے لیے مبعوث ہو، دوسری صورت میں قرآن کے مطالبے پر عمل ہوگا اور پہلی صورت میں ان کے مطالبے سے بھی بڑھ کر صورت ہوگی۔

درحقیقت یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کی تسلی کا سبب بھی ہے کہ اس کی راہ میں ذرا سا تنزل بھی ان کے ارادہ میں نہ آئے اور ہٹ دھرم مخالفین کے لیے دھمکی بھی ہے کہ وہ اپنے کام کے بُرے اور دردناک انجام کو سوچ لیں ۔[1]

۱۱۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ○

ترجمہ

۱۱۔ (اے رسول) کہہ دو کہ تم زمین میں چلو پھرو۔ اس کے بعد (دیکھو اور) غور کرو کہ جو لوگ آیاتِ خداوندی کو جھٹلاتے تھے ان کا انجام کیا ہوا ؟۔

تفسیر

قرآن مجید نے اس مقام پر ان ہٹ دھرم اور خود خواہ لوگوں کو بیدار کرنے کے لیے ایک دوسرا راستہ انتخاب کیا ہے اس نے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ وہ انہیں کہیں کہ وہ زمین میں چلیں پھریں اور جو لوگ حقائق کو جھٹلاتے تھے ان کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ شاید وہ بیدار ہو جائیں قل سیروا فی الارض ثم انظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ گذشتہ لوگوں اور اُن قوموں کے آثار کو دیکھنا کہ جنہوں نے حقائق کو ٹھکرانے کی وجہ سے فنا اور نابودی کا راستہ اختیار کر لیا تھا، تاریخ کی کتابوں میں ان کے حالات کے پڑھنے سے کہیں بڑھ کر پُر اثر ہے کیونکہ یہ آثار حقیقت کو محسوس اور قابلِ لمس بناتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لفظ "انظروا" (دیکھو) استعمال کیا گیا ہے نہ کہ "تفکروا" (غور و فکر کرو)۔

ضمناً لفظ "ثم" کا ذکر جو عام طور عطف با فاصلہ زمانی کے لیے آتا ہے ممکن ہے اس حقیقت کی طرف متوجہ کرنے

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ "حاق" کا معنیٰ نازل ہوا اور وارد ہوا ہے۔ اور "ما کانوا بہ یستہزءون" سے مراد انبیاء کا عذاب الٰہی کی خبریں دینا ہے کہ جنہیں ہٹ دھرم دشمن ٹھٹھے میں اُڑا دیا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت نوح کا بار بار طوفان کی دھمکی دینا کہ جو بت پرست قوم کے لیے ایک مذاق کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس بنا پر آیت میں کلمہ "جزاء" کے مقدر ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض نے کہا ہے۔ بلکہ اس کا معنی اس طرح ہے: ان سزاؤں کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان پر نازل ہو گئیں۔

کے لیے ہو کر اپنی سیر اور فیصلہ میں جلدی نہ کریں بلکہ جب گزرے ہوئے لوگوں کے آثار کا مشاہدہ کریں تو تو مملا اور دقت کے ساتھ غور و فکر کریں پھر اس سے نتیجہ اخذ کرکے ان کے کام کا انجام آنکھوں سے دیکھیں۔

زمین میں سیر و سیاحت کرنے اور افکار کو بیدار کرنے میں اس کی غیر معمولی تاثیر کے بارے میں ہم جلد سوم میں سورہ آلِ عمران کی آیہ ۱۳۷ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔

۱۲۔ قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَیَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ لَا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

۱۳۔ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّیْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

ترجمہ

۱۲۔ کہہ دو کہ وہ چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں کس کی ہیں، کہہ دو کہ وہ سب خدا کی ہیں جس نے رحمت (اور بخشش) کو اپنے اوپر ضروری قرار دے لیا ہے (اور اسی دلیل سے) تم سب کو قطعی طور پر قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے جمع کرے گا صرف وہی لوگ ایمان نہیں لائیں گے جنہوں نے اپنا سرمایۂ حیات ضائع کر دیا ہے اور خسارے کا شکار ہیں۔

۱۳۔ اور جو کچھ رات اور دن میں ہے وہ بھی سب اسی کے لیے ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں پہلے کی طرح مشرکین سے بحث ہو رہی ہے۔ گذشتہ آیات میں مسئلہ توحید کو موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ اس آیت میں مسئلہ معاد پر بحث ہو رہی ہے۔ توحید کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ہی اس کے بعد مسئلہ قیامت اور معاد کو بڑے عمدہ طریقے سے بیان کیا جا رہا ہے۔ آیت سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ سوال کرنے والا اور جواب دینے والا دونوں ایک ہی ہیں جو ادبیات میں ایک خوبصورت طریقہ ہے۔

معاد پر استدلال

معاد پر استدلال کے لیے مقدمے کے طور پر دو باتیں کہی گئی ہیں:

۱۔ پہلے کہتا ہے: کہہ دو کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے کس کے لیے ہے (قل لمن ما فی السمٰوٰت والارض)۔ پھر اس کے بعد فوراً بلا فاصلہ کہتا ہے کہ تم خود زبانِ فطرت اور ان کی روح کا جواب دے دو کہ خدا کے لیے (قل للّٰہ)۔

اس مقدمہ کے مطابق تمام جہان خدا کی ملکیت ہے اور اس کی تدبیر اس کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ پروردگارِ عالم تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ وہی ہے وہ ذات کہ جس نے رحمت کو اپنے ذمے لیا ہے اور بے شمار نعمتیں سب کے لیے عام کر دی ہیں (کتب علی نفسہ الرحمۃ)۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا خدا اجازت دے کہ انسانوں کا رشتۂ حیات موت کے ذریعہ کلی طور پر منقطع ہو جائے اور کمال کی جانب اس کا سفر ختم ہو جائے۔ کیا یہ بات اس کے اصلاً فیاض ہونے اور اس کی رحمت واسعہ کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔ کیا وہ اپنے بندوں کے بارے میں کہ جن کا وہ مالک و مدبر ہے اس قسم کی بے مہری کر سکتا ہے کہ وہ ایک مدت کے بعد بالکل فنا ہو جائیں اور ان کا کوئی وجود ہی باقی نہ رہے۔

مسلمہ طور پر ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کی رحمت واسعہ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ موجودات کو خاص طور پر انسان کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے اور آگے بڑھائے جس طرح اپنی رحمت کے سائے میں ایک بے قدر و قیمت چھوٹے سے بیج کو تناور اور پھلدار درخت میں یا گلِ زیبا کی شاخ میں بدل دیتا ہے۔ جیسا کہ اپنے فیض و کرم کے سائے میں ایک بے قدر و قیمت نطفہ کو انسان کامل میں بدل دیتا ہے۔ اسی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو کہ جو بقا اور حیات جاودانی کی استعداد رکھتا ہے موت کے بعد نئی زندگی کے لباس میں اور زیادہ وسیع عالم میں لے آئے اور تکامل کی سیر ابدی میں اس کی رحمت کا ہاتھ اس کے سر پر ہو۔

لہٰذا ان دونوں مقدمات کے بعد کہتا ہے کہ مسلمہ طور پر تم سب کو قیامت کے دن کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے جمع کرے گا (لیجمعنکم الی یوم القیٰمۃ لا ریب فیہ)۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ آیت سوال سے شروع ہو رہی ہے جسے اصطلاح میں استفہام تقریری کہتے ہیں جس میں طرفِ مقابل سے اقرار لینا مطلوب ہوتا ہے اور چونکہ یہ مطلب فطرت کی نگاہ سے بھی مسلم تھا اور خود مشرکین بھی اس کے معترف تھے کہ عالم ہستی کی مالکیت بتوں سے تعلق نہیں ہے بلکہ خدا سے مربوط ہے، لہٰذا وہ خود ہی بلا فاصلہ سوال کا جواب دیتا ہے اور مختلف مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں یہ ایک اچھا طریقہ شمار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ معاد کے لیے دوسرے مقامات پر مختلف طریقوں سے مثلاً قانونِ عدالت، قانونِ تکامل اور حکمتِ پروردگار کے طریق سے استدلال ہوا ہے، لیکن رحمت کے ساتھ استدلال ایک نیا استدلال ہے، جو اوپر والی آیت میں موضوع بحث قرار پایا ہے۔

آیت کے آخر میں ہٹ دھرم مشرکین کے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ لوگ جو زندگی کے بازار تجارت میں اپنے وجود کا سرمایہ ضائع کر چکے ہیں وہ ان حقائق پر ایمان نہیں لائیں گے (الذین خسروا انفسھم فھم لا یؤمنون)۔

"کس قدر عجیب و غریب تعبیر ہے! بعض اوقات انسان مال یا مقام یا اپنے سرمائے میں سے کوئی اور چیز ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔ ان چیزوں میں اگرچہ اس نے نقصان کیا ہوتا ہے لیکن پھر بھی اس نے ایسی چیزیں اپنے ہاتھ سے دی ہیں جو اس کے وجود کا جزء نہیں ہیں۔ یعنی یہ چیزیں اس کے وجود سے باہر ہیں۔ لیکن سب سے بڑا خسارہ جسے حقیقی خسارے کا نام دیا جا سکتا ہے اس وقت ہوگا جب انسان خود اپنی اصل ہستی ہی کو ہاتھ سے دے بیٹھے اور خود اپنے وجود کو ہی داؤ پر لگا دے۔

حق کے دشمن اور ہٹ دھرم لوگ اپنی عمر کی پونجی اور اپنی فکر، عقل، فطرت اور تمام روحانی و جسمانی نعمات کو جنہیں راہ حق میں کام آنا چاہیے تھا، تاکہ وہ اپنے کمال کو پہنچ سکیں، کلی طور پر ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں نہ سرمایہ باقی رہتا ہے نہ سرمایہ دار یہ تعبیر قرآن مجید کی متعدد آیات میں آئی ہے اور یہ وہ ہلا دینے والی تعبیرات ہیں کہ جو منکرین حق اور گنہگاروں کا دردناک انجام واضح کر دیتی ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ابدی زندگی مومنین کے لیے تو مصداق "رحمت" ہے لیکن اُن کے غیر کے لیے ہے تو سوائے "زحمت و بدبختی" کے اور کوئی چیز نہ ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کا کام اسباب رحمت فراہم کرنا ہے۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے عقل دی اور اس کی رہبری اور رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے اور طرح طرح کی نعمتوں کو اس کے اختیار میں دے دیا اور حیاتِ جاوداں کی طرف سب کے لیے راہیں کھول دیں۔ یہ سب چیزیں بغیر استثناء کے رحمت ہیں۔

اب اگر راستے میں ان رحمتوں کے نتیجہ اور ثمر تک پہنچنے سے پہلے انسان خود راستے کو ٹیڑھا کرے اور تمام اسباب رحمت کو اپنے لیے زحمت میں تبدیل کر دے تو یہ بات ان اسباب کے رحمت ہونے کی نفی نہیں کرتی اور ملامت کا حقدار وہ انسان ہے کہ جس نے اسباب رحمت کو عذاب میں بدل لیا ہے۔

بعد والی آیت اصل میں گذشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہے کیونکہ پہلی آیت میں خداوند تعالیٰ کی تمام موجودات کے بارے میں مالکیت کی طرف اشارہ تھا اس طریق سے کہ وہ سب ایک اُفق مکان میں واقع ہیں لہٰذا فرمایا کہ خدا ان تمام چیزوں کا مالک ہے کہ جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

اب یہ آیت اس کے اُفق وسعت زمان میں واقع ہونے کے طریق سے اس کی مالکیت کی طرف اشارہ ہے۔ لہٰذا کہتا ہے: اور اس کے لیے ہے جو کچھ رات اور دن میں ہے (ولہ ما سکن فی اللیل والنھار)۔

حقیقت میں جہانِ مادہ اس سے یعنی زمان ومکان سے خالی نہیں ہے ۔ اور تمام موجودات جو ظرفِ زمان ومکان میں آتے ہیں یعنی تمام جہانِ مادہ اس کی ملکیت ہے اور یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ رات اور دن اس نظامِ شمسی کے ساتھ ہی مخصوص ہے بلکہ تمام موجوداتِ آسمان وزمین شب وروز رکھتے ہیں اور بعض میں ہمیشہ دن ہوتا ہے رات نہیں ہوتی اور بعض میں ہمیشہ رات ہوتی ہے دن نہیں ہوتا۔ مثلاً سورج میں ہمیشہ دن ہے کیونکہ وہاں روشنی ہی روشنی ہے اور تاریکی کا کوئی وجود نہیں ہے جبکہ بعض ستارے بجھے ہوئے اور بے نور ہیں وہ آسمان کہ جو ستاروں سے بہت دور ہیں وہاں ہمیشہ رات کی تاریکی چھائی رہتی ہے اور اوپر والی آیت ان سب پر صادق آتی ہے ۔

ضمنی طور پر اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "سکن" کسی موجود کا کسی چیز میں سکونت، توقف اور قرار پانے کے معنی میں ہے ، چاہے وہ موجود حالتِ حرکت میں ہو یا سکون میں ، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ہم فلاں شہر میں ساکن ہیں یعنی ہم وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اور مقیم ہیں چاہے ہم اس شہر کی سڑکوں پر حالتِ حرکت میں ہوں یا کہیں حالتِ سکون میں ہوں۔

آیت میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہاں "سکون" صرف حرکت کے مقابلے میں ہو اور چونکہ یہ دونوں امور نسبتی ہیں لہٰذا ایک کا ذکر ہمیں دوسرے سے بے نیاز کر دیتا ہے اس بنا پر آیت کا مطلب یوں ہو جاتا ہے کہ جو کچھ روز وشب اور افقِ زمان میں سکون وحرکت کی حالت میں ہے وہ سب خدا کی ملکیت ہے ۔

اور اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ آیت توحید کے استدلالات میں سے ایک استدلال کی طرف اشارہ ہو کیونکہ "حرکت" و "سکون" دو عارضی حالتیں ہیں ۔ جو حتمی طور پر حادث ہیں اور وہ قدیم وازلی نہیں ہو سکتیں کیونکہ حرکت عبارت ہے ایک چیز کا دو مختلف اوقات میں دو مختلف مکانوں میں ہونے سے اور سکون ہے ایک چیز کا دو زمانوں میں ایک معین مکان میں رہنا۔ اس بنا پر حرکت وسکون کی ذات میں سابقہ حالت کی طرف توجہ پوشیدہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ چیز کہ جو اس حالت سے پہلے دوسری حالت میں ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتی۔

اس گفتگو سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ "اجسام حرکت وسکون سے خالی نہیں ہیں" اور جو حرکت وسکون سے خالی نہ ہو وہ ازلی نہیں ہو سکتا "

لہٰذا تمام اجسام حادث ہیں اور چونکہ وہ حادث ہیں لہٰذا وہ پیدا کرنے والے کے محتاج ہیں (غور کیجئے گا)۔

لیکن چونکہ خدا جسم نہیں ہے لہٰذا وہ نہ حرکت رکھتا ہے نہ سکون ، نہ زمان رکھتا ہے نہ مکان ، اسی لیے وہ ازلی ابدی ہے اور آیت کے آخر میں توحید کا ذکر کرنے کے بعد خداوند تعالیٰ کی دو نمایاں صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے : اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے (وھو السمیع العلیم)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہانِ ہستی کی وسعت اور وہ موجودات کہ جو زمان ومکان کے افق میں قرار رکھتے ہیں کبھی بھی اس بات میں مانع نہیں ہیں کہ خدا اُن کے اسرار سے آگاہ ہو ۔ بلکہ وہ ان کی گفتگو سنتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک کمزور چیونٹی کی حرکت کو بھی جانتا ہے جو تاریک رات میں سیاہ پتھر کے اوپر ایک خاموش دور دراز کے درے کی گہرائی میں ہو اور اس کی ضروریات اور باقی تمام موجودات کی حاجات سے آگاہ ہے اور سب کے

اعمال اور کاموں سے مطلع ہے۔

۱۴۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

۱۵۔ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

۱۶۔ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ○

ترجمہ

۱۴۔ کہہ دو کیا میں غیر خدا کو اپنا ولی بناؤں جب کہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہ، وہ ہے کہ جو روزی دیتا ہے اور کسی سے روزی نہیں لیتا۔ تم کہہ دو کہ میں اس بات پر مامور ہوں کہ میں سب سے پہلے اس کے حکم کو تسلیم کرنے والا" (مسلمان) ہوں (اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ) مشرکین میں سے نہ ہونا۔

۱۵۔ کہہ دو کہ میں بھی اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بڑے دن (قیامت کے) عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۱۶۔ اس دن جس شخص کے اُوپر سے عذاب الٰہی ٹل جائے (تو یوں سمجھو کہ) خدا نے اپنی رحمت اس کے شاملِ حال کردی ہے اور یہ واضح کامیابی ہے۔

تفسیر

خدا کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے

بعض نے ان آیات کے لیے ایک شانِ نزول نقل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ میں سے کچھ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: اے محمدؐ! تو نے اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اس کام کا عامل سوائے فقر کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہم اس بات کے لیے حاضر ہیں کہ اپنا مال تیرے ساتھ بانٹ لیں اور تجھے بہت ثروت مند کردیں تاکہ تم ہمارے خداؤں سے دست بردار ہو جاؤ اور ہمارے اصلی دین کی طرف پلٹ آؤ تو اُوپر والی آیات نازل ہوئیں اور انہیں جواب دیا گیا[1]۔ البتہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وارد شدہ روایات کے مطابق اس سورہ

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

کی آیات مکہ میں یکجا طور پر نازل ہوئی ہیں اس بناء پر ہر ایک آیت کے لیے خاص اور علیحدہ شانِ نزول نہیں ہوسکتا لیکن اس سورہ کے نازل ہونے سے پہلے پیغمبر اور مشرکین کے درمیان گفتگو اور بحثیں ہوتی رہتی تھیں لہٰذا اس سورہ کی بعض آیات میں ان بحثوں کو ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ اس بناء پر کوئی امر مانع نہیں ہے کہ رسول اللہؐ اور مشرکین کے درمیان اس قسم کی باتیں ہوئی ہوں اور خداوند تعالیٰ ان آیات میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دے رہا ہو۔

بہرحال ان آیات میں بھی ہدف و مقصد اثباتِ توحید اور شرک و بت پرستی کے خلاف مبارزہ ہی ہے۔ مشرکین باوجود اس کے کہ وہ خلقتِ عالم کو خداوند تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہی مخصوص سمجھتے تھے لیکن انہوں نے بتوں کو اپنی پناہ گاہ سمجھ رکھا تھا اور بعض اوقات اپنی ہر ایک حاجت کے لیے کسی ایک بت کا سہارا لیتے تھے اور متعدد خداؤں (بارش کا خدا، نور کا خدا، ظلمت کا خدا، جنگ و صلح کا خدا، رزق و روزی کا خدا) کے قائل تھے اور یہ وہی ارباب انواع کا عقیدہ ہے جو قدیم یونان میں بھی وجود رکھتا تھا۔

قرآن اس قسم کے غلط نظریے کو ختم کرنے کے لیے پیغمبرؐ کو اس طرح حکم دیتا ہے: انہیں کہہ دو کہ کیا میں غیر خدا کو اپنا ولی و سرپرست اور پناہ گاہ قرار دے لوں حالانکہ وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا اور تمام موجودات کو رزق دینے والا ہے بغیر اس کے کہ خود اسے روزی کی ضرورت ہو (قل اغیر اللہ اتخذ ولیا فاطر السمٰوٰت و الارض و هو یطعم ولا یطعم)۔

اس بناء پر جب تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا وہی ہے اور کسی دوسرے کی قدرت کا سہارا لیے بغیر اس نے سارے جہان کو پیدا کیا ہے اور سب کی روزی اسی کے ہاتھ میں ہے تو پھر کونسی دلیل ہے کہ انسان اس کے غیر کو اپنا ولی، سرپرست اور پناہ گاہ قرار دے۔ اصولی طور پر باقی سب مخلوق ہیں اور اپنے وجود کے تمام لمحات میں اس کے محتاج ہیں۔ لہٰذا وہ کس طرح دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اوپر والی آیت میں جب آسمان و زمین کی خلقت کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو خدا کا "فاطر" کے عنوان سے تعارف کراتا ہے۔ "فاطر" "فطور" کے مادہ سے ہے جس کے معنی شگافتہ کرنے (پھاڑنے) کے ہیں۔ ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھے فاطر السمٰوٰت والارض کے معنی اس وقت سمجھ میں آئے جب دو عربوں کو ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک اپنی ملکیت کے ثبوت میں یہ کہتا تھا کہ "انا فطرتھا" میں نے اس کنویں کو شگافتہ کیا ہے اور بنایا ہے۔

لیکن ہم فاطر کے معنی کو آج موجودہ علوم کی مدد سے ابن عباس کی نسبت بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں کیونکہ یہ آج کے دقیق ترین علمی نظریات کے مطابق انتہائی پسندیدہ تعبیر ہے جو پیدائش جہان کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہے کیونکہ سائنس والوں اور محققین کی تحقیقات کے مطابق عالم بزرگ (مجموعہ جہاں) اور عالم کوچک (نظام شمسی) سب کے سب ابتداء میں ایک ہی

حاشیہ صفحہ سابق ۱۔ تفسیر ابوالفتوح رازی و تفسیر مجمع البیان زیر نظر آیات کے ذیل میں۔

تو وہ تھے کہ جو پے در پے تھپیڑوں کے اثر سے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور اس کے کہکشاں اور نظام ہائے شمسی اور مختلف کرّے وجود میں آ گئے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۳۰ میں یہ مطلب زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جہاں پر فرمایا گیا ہے:

"اولم یر الذین کفروا ان السمٰوٰت والارض کانتا رتقًا ففتقناھما"

کیا کافر یہ نہیں جانتے کہ آسمان و زمین آپس میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے ہم نے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا۔

ایک اور نکتہ کی طرف سے بھی غفلت نہیں کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ صفات خدا میں سے یہاں صرف بندوں کو روزی دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تعبیر شاید اس بنا پر ہے کہ انسان کی مادی زندگی میں زیادہ تر وابستگیاں انہیں مادی ضروریات کے زیر اثر ہیں۔ یہی بات جسے اصطلاح میں روٹی کا ایک لقمہ کھانا کہتے ہیں انسان کو طاقتوروں اور اربابِ دولت کے سامنے جھکنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ بعض اوقات تو لوگ پرستش کی حد تک ان کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ قرآن اس عبارت میں کہتا ہے: تمہاری روزی اس کے ہاتھ میں ہے، نہ تو وہ ایسے افراد کے ہاتھ میں ہے اور نہ ہی بتوں کے ہاتھ میں صاحبان مال و اقتدار خود نیاز مند ہیں اور انہیں کھانے کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ صرف خدا ہے کہ جو کھلاتا تو ہے مگر خود اسے کھانے کی احتیاج نہیں ہے۔

قرآن حکیم کی دوسری آیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کی ملکیت و رازقیت کے مسئلہ اور بارش برسانے اور سبزہ زاروں کی پرورش کرنے کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ مخلوقات سے وابستگی کا خیال لوگوں کے دماغ سے بالکل نکال دے۔

اس کے بعد اُن لوگوں کی پیش کش کا جواب دینے کے لیے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کو یہ دعوت دیتے تھے کہ وہ شرک کے ساتھ رشتہ جوڑ لیں، کہتا ہے: علاوہ اس کے کہ عقل مجھے یہ حکم دیتی ہے کہ صرف اس ذات پر بھروسہ کروں جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وحی الٰہی بھی مجھے حکم دیتی ہے کہ پہلا مسلمان میں بنوں اور کسی طرح بھی مشرکین کی صف میں نہ جاؤں
۔ قل انی امرت ان اکون اول من اسلم ولا تکونن من المشرکین [1]

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ سے پہلے دوسرے پیغمبر اور ان کی صالح اُمتیں بھی مسلمان تھیں۔ اور خداوند تعالیٰ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرتی تھیں۔ اس بنا پر جب وہ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلا مسلمان بنوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس اُمت کا سب سے پہلا مسلمان۔

اور یہ حقیقت میں ایک اہم تربیتی مطلب کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ہر رہبر کو اپنے مکتب اور مشن کے احکام کی انجام دہی میں تمام افراد سے زیادہ پیش قدمی کرنا چاہیے۔ اسے اپنے دین کا سب سے پہلا مومن اور اس پر عمل کرنے والا ہونا

---

[1] انی امرت ..... غیر مستقیم خطاب ہے اور جملہ ولا تکونن ..... خطاب مستقیم ہے شاید یہ تفاوت اس سبب سے ہے کہ شرک سے دوری اور نفرت پہلا مسلمان ہونے کی نسبت کئی درجہ زیادہ اہم ہے۔ اسی لیے شرک سے دوری کا مسئلہ خطاب مستقیم کی صورت میں "نون تاکید ثقیلہ" کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

چاہیے اور سب سے زیادہ کوشش کرنے والا اور اپنے مکتب کے لیے سب سے زیادہ فدا کاری کرنے والا ہونا چاہیے۔

بعد والی آیت میں اس خدائی حکم پر جو وحی کے ذریعہ پیغمبر پر نازل ہوا ہے تاکید مزید کے لیے کہتا ہے: میں بھی خود اپنے لیے جوابدہی کا احساس کرتا ہوں اور قوانین الٰہی سے کسی طرح مستثنیٰ نہیں ہوں۔ میں بھی اگر خداوند تعالیٰ کے حکم سے منحرف ہو جاؤں اور مشرکین کی ہاں میں ہاں ملانے لگ جاؤں اور اس کی نافرمانی اور عصیان کروں تو اس عظیم دن ۔ روزِ قیامت ۔ کی سزا سے خائف و ترساں ہوں (قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم[1])۔

اس آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبروں میں جوابدہی کا احساس دوسروں میں جوابدہی کے احساس سے زیادہ ہوتا ہے۔

آخری آیت میں اس لیے کہ ثابت ہو جائے کہ پیغمبر بھی لطف و رحمت خداوندی پر بھروسہ کیے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے اور تمام اختیارات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں، یہاں تک کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پروردگار کی رحمتِ بے پایاں پر ہی چشم امید لگائے ہوئے ہیں اور اپنی نجات و کامیابی اسی سے طلب کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: کہ رسول کہتے ہیں جو شخص اس عظیم دن پروردگار کی سزا سے نجات پا جائے تو رحمت خدا اس کے شامل حال ہو گئی ہے اور یہ ایک توفیق الٰہی اور کھلی کامیابی ہے (من یصرف عنہ یومئذ فقد رحمہ و ذٰلک الفوز المبین)۔

یہ آیات توحید کا آخری درجہ بیان کرتی ہیں، یہاں تک کہ ان لوگوں کو کہ جو پیغمبروں کو بھی خدا کے ساتھ مستقل پناہ گاہ مانتے تھے، جیسے عیسائی جو حضرت عیسیٰؑ کو نجات دہندہ سمجھتے تھے، صراحت کے ساتھ جواب دیا گیا ہے کہ پیغمبر تک بھی اس کی رحمت کے محتاج ہیں۔

۱۷۔ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

۱۸۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝

ترجمہ

۱۷۔ اگر خدا تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے علاوہ کوئی بھی اُسے برطرف نہیں کر سکتا اور اگر وہ تجھے کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ تمام چیزوں پر قدرت رکھنے والا ہے (اور ہر نیکی اسی کی قدرت سے بنی ہے)۔

---

[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ جملہ بندی کی ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ لفظ "اخاف" جملہ "ان عصیت ربی" کے بعد ذکر ہو۔ کیونکہ وہ شرط کی جزا کے طور پر استعمال ہوا ہے لیکن پیغمبر کا خوف اور جوابدہی کا احساس اس بات کا سبب بنا کہ پروردگار کے حکم کے سامنے "اخاف" (میں ڈرتا ہوں) کا لفظ تاکید کے لیے مقدم رکھا جائے۔

۱۸۔ وہی ہے کہ جو اپنے تمام بندوں پر قاہر و مسلط ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔

تفسیر

پروردگار کی قدرتِ قاہرہ

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا سب سے پہلا ہدف شرک و بت پرستی کی بیخ کنی ہے۔ مندرجہ بالا دونوں آیات میں بھی اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تم لوگ غیر خدا کی طرف کیوں توجہ کرتے ہو؟ مصائب سے نجات، رفع ضرر اور حصولِ منفعت کے لیے خود ساختہ خداؤں سے کیوں پناہ لیتے ہو؟ حالانکہ اگر تجھے معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر نقصان بھی پہنچے تو سوائے خدا کے اس کو برطرف کرنے والا اور کوئی نہ ہوگا اور اگر کوئی خیر و برکت اور کامیابی و سعادت تجھے نصیب ہو تو وہ بھی اسی کی قدرت کا پرتو ہے۔ کیونکہ وہی ہے کہ جو تمام چیزوں پر قدرت رکھتا ہے (وان یمسسک اللہ بضر[1] فلا کاشف له الا هو وان یمسسک بخیر فهو علی کل شیء قدیر)

حقیقت میں غیر خدا کی طرف توجہ لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ یا تو وہ انہیں سرچشمۂ خیرات جانتے ہیں یا وہ انہیں مصائب و مشکلات کا برطرف کرنے والا سمجھتے ہیں جیسا کہ طاقت و اقتدار رکھنے والوں کے سامنے پرستش کی حد تک خضوع و خشوع بھی ان ہی دونوں اسباب کی بنا پر ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت کہتی ہے کہ ارادۂ خداوندی تمام چیزوں پر حکومت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی نعمت کو کسی سے سلب کرلے یا کوئی نعمت کسی کو عطا کردے تو دنیا میں کوئی منبعِ قدرت ایسا نہیں ہے جو اسے پلٹا سکے تو پھر وہ غیر خدا کے سامنے سرِ تعظیم کیوں جھکاتے ہیں۔

"خیر" و "شر" کے بارے میں "یمسسک" کی تعبیر کہ جو مادہ "مس" سے ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی خیر و شر تک بھی اس کے ارادہ و قدرت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یہ ذکر بھی لازمی ہے کہ اوپر والی آیت ثنویین یعنی دو خداؤں کی پرستش کرنے والوں کے عقیدہ کی۔ کہ جو خیر و شر کے دو علیحدہ علیحدہ مبدء کے قائل تھے۔ صراحت کے ساتھ تردید کرتی ہے اور دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہے۔ لیکن ہم اپنے مقام پر یہ عرض کر آئے ہیں کہ "مطلق شر" کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے، تو اس بنا پر جب شر کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو اس سے ایسے امور مراد ہوتے ہیں کہ جو ظاہر میں سلبِ نعمت ہوتے ہیں لیکن فی الواقع اپنے مقام پر وہ خیر ہیں اور یا وہ بیدار کرنے کے لیے یا تعلیم و تربیت کے لیے اور یا تکبر، سرکشی اور خود پسندی کو برطرف کرنے کے

---

[1] "ضر" ایسے نقصانات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسان کو پیش آتے ہیں، خواہ وہ جسمانی پہلو رکھتے ہوں جیسے کسی عضو کا نقصان اور مختلف بیماریاں یا وہ روحانی پہلو رکھتے ہوں جیسے جہالت، حماقت، دیوانگی یا دوسرے پہلو جیسے مال، اولاد یا عزت کا چلے جانا۔

لیے اور یا دوسری مصلحتوں کے لیے ہوتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اس بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: وہی ہے جو اپنے تمام بندوں پر قاہر و مسلط ہے (وھو القاھر فوق عبادہ)۔

"قہر" اور "غلبہ" کا اگرچہ ایک ہی معنی ہے، لیکن لغوی بنیاد کی نظر سے ان دونوں کے معنی میں تفاوت ہے۔ قہر و قاہریت اس قسم کے غلبہ و کامیابی کو کہا جاتا ہے کہ جس میں مدمقابل کسی بھی قسم کا غلبہ اپنی طرف سے ظاہر نہیں کرسکتا لیکن لفظ غلبہ میں یہ مفہوم موجود نہیں ہے اور یہ ممکن ہے کہ غلبہ پانے کے بعد مدمقابل اس پر کامیابی حاصل کرلے۔ دوسرے لفظوں میں قاہر اسے کہتے ہیں جو مدمقابل پر اس طرح تسلط اور برتری رکھتا ہو کہ اس میں مقابلے کی مجال ہی نہ ہو بالکل اس پانی کے برتن کی طرح کہ جسے آگ کے ایک چھوٹے سے شعلہ پر ڈالا جائے تو وہ اُسے فوراً خاموش کردے۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ قاہریت عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے کہ جب طرف مقابل کوئی عاقل موجود ہو، لیکن غلبہ عام ہے اور غیر عاقل موجودات پر کامیابیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے[1]

اس بنا پر پہلی آیت میں، خود ساختہ خداؤں اور صاحبان اقتدار کے مقابلہ میں اگر خدا کی قدرت کی عمومیت کی طرف اشارہ ہوا ہے تو وہ اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ مجبور ہے کہ ایک مدت تک دوسری قدرتوں کے ساتھ دست و گریبان ہو یہاں تک وہ انہیں چت کردے، بلکہ اس کی قدرت، قدرت قاہرہ ہے، اور "فوق عبادہ" کی تعبیر بھی اسی معنی کی تکمیل کے لیے ہے۔

اس حالت میں کس طرح ممکن ہے کہ ایک باخبر انسان اسے چھوڑ دے اور ایسے موجودات و اشخاص کے پیچھے جائے کہ جو اپنی طرف سے کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتے، یہاں تک کہ اُن میں جو معمولی اور حقیر سی قدرت موجود ہے وہ بھی خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔

لیکن اس مقصد کے پیش نظر کہیں یہ وہم نہ ہو جائے کہ ممکن ہے خدا بھی بعض صاحبان قدرت کی طرح اپنی نامحدود قدرت سے تھوڑا بہت غلط فائدہ اُٹھا لیتا ہو، آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ اس کے باوجود وہ حکیم ہے اور اس کے تمام کام حساب کے مطابق ہیں اور وہ خبیر و آگاہ ہے اور معمولی سے معمولی اشتباہ اور خطا بھی اپنی قدرت کو عمل میں لانے میں نہیں کرتا (وھو الحکیم الخبیر)۔

فرعون کے حالات میں ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کی اولاد کے قتل کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے: وانا فوقھم قاھرون[2] یعنی میں ان کے اُوپر کامل طور پر مسلط ہوں۔ یعنی وہ اپنی اس قدرت قاہرہ کو۔ کہ جو واقع میں ایک حقیر قدرت سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی ظلم و ستم اور دوسروں کے حقوق کی پرواہ نہ کرنے کی

---

[1] المیزان جلد ۷، صفحہ ۳۴۔

[2] اعراف۔ ۱۲۷۔

دلیل قرار دیتا تھا۔ لیکن خداوند حکیم و خبیر اس قدرت قاہرہ کے باوجود اس سے بہت منزہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا ظلم اور غلطی معمولی سے معمولی بندے کے حق میں روا رکھے۔

یہ بات بھی کہے بغیر واضح ہے کہ (فوق عبادہ) کے لفظ سے مراد مرتبہ و مقام کی برتری ہے نہ کہ مکانی برتری، کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ خدا کوئی مکان نہیں رکھتا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض بددماغوں نے اُوپر والی آیت کی تعبیر کو خدا کے جسم ہونے کی دلیل قرار دیا ہے، حالانکہ اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ فوق (اُوپر) کی تعبیر خدا کی اپنے بندوں پر قدرت کے لحاظ سے معنوی برتری کے بیان کے لیے ہے۔ یہاں تک کہ فرعون کے بارے میں بھی حالانکہ وہ ایک انسان تھا اور جسم رکھتا تھا یہی لفظ مقام کی برتری کے لیے استعمال ہوا ہے نہ کہ مکانی برتری کے لیے (غور کیجئے گا)۔

۱۹۔ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۣ شَهِیْدٌۢ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ۣ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ۭ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِیْ بَرِیْۤءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝

۲۰۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۹۔ کہہ دو کہ سب سے بڑی گواہی کس کی ہے۔ کہہ دو کہ خداوند تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے۔ (اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ) اس نے یہ قرآن میرے اُوپر وحی کیا ہے تاکہ تمہیں اور اُن تمام افراد کو ڈراؤں کہ جن تک یہ قرآن پہنچے (اور حکم خدا کی مخالفت کا خوف دلاؤں) کیا سچ مچ تم یہ گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہیں، کہہ دو کہ میں ہرگز اس قسم کی گواہی نہیں دیتا، کہہ دو کہ خدا یگانہ و یکتا ہے اور میں اس سے جو اس کا شریک قرار دے بری و بیزار ہوں۔

۲۰۔ وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے اس (پیغمبر کو) اچھی طرح سے پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں

کو پہچانتے ہیں، صرف وہ اشخاص کہ جو اپنا سرمایۂ وجود کھو بیٹھتے ہیں ایمان نہیں لاتے۔

تفسیر

سب سے بڑا گواہ

جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ مشرکین مکہ کا ایک گروہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ تو کیسا پیغمبر ہے کہ کوئی بھی تیرا موافق اور حامی نہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے یہود و نصاریٰ سے بھی تیرے بارے میں تحقیق کی ہے، وہ بھی تورات و انجیل کی بنیاد پر تیری حقانیت کی گواہی نہیں دیتے۔ کم از کم کوئی تم ہمیں دکھاؤ کہ جو تمہاری رسالت کی گواہی دے۔ مندرجہ بالا آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سب ہٹ دھرم مخالفین کے مقابلے میں کہ جنہوں نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں اور آپ کی حقانیت کی ان سب نشانیوں کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور پھر بھی گواہ اور شاہد کا مطالبہ کرتے ہیں، کہہ دیجئے تمہارے عقیدے اور نظریے کے مطابق سب سے بڑا گواہ کون ہے (قل ای شیء اکبر شھادة)۔

کیا اس کے سوا بھی کچھ ہے کہ سب سے بڑی شہادت پروردگار کی شہادت ہے؟ تو کہہ دو کہ خدا سے بزرگ و برتر میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے (قل اللہ شھید بینی و بینکم)۔

اور اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ اس نے اس قرآن کو مجھ پر وحی کیا ہے (و اوحی الی ھذا القرآن)۔

وہ قرآن جو ممکن نہیں ہے کہ فکر انسانی کا گھڑا ہوا ہو، وہ بھی اس زمانے میں اور اس ماحول اور مقام میں، وہ قرآن جو کئی قسم کے شواہد اعجاز پر مشتمل ہے۔ اس کے الفاظ اعجاز آمیز ہیں، اور اس کے معانی اس سے بھی زیادہ اعجاز آمیز ہیں۔ کیا یہی ایک عظیم شاہد خداوند تعالیٰ کی طرف سے میری دعوت کی حقانیت کی گواہی کی دلیل نہیں ہے؟۔

ضمنی طور پر اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے دعوے کی صداقت کا سب سے بڑا گواہ ہے۔

اس کے بعد نزول قرآن کا ہدف و مقصد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ قرآن اس مقصد کے لیے مجھ پر نازل ہوا ہے کہ میں تمہیں اور ان تمام لوگوں کو جن کے کانوں تک پوری تاریخ بشر میں اور وسعت زمانی میں اور تمام نقاطِ جہاں میں۔ میری باتیں پہنچیں انہیں خدا کے حکم کی مخالفت سے ڈراؤں اور اس مخالفت کے دردناک عواقب انجام کی طرف متوجہ کروں (لانذرکم بہ و من بلغ)۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں گفتگو صرف "انذار" اور ڈرانے کے بارے میں ہے حالانکہ عام طور پر ہر جگہ بشارت بھی ساتھ ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گفتگو ایسے ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلہ میں تھی جو مخالفت پر اصرار کرتے رہے ہیں۔

ضمنی طور پر "و من بلغ" (وہ تمام لوگ کہ جن تک یہ بات پہنچ جائے) کے الفاظ کا ذکر قرآن کی رسالت جہانی

اور دعوتِ عمومی اور پیامِ عالمی کا پتہ دیتا ہے ۔

حقیقت میں اس سے زیادہ مختصر اور اس سے زیادہ جامع تعبیر اس مقصد کے ادا کرنے کے لیے اور متصور ہو ہی نہیں سکتی ۔ اس کی وسعت میں غور کرنے سے قرآن کی دعوت کے نسلِ عرب یا خاص زمانے اور خاص علاقے سے مخصوص نہ ہونے کے بارے میں ہر قسم کا ابہام اور شک و شبہ دور ہو جاتا ہے علماء کے ایک گروہ نے ایسی تعبیرات سے مسئلہ ختم نبوت کے لیے بھی استفادہ کیا ہے ۔ کیونکہ اوپر والی تعبیر کے مطابق پیغمبر اُن تمام لوگوں پر مبعوث تھے کہ جن تک آپ کی باتیں پہنچی ہیں اور یہ اُن تمام افراد کے لیے ہے کہ جو اس جہان کے آخر تک دنیا میں قدم رکھیں گے ۔

اہلِ بیت علیہم السلام کے طرق سے منقول احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلاغ و تبلیغ قرآن سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا عینِ متن دوسری اقوام تک پہنچے حتیٰ کہ اس کے ترجموں اور مفاہیم کا دوسری زبانوں میں پہنچنا بھی آیت کے معنی میں داخل ہے ۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ سے اوپر والی آیت کے بارے میں سوال ہوا تو حضرتؑ نے فرمایا :

" بکل لسان "[1]

یعنی ہر زبان میں ہو ۔

ضمنی طور پر مسلمہ اصول فقہ کے قوانین میں سے ایک قاعدہ " قبح عقاب بلا بیان " ہے ، وہ بھی اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے ۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ اصول فقہ میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب تک کوئی حکم کسی شخص تک نہ پہنچے وہ شخص اُس حکم کے لیے جواب دہ نہیں ہو سکتا (مگر یہ کہ حکم حاصل کرنے میں اس نے خود کوتاہی کی ہو) مندرجہ بالا آیت بھی یہی کہتی ہے کہ وہ لوگ کہ جن تک میری بات پہنچ جائے وہ اس کے لیے جوابدہ ہیں اور اس طرح سے وہ لوگ کہ جنہیں احکام کے حصول میں کوتاہی نہ کرنے کے باوجود اصل حکم نہ پہنچا ہو کوئی مسئولیت نہیں رکھتے ۔

تفسیر " المنار " میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل ہوا ہے :

> قیدیوں کا ایک گروہ آپ کے پاس لایا گیا ، حضرتؐ نے اُن سے پوچھا کہ کیا انہوں نے تمہیں اسلام کی دعوت دی تھی ؟ انہوں نے کہا کہ نہیں ! آپ نے حکم دیا کہ انہیں رہا کر دو ، اس کے بعد آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت کی اور فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو کہ یہ اپنی جگہ پر واپس چلے جائیں کیونکہ انہیں حقیقت اسلام کی تبلیغ نہیں ہوئی اور اس کی طرف انہیں دعوت نہیں دی گئی[2]

---

[1] تفسیر برہان ، نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۷۰۰ ، آیہ ہذا کے ذیل میں ۔

[2] المنار جلد ۷ صفحہ ۳۴۱ ۔

نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "شیٔ" کا اطلاق کہ جو فارسی کے لفظ "چیز" کا ہم معنی ہے، خدا پر کرنا جائز ہے لیکن وہ ایسی چیز ہے کہ جو دوسری چیزوں کی مانند نہیں ہے کہ جو مخلوق و محدود ہیں بلکہ وہ خالق ہے اور نامحدود ہے۔

پھر اس کے بعد پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ ان سے پوچھو "کیا واقعاً تم گواہی دیتے ہو کہ خدا کے ساتھ اور خدا بھی ہیں؟ (ائنکم لتشھدون ان مع اللہ اٰلھۃ اخرٰی)۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ انہیں صراحت کے ساتھ کہہ دو کہ میں کبھی ایسی گواہی نہیں دیتا، کہہ دو کہ وہ خدا یکتا و یگانہ ہے اور جنہیں تم اس کا شریک بناتے ہو میں ان سے بری و بیزار ہوں (قل لا اشھد قل انما ھو الہ واحد و انني بریٔ مما تشرکون)۔

درحقیقت آیت کے آخر میں ان چند جملوں کا ذکر ایک اہم نفسیاتی نکتے کے لیے کیا گیا ہے، اور وہ نکتہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ مشرکین اس قسم کا تصور کرلیں کہ شاید ان کی گفتگو نے روحِ پیغمبرؐ میں کچھ تنزلزل پیدا کردیا ہو اور وہ یہ امید لیے ہوئے مجلس سے جدا ہوں اور اپنے دوستوں کو بشارت دیں کہ شاید محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بعد اپنی دعوت میں نظرثانی کرلیں یہ جملے کہ جو صراحت اور قاطعیت سے سرشار ہیں اس امید کو کلی طور پر ناامیدی میں بدل رہے ہیں اور انہیں نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ بات ان کے خیال و گمان سے بالکل باہر ہے اور معمولی سے معمولی تنزلزل بھی آپ کی دعوت میں پیدا نہیں ہوگا اور تجربہ سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ کسی بحث کے آخر میں اس قسم کے قطعی الفاظ کا ذکر آخری نتیجے تک پہنچنے کے لیے گہرا اثر رکھتا ہے۔

اور اس آیت کے بعد والی آیت میں ان لوگوں کو کہ جو اس بات کے مدعی تھے کہ اہلِ کتاب کسی قسم کی گواہی پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں نہیں دیتے صراحت کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہتا ہے، "وہ لوگ کہ جن پر ہم نے آسمانی کتاب نازل کی ہے وہ پیغمبر کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح سے کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں (الذین اٰتینٰھم الکتٰب یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم)۔

یعنی وہ نہ صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصل ظہور اور اس کی دعوت سے آگاہ ہیں بلکہ وہ تو اس کی جزئیات و خصوصیات اور دقیق نشانیوں کو بھی جانتے ہیں، اس بنا پر اگر کچھ اہلِ مکہ کہتے تھے کہ ہم نے اہلِ کتاب کی طرف رجوع کیا ہے لیکن انہیں بھی پیغمبرؐ کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے، تو یا تو واقعاً وہ جھوٹ بولتے تھے اور انہوں نے (اہلِ کتاب سے) تحقیق ہی نہیں کی تھی، اور یا پھر اہلِ کتاب نے حقائق کو چھپا لیا اور ان کے سامنے بیان نہ کیا، جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات ان کے حق کو پوشیدہ رکھنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس بات کی بیشتر وضاحت تفسیر نمونہ کی جلد اول میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۶ کے ذیل میں گزر چکی ہے (دیکھئے اردو ترجمہ صفحہ ۳۴۰)۔

آیت کے آخر میں ایک آخری نتیجہ کے طور پر بتاتا ہے، صرف وہی لوگ اس پیغمبر پر (ان واضح نشانیوں کے باوجود) ایمان نہیں لاتے کہ جو زندگی کے بازارِ تجارت میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے ہیں اور اپنے وجود کی تمام پونجی ہرا بیٹھے ہیں (الذین خسروا انفسھم فھم لا یؤمنون)

۲۱۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ○

۲۲۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَيْنَ شُرَكَآؤُكُمُ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ○

۲۳۔ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ○

۲۴۔ اُنْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۱۔ اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہوگا کہ جس نے خدا پر جھوٹ باندھا (اور اس کے لیے شریک کا قائل ہوا) یا اس کی آیات کو جھٹلایا۔ یقیناً ظالم نجات کا منہ نہ دیکھ پائیں گے۔

۲۲۔ وہ دن کہ جس میں ہم اُن سب کو محشور کریں گے تو مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ معبود کہاں ہیں کہ جنہیں تم خدا کا شریک خیال کیا کرتے تھے (وہ تمہاری مدد کو کیوں نہیں آتے)۔

۲۳۔ پھر ان کا جواب اور عذر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ کہیں گے کہ اس خدا کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مشرک نہیں تھے۔

۲۴۔ دیکھو وہ کس طرح خود اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتے ہیں اور جسے جھوٹ موٹ خدا کا شریک سمجھتے تھے اُسے چھوڑ بیٹھیں گے۔

تفسیر

سب سے بڑا ظلم

شرک وبت پرستی کی ہر طرح سے بیخ کنی کا پروگرام دینے کے بعد اوپر والی آیات میں سے پہلی آیت میں صراحت کے ساتھ استفہام انکاری کی صورت میں کہتا ہے: ان مشرکین سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے کہ جنہوں نے خدا پر جھوٹ باندھا اور اس کا شریک قرار دیا یا اس کی آیات کی تکذیب کی ہے (ومن اظلم ممن افترى على الله كذبًا او كذب بآياته)۔

درحقیقت پہلا جملہ انکار توحید کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جملہ انکار نبوت کی طرف اشارہ ہے اور واقعاً اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہوسکتا کہ انسان بے قدر جمادات کو یا ناتواں انسان کو ایک لا محدود وجود کے مساوی قرار دے جو سارے عالم پر حکومت کرتا ہے۔ یہ کام تین جہت سے ظلم شمار ہوتا ہے۔

ایک ظلم اس کی ذات پاک کے ساتھ کہ اس کے لیے شریک کا قائل ہوا۔

دوسرے اپنے اوپر ظلم کہ اپنی حیثیت کو یہاں تک گرادیا کہ اسے پتھر کے ایک ٹکڑے اور لکڑی کی پرستش تک نیچے لے آیا۔

تیسرے ایک معاشرے اور سوسائٹی پر ظلم کہ شرک کے زیر اثر تفرقہ و پراگندگی اور روحِ وحدت و یگانگی سے دوری میں گرفتار ہوا۔

مسلمہ طور پر کوئی بھی ظالم خاص طور پر ایسے ظالم کہ جن کا ظلم ہر پہلو سے نمایاں ہے، سعادت و رستگاری اور نجات و فلاح کا منہ نہیں دیکھیں گے (انه لا يفلح الظٰلمون)۔

البتہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ لفظ شرک ذکر نہیں ہوا لیکن قبل و بعد کی آیات پر توجہ کرتے ہوئے کہ جو سب کی سب شرک کے بارے میں گفتگو کررہی ہیں واضح ہوتا ہے کہ لفظ " افترى " سے اس آیت میں مراد وہی ذاتِ الٰہی کے لیے شرک کی تہمت ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں ۱۵ مواقع پر کچھ لوگوں کا ظالم ترین اور ستمگار ترین کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے، اور وہ سب کے سب جملہ استفہامیہ " ومن اظلم " یا " فمن اظلم " (کون زیادہ ظالم ہے) کے ساتھ شروع ہوئے ہیں۔ اگرچہ ان آیات میں سے اکثر شرک وبت پرستی اور آیات الٰہی کے انکار کے بارے میں ہی گفتگو کرتی ہیں یعنی ان میں اصل توحید ہی پیش نظر ہے لیکن ان میں سے بعض دوسرے مسائل کے بارے میں بھی ہیں مثلاً:

" وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ "

ان سے زیادہ اور کون شخص ظالم ہے جو مساجد میں ذکر خدا سے روکتے ہیں؟ (بقرہ - ۱۱۴)۔

ایک اور مقام پر ہے :

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ"

اُن سے بڑھ کر اور کون ظالم ہے جو شہادت کو چھپاتے ہیں (بقرہ - ۱۴۰) ۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کیسے ممکن ہے کہ ان گروہوں میں سے ہر گروہ ہی سب سے بڑھ کر ظالم ہو جب کہ "ظالم ترین" کا لفظ تو ان میں سے صرف ایک گروہ پر ہی صادق آتا ہے ۔

اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ان سب امور کی حقیقت میں ایک ہی جڑ ہے اور وہ ہے شرک، کفر اور عناد۔ کیونکہ لوگوں کو مساجد میں ذکر خدا سے منع کرنا اور انہیں ویران و برباد کرنے کی کوشش کرنا کفر و شرک کی نشانی ہے۔ اسی طرح شہادت کو چھپانا ہے کہ ظاہری طور پر اس سے مراد حقائق پر شہادت کو چھپانا ہے کہ جو وادئ کفر میں لوگوں کے بھٹکنے کا سبب بنتا ہے لہٰذا یہ بات بھی شرک و کفر اور خدائے یگانہ کے انکار کی مختلف قسموں میں سے ہے ۔

بعد والی آیت میں قیامت میں مشرکین کے انجام کے سلسلے میں بحث ہوگی تاکہ واضح ہو جائے کہ انہوں نے بتوں جیسی کمزور مخلوق پر بھروسہ کر کے نہ اس دنیا میں اطمینان و راحت حاصل کیا ہے اور نہ ہی دوسرے جہاں میں۔ ارشاد الٰہی ہے: اس روز جب کہ ہم اُن سب کو ایک ہی جگہ مبعوث کریں گے اور مشرکین سے کہیں گے کہ تمہارے وہ بناوٹی معبود جنہیں تم خدا کا شریک خیال کرتے تھے کہاں ہیں ؟ ۔ اور وہ تمہاری مدد کے لیے کیوں نہیں آتے ؟ اور کسی قسم کا اثر ان کی قدرت نمائی کا اس وحشتناک عرصۂ قیامت میں کیوں نظر نہیں آتا (و یوم نحشرهم جمیعًا ثم نقول للذین اشرکوا این شرکائکم الذین کنتم تزعمون)۔

کیا اصل بنیاد یہی نہ تھی کہ وہ مشکلات میں تمہاری مدد کریں گے ؟ اور کیا تم نے بھی اسی اُمید پر ان کی پناہ حاصل نہیں کی تھی ؟ تو پھر ان کا یہاں پر کوئی معمولی سے معمولی اثر بھی کیوں دکھائی نہیں دیتا ؟

وہ ہکا بکا رہ جائیں گے اور عجیب و غریب وحشت و حیرت میں ڈوب جائیں گے اور اس سوال کا اُن کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا ۔ سوائے اس کے کہ قسم کھا کر کہنے لگیں کہ خدا کی قسم ہم کبھی بھی مشرک نہیں تھے ۔ ان کا گمان یہ ہوگا جیسے وہاں بھی حقائق کا انکار کیا جا سکتا ہے (ثم لم تکن فتنتهم الا ان قالوا و الله ربنا ما کنا مشرکین)۔ اس بارے میں کہ اوپر والی آیت میں لفظ "فتنہ" کس معنی میں ہے ، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ۔ بعض مفسرین اسے فروتنی اور معذرت کے معنی میں لیتے ہیں ۔ بعض جواب کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض نے شرک کے معنی میں لیا ہے [1]

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ "فتنہ و افتتان" سے مراد ان کا وہی دلی میلان ہو ۔ یعنی ان کے شرک و بت پرستی سے ان کے لگاؤ کا نتیجہ کہ جس نے ان کی عقل و فہم پر پردہ ڈال رکھا ہوگا کہ قیامت کے دن جب پردے ہٹ جائیں گے تو اس وقت وہ اپنی اتنی بڑی خطا کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے اعمال سے بیزاری اختیار

[1] جب یہ لفظ معذرت اور جواب کے معنی میں لیا جائے گا تو اس صورت میں آیت کسی لفظ کے مقدر ہونے کی محتاج نہیں ہوگی لیکن اگر شرک کے معنی میں ہو تو ضروری ہے کہ لفظ "نتیجہ" کو مقدر مانا جائے یعنی ان کے شرک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ قسم کھائیں گے کہ وہ مشرک نہیں تھے ۔

کریں گے اور اُن سے کلی طور پر انکار کردیں گے۔

لغت میں "فتنہ" کا اصل معنی جیسا کہ راغب "مفردات" میں کہتا ہے یہ ہے کہ سونے کو آگ میں ڈال دیں اور اسے خوب تیز آنچ دیں تاکہ اس کا باطن ظاہر ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا۔ اس معنی کو اُوپر والی آیت میں ایک تفسیر کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ لوگ جب قیامت کے دن سخت پریشانی اور اُس دن کی وحشتوں میں غرق ہوں گے تو پھر انہیں ہوش آئے گا اور وہ اپنی غلطی پر آگاہ ہوں گے اور اپنی نجات کے لیے اپنے گذشتہ اعمال کا انکار کریں گے۔

بعد والی آیت میں اس مقصد سے کہ لوگ ان کے رسواکن انجام سے عبرت حاصل کریں کہا گیا ہے کہ اچھی طرح غور کرو اور دیکھو کہ ان کا معاملہ کہاں تک پہنچ گیا ہے کہ انہوں نے اپنی روش اور مسلک سے کاملاً بیزاری اختیار کرلی ہے اور اس کا انکار کرتے ہیں یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے جھوٹ بولتے ہیں (انظر کیف کذبوا علیٰ انفسھم)۔

اور تمام سہارے جو انہوں نے اپنے لیے اختیار کیے ہوئے تھے اور انہیں خدا کا شریک سمجھتے تھے ہاتھ سے دے بیٹھیں گے اور ان کی کہیں بھی رسائی نہیں ہوگی (وضل عنھم ما کانوا یفترون)۔

چند اہم نکات

۱۔ "انظر" سے مراد مسلّمہ طور پر عقل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھوں سے دیکھنا، کیونکہ قیامت کا میدان اس دنیا میں ظاہری نہیں دیکھا جا سکتا۔

۲۔ یہ جو کچھ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے اُوپر جھوٹ باندھا تو اس کا معنی ہے کہ انہوں نے دنیا میں اپنے آپ کو فریب دیا اور راہ حق سے نکل گئے، یا یہ کہ دوسرے جہاں میں جو قسم کھا رہے ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے تو یہ حقیقت میں وہ اپنے آپ سے جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ مسلّمہ طور پر وہ مشرک تھے۔

۳۔ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اپنے سابقہ شرک کا قیامت کے دن انکار کردیں گے جب کہ روزِ قیامت کی کیفیت اور حقائق کا حسی طور پر مشاہدہ اس طرح سے ہوگا کہ کسی شخص کو یہ مجال نہ ہوگی کہ حق کے خلاف کوئی بات کرے۔ بالکل اس طرح سے جیسے کوئی جھوٹے سے جھوٹا آدمی بھی ہمیں ایسا دکھائی نہیں دیتا جو روزِ روشن میں سورج کے سامنے کھڑا ہو کر کہے کہ فضا تاریک ہے، اس کے علاوہ بعض دوسری آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزِ قیامت صراحت کے ساتھ اپنے شرک کا اقرار کریں گے، اور کسی حقیقت کو نہیں چھپائیں گے مثلاً:

"وَلَا یَکْتُمُوْنَ اللّٰہَ حَدِیْثًا" (نساء - ۴۲)

اس سوال کے دو جواب دیئے جا سکتے ہیں:

پہلا جواب: یہ ہے کہ قیامت میں کئی مراحل ہوں گے، ابتدائی مراحل میں مشرکین خیال کریں گے کہ جھوٹ بول کر بھی خدا کے دردناک عذاب اور سزا سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے لہٰذا وہ اپنی پرانی عادت کے مطابق جھوٹ بولیں گے

لیکن بعد کے مراحل میں جب وہ یہ سمجھ لیں گے کہ اس طریقہ سے بھاگنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو پھر اپنے اعمال کا اعتراف کرلیں گے حقیقت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسان کی آنکھوں کے سامنے سے رفتہ رفتہ پردے ہٹیں گے ۔ ابتدا میں جب کہ مشرکوں نے اپنے نامۂ عمل کا پوری طرح غور سے مطالعہ نہیں کیا ہوگا تو جھوٹ کا سہارا لیں گے لیکن بعد کے مراحل میں جب پردے پوری طرح اُٹھ جائیں گے اور تمام چیزیں نظروں کے سامنے ہوں گی تو پھر انہیں اعتراف کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آئے گا ۔

ٹھیک مجرموں کی طرح جو ابتدائی تفتیش میں تمام باتوں سے ، یہاں تک کہ اپنے دوستوں سے شناسائی کا بھی انکار کردیتے ہیں لیکن جب انہیں جرم کی اسناد اور منہ بولتی دستاویزات دکھائی جاتی ہیں تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ معاملہ اتنا واضح ہے کہ انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ، لہٰذا پھر وہ اعتراف بھی کرلیتے ہیں اور سب کچھ اگل دیتے ہیں ۔

یہ جواب امیرالمومنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث میں نقل ہوا ہے [1]

دوسرا جواب یہ ہے کہ اُوپر والی آیت اُن افراد کے بارے میں ہے جو حقیقت میں اپنے آپ کو مشرک نہیں سمجھتے تھے مثلاً عیسائی ، جو تین خداؤں کے قائل ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو موحد خیال کرتے ہیں ۔ یا یہ آیت ایسے اشخاص کے بارے میں ہے جو توحید کے نعرے لگاتے تھے ، لیکن ان کے عمل سے شرک کی بو آتی تھی کیونکہ وہ انبیاء کرام کے احکام پاؤں کے نیچے روندتے تھے ، غیر خدا پر بھروسہ رکھتے اور خدا کے اولیاء کی ولایت کا انکار کرتے تھے لیکن اس کے باوجود خود کو موحد سمجھتے تھے ۔ یہ لوگ قیامت کے دن قسم کھائیں گے کہ ہم تو موحد تھے لیکن بہت جلد انہیں سمجھا دیا جائے گا کہ وہ باطن میں مشرکین میں داخل تھے ۔ یہ جواب بھی کئی ایک روایات میں حضرت علی علیہ السلام اور حضرت صادق علیہ السلام سے نقل ہوا ہے [2]

اور دونوں جواب قابلِ قبول ہیں ۔

۲۵۔ وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○

۲۶۔ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ ۖ وَإِنْ يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۰۸ ۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۰۸ ۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۵۔ اُن میں سے کچھ لوگ تیری بات تو سنتے ہیں لیکن ہم نے اُن کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں تاکہ وہ انہیں نہ سمجھیں، اور ہم نے ان کے کانوں کو بوجھل کر دیا ہے اور وہ (اس قدر ہٹ دھرم ہیں) کہ اگر حق کی تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ وہ جب تیرے پاس آتے ہیں تو تجھ سے جھگڑنے لگتے ہیں اور کافر کہتے ہیں کہ یہ تو پرانے لوگوں کے افسانے ہیں۔

۲۶۔ وہ دوسروں کو اُس سے روکتے ہیں اور خود بھی اُس سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ اپنے سوا وہ کسی کو ہلاک نہیں کرتے لیکن سمجھتے نہیں۔

تفسیر

حق قبول نہ کرنے والوں کا طرزِ عمل

اس آیت میں بعض مشرکین کی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ حقائق سننے کے لیے خود سے ذرہ بھر توجہ بھی نہیں دیتے۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ وہ تو اس سے دشمنی پر بھی اُتر آتے ہیں اور تہمتوں کے ذریعہ خود کو اور دوسروں کو بھی اُس سے دور رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں یوں کہا گیا ہے: اُن میں سے بعض تیری بات تو سنتے ہیں لیکن ان کے دلوں پر ہم نے پردے ڈال دیئے ہیں، تاکہ وہ اُسے سمجھ نہ سکیں، اور ان کے کانوں میں ہم نے بوجھل پن پیدا کر دیا ہے تاکہ وہ سُنیں (ومنهم من يستمع اليك وجعلنا على قلوبهم اكنة ان يفقهوه و فى اٰذانهم وقرًا[1])

حقیقت میں زمانہ جاہلیت کے اندھے تعصبات اور مادی منافع میں غرق ہوتے چلے جانا اور ہوا و ہوس کی پیروی کرنا ان کی عقل و ہوش پر اس طرح غالب آگیا ہے کہ گویا وہ پردے کے نیچے آگئے ہیں (جس کی وجہ سے) نہ تو وہ کسی حقیقت کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی مسائل کو صحیح طور پر سمجھتے ہیں۔

ہم یہ بات کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ اگر اس قسم کے مسائل کی نسبت خدا کی طرف دی جاتی ہے تو یہ حقیقت

---

[1] اکنة "جمع" "کنان" بروزن "کتاب" "پردہ" کے معنی میں ہے، یا ہر وہ چیز جو چھپا دے اور "وقر" کان کے بوجھل ہونے کے معنی میں ہے۔

میں قانون "علیت" اور خاصیت عمل کی طرف اشارہ ہوتا ہے یعنی کج روی میں تسلسل اور ہٹ دھرمی اور بے دینی پر اصرار کا اثر یہ ہے کہ انسان کی روح بھی اسی سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور یہ اعمال انسان کو ٹیڑھے آئینے کی طرح بنا دیتے ہیں کہ (اس ٹیڑھے آئینہ میں) ہر چیز کج اور ٹیڑھی ہی نظر آتی ہے۔ تجربے نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ بدکار اور گنہگار افراد ابتدا میں اپنے بُرے کام سے پریشان اور بے آرام ہوتے ہیں لیکن پھر تدریجاً اُس کے عادی ہو جاتے ہیں اور شاید ایک ایسا دن بھی آجائے کہ وہ اپنے بُرے اعمال کو واجب اور ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ان کی حق سے مخالفت کرنے اور گناہ پر ہٹ دھرمی اور اصرار کی سزاؤں میں سے ایک سزا ہے کہ جو ہٹ دھرم گنہگاروں کے دامن سے چمٹ جاتی ہے۔

اسی لیے ارشاد ہوتا ہے کہ ان کا معاملہ اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ "اگر وہ تمام آیات خدا اور اُس کی نشانیوں کو بھی دیکھ لیں تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے (وان یروا کل اٰیۃ لا یؤمنوا بھا)۔

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ بات ہے کہ جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے دل کے کانوں کو تیری باتوں کی طرف متوجہ کریں اور کم سے کم ایک حق کے متلاشی کی طرح کوئی نہ کوئی حقیقت معلوم ہو جانے کے احتمال میں ہی اس کے بارے میں کچھ غور کریں، وہ منفی روح اور منفی فکر کے ساتھ تیرے سامنے آتے ہیں اور لڑنے، جھگڑنے اور اعتراض کرنے کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا (حتیٰ اذا جاءوک یجادلونک)۔

وہ تیری اُن باتوں کو سُن کر جو چشمۂ وحی سے نکلی ہیں اور تیری حق گو زبان پر جاری ہوئی ہیں تجھ پر تہمت لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ باتیں گذشتہ انسانوں کے گھڑے ہوئے قصوں اور افسانوں کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتیں (یقول الذین کفروا ان ھٰذا الا اساطیر الاولین)۔

بعد والی آیت میں کہا گیا ہے کہ وہ صرف اتنی بات پر ہی قناعت نہیں کرتے اور باوجود اس کے کہ وہ خود گمراہ ہیں ہمیشہ اسی تلاش میں رہتے ہیں کہ حق کے متلاشی لوگوں کو اپنی طرح طرح کی زہر افشانیوں کے ذریعے اس راستے پر چلنے سے روکیں لہٰذا وہ انہیں پیغمبر کے قریب جانے سے منع کرتے ہیں (وھم ینھون عنہ) اور خود بھی اس سے دور دور ہی رہتے ہیں (وینئون عنہ)[1]۔

وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ جو شخص حق کے ساتھ الجھے اور اُس سے بیر رکھے اُس نے خود اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اور انجام کار قانونِ آفرینش کے مسلمہ اصول کے مطابق حق کا چہرہ باطل کے بادلوں کی اوٹ سے نمایاں ہو جاتا ہے اور حق " میں جو قوتِ جاذبہ پائی جاتی ہے اُس سے وہ کامیاب ہو کر رہے گا اور باطل اُس بے قدر و قیمت جھاگ کی طرح جو پانی کے اُوپر آجاتا ہے نابود ہو کر رہے گا۔ اس بنا پر ان کی کوشش اور فعالیت ان کی اپنی ہی شکست پر انجام پذیر ہوگی اور وہ خود اپنے سوا اور کسی کو بھی ہلاک نہیں کریں گے لیکن اُن میں اس حقیقت کو سمجھنے کی طاقت نہیں ہے (وان یھلکون الا انفسھم وما یشعرون)۔

---

[1] ینئون "نأی" کے مادہ سے ہے جو بروزن "سعی" ہے دوری اختیار کرنے کے معنی میں ہے۔

مومن قریش حضرت ابو طالب پر ایک بہت بڑی تہمت

اُوپر والی آیت کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت اُن ہٹوں سے متعلق ہے جو ہٹ دھرم مشرکین اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سخت ترین دشمنوں کے بارے میں ہیں۔ "ھُم" کی ضمیر عربی ادب کے قواعد کے مطابق اُن لوگوں کی طرف لوٹتی ہے جن کے بارے میں اِس آیت میں بحث کی گئی ہے یعنی وہ متعصب کافر جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرنے اور آزار پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے تھے۔

لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ سنت کے بعض مفسرین نے عربی ادب کے تمام قواعد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دوسری آیت کو پہلی آیت سے علیٰحدہ کر کے اُسے حضرت ابو طالب یعنی امیرالمومنین علیؑ کے والد کے لیے قرار دے دیا ہے۔ وہ آیت کا اس طرح معنی کرتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کا دفاع کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُس سے دور رہتے ہیں (وھم ینھون عنہ وینئون عنہ)۔

اور وہ قرآن کی کچھ اور آیات کو جن کے بارے میں ان کے اپنے مقام پر اشارہ ہو گا مثلاً سورہ توبہ کی آیت ۱۱۴ اور سورہ قصص کی آیت ۵۶ کو بھی اپنے مدعا پر گواہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن تمام علمائے شیعہ اور اہلِ سنت کے بعض بزرگ علماء مثلاً ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ نے اور قسطلانی نے ارشاد الساری میں اور زینی دحلان نے سیرۃ حلبی کے حاشیہ میں حضرت ابو طالب کو مومنین اہلِ اسلام میں سے بیان کیا ہے۔ اسلام کی بنیادی کتابوں کے منابع میں بھی ہمیں اس موضوع کے بہت سے شواہد ملتے ہیں کہ جن کے مطالعہ کے بعد ہم گہرے تعجب اور حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ حضرت ابو طالب ایک گروہ کی طرف سے اس قسم کی بے مہری اور اتہام کا محل کیوں قرار پا گئے ہیں؟

جو شخص اپنے تمام وجود کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کا دفاع کیا کرتا تھا اور بار ہا خود اپنے آپ کو اور اپنے فرزند کو پیغمبر اسلامؐ کے وجود مقدس کو بچانے کے لیے خطرات کے مواقع پر ڈھال بنا دیا کرتا تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس پر ایسی تہمت لگائی جائے۔

یہی سبب ہے کہ دقتِ نظر کے ساتھ تحقیق کرنے والوں نے یہ سمجھا ہے کہ حضرت ابو طالب کے خلاف مخالفت کی لہر ایک سیاسی ضرورت کی وجہ سے ہے جو شجرۂ خبیثۂ بنی اُمیہ کی حضرت علی علیہ السلام کے مقام و مرتبہ کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہے۔

کیونکہ یہ صرف حضرت ابو طالب کی ذات ہی نہیں تھی کہ جو حضرت علی علیہ السلام کے قرب کی وجہ سے ایسے حملے کی زد میں آئی ہو بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو تاریخ اسلام میں کسی طرح سے بھی امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے نزدیکی رکھتا ہے ایسے ناجوانمردانہ حملوں سے نہیں بچ سکا۔ حقیقت میں حضرت ابو طالب کا کوئی گناہ نہیں تھا سوائے

اس کے کہ وہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام جیسے عظیم پیشوائے اسلام کے باپ تھے۔

ہم یہاں پر اُن بہت سے دلائل میں سے جو واضح طور پر ایمانِ ابوطالب کی گواہی دیتے ہیں کچھ دلائل مختصر طور پر فہرست وار بیان کرتے ہیں۔ تفصیلات کے لیے اُن کتابوں کی طرف رجوع کریں جو اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

۱۔ حضرت ابوطالب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے خوب اچھی طرح سے جانتے تھے کہ اُن کا بھتیجا مقام نبوت تک پہنچے گا کیونکہ مورخین نے لکھا ہے کہ جس سفر میں حضرت ابوطالب قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے تھے تو اپنے بارہ سالہ بھتیجے محمد کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اس سفر میں انہوں نے آپ سے بہت سی کرامات مشاہدہ کیں۔ ان میں ایک واقعہ یہ ہے کہ جونہی قافلہ بحیرا نامی راہب کے قریب سے گزرا کہ جو قدیم عرصے سے ایک گرجے میں مشغول عبادت تھا اور کتبِ عہدین کا عالم تھا اور تجارتی قافلے اپنے سفر کے دوران اس کی زیارت کے لیے جاتے تھے، تو راہب کی نظریں قافلہ والوں میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جم کر رہ گئیں، جن کی عمر اس وقت بارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

بحیرا نے تھوڑی دیر کے لیے حیران و ششدر رہنے اور گہری اور پُر معنی نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا: یہ بچہ تم میں سے کس سے تعلق رکھتا ہے؟ لوگوں نے ابوطالب کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔

"بحیرا" نے کہا: اس بچہ کا مستقبل بہت درخشاں ہے، یہ وہی پیغمبر ہے کہ جس کی نبوت و رسالت کی آسمانی کتابوں نے خبر دی ہے اور میں نے اس کی تمام خصوصیات کتابوں میں پڑھی ہیں[1]

ابوطالب اس واقعہ اور اس جیسے دوسرے واقعات سے پہلے دوسرے قرائن سے بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور معنویت کو سمجھ چکے تھے۔

اہلِ سنت کے عالم شہرستانی (صاحب ملل و نحل) اور دوسرے علماء کی نقل کے مطابق ایک سال آسمانِ مکہ نے اپنی برکت اہلِ مکہ سے روک لی اور سخت قسم کی قحط سالی نے لوگوں کا رخ کیا تو ابوطالب نے حکم دیا کہ اُن کے بھتیجے محمد کو جو ابھی شیرخوار ہی تھے لایا جائے۔ جب بچے کو اس حال میں کہ وہ ابھی پوتڑے میں لپٹا ہوا تھا انہیں دیا گیا تو وہ اُسے لینے کے بعد خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور تضرع و زاری کے ساتھ اس طفل شیرخوار کو تین مرتبہ اُوپر کی طرف بلند کیا اور ہر مرتبہ کہتے تھے، پروردگارا، اس بچہ کے حق کا واسطہ ہم پر برکت والی بارش نازل فرما۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ افق کے کنارے سے بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اور مکہ کے آسمان پر چھا گیا اور بارش سے ایسا سیلاب آیا کہ یہ خوف پیدا ہونے لگا کہ کہیں مسجد الحرام ہی ویران نہ ہو جائے۔

اس کے بعد شہرستانی لکھتا ہے کہ یہی واقعہ جو ابوطالب کی اپنے بھتیجے کے بچپن سے اس کی نبوت و رسالت سے آگاہ ہونے پر دلالت کرتا ہے اُن کے پیغمبر پر ایمان رکھنے کا ثبوت بھی ہے اور ابوطالب نے بعد میں اشعار ذیل اسی

---

[1] تلخیص از سیرۃ ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۹۱ اور سیرۃ حلبی جلد اول صفحہ ۱۳۱ اور دیگر کتب۔

واقعہ کی مناسبت سے کہے تھے۔

وابیض یستسقی الغمام بوجهه — ثمال الیتامی عصمة الارامل

"وہ ایسا روشن چہرے والا ہے کہ بادل اس کی خاطر سے بارش برساتے ہیں وہ یتیموں کی پناہ گاہ اور بیواؤں کے محافظ ہیں"

یلوذ به الهلاك من آل هاشم — فهم عنده فی نعمة وفواضل

"بنی ہاشم میں سے جو چل بسے ہیں وہ اسی سے پناہ لیتے ہیں اور اسی کے صدقے میں نعمتوں اور احسانات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں"

ومیزان عدل لا یخیس شعیرة — ووزان صدق وزنه غیر هائل

"وہ ایک ایسی میزان عدالت ہے کہ جو ایک جَو برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں کرتا اور درست کاموں کا ایسا وزن کرنے والا ہے کہ جس کے وزن کرنے میں کسی شک وشبہ کا خوف نہیں ہے"

قحط سالی کے وقت قریش کا ابوطالب کی طرف متوجہ ہونا اور ابوطالب کا خدا کو آنحضرت کے حق کا واسطہ دینا شہرستانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سے عظیم مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ علامہ امینی نے اسے اپنی کتاب "الغدیر" میں "شرح بخاری"، "المواہب اللدنیہ"، "الخصائص الکبریٰ"، "شرح بہجۃ المحافل"، "سیرہ حلبی"، "سیرہ نبوی" اور "طلبۃ الطالب" سے نقل کیا ہے۔[1]

۲۔ اس کے علاوہ مشہور اسلامی کتابوں میں ابوطالب کے بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ہماری دسترس میں ہیں۔ اُن میں سے کچھ اشعار ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں:۔

والله لن یصلوا الیك بجمعهم — حتی اوسد فی التراب دفینا

"اے میرے بھتیجے خدا کی قسم جب تک ابوطالب مٹی میں نہ سو جائے اور لحد کو اپنا بستر نہ بنا لے دشمن ہرگز ہرگز تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے"

فاصدع بامرك ماعلیك غضاضة — وابشر بذاك وقر منك عیونا

"لہٰذا کسی چیز سے نہ ڈر اور اپنی ذمہ داری اور ماموریت کا ابلاغ کر، بشارت دے اور آنکھوں کو ٹھنڈا کر"

ودعوتنی وعلمت انك ناصحی — ولقد دعوت وکنت ثم امینا

"تو نے مجھے اپنے مکتب کی دعوت دی اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرا ہدف ومقصد صرف پند ونصیحت کرنا اور بیدار کرنا ہے، تو اپنی دعوت میں امین اور صحیح ہے"

---

[1] الغدیر جلد ہفتم صفحہ ۳۴۶۔

ولقد علمت ان دین محمد (ص) — من خیر ادیان البریة دینا[1]

"میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محمد کا دین و مکتب تمام دینوں اور مکتبوں میں سب سے بہتر دین ہے۔

اور یہ اشعار بھی انہوں نے ہی ارشاد فرمائے ہیں:

الم تعلموا انا وجدنا محمداً — رسولا کموسیٰ خط فی اول الکتب

"اے قریش کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کی مثل ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے مانند خدا کے پیغمبر اور رسول ہیں جن کے آنے کی پیشین گوئی پہلی آسمانی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے اور ہم نے اسے پالیا ہے۔"

وان علیہ فی العباد محبة — ولاحیف فی من خصہ اللہ فی الحب[2]

"خدا کے بندے اُس سے خاص لگاؤ رکھتے ہیں اور جسے خداوند تعالیٰ نے اپنی محبت کے لیے مخصوص کرلیا ہو اس شخص سے یہ لگاؤ بے موقع نہیں ہے۔"

ابن ابی الحدید نے جناب ابوطالب کے کافی اشعار نقل کرنے کے بعد (کہ جن کے مجموعہ کو ابن شہر آشوب نے "متشابہات القرآن" میں تین ہزار اشعار کہا ہے) کہتا ہے:

ان تمام اشعار کے مطالعہ سے ہمارے لیے کسی قسم کے شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ابوطالب اپنے بھتیجے کے دین پر ایمان رکھتے تھے۔

۳۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت سی ایسی احادیث بھی نقل ہوئی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان کے فداکار چچا ابوطالب کے ایمان پر گواہی دیتی ہیں۔ منجملہ ان کے کتاب "ابوطالب مومن قریش" کے مؤلف کی نقل کے مطابق ایک یہ ہے کہ جب ابوطالب کی وفات ہوگئی تو پیغمبر اکرمؐ نے ان کی تشیع جنازہ کے بعد اس سوگواری کے ضمن میں جو اپنے چچا کی وفات کی مصیبت میں آپ کر رہے تھے آپ یہ بھی کہتے تھے:

"واابتاہ! وا اباطالباہ! وا حزناہ علیک! کیف اسلو علیک یا من ربیتنی صغیرا۔ واجبتنی کبیرا، وکنت عندک بمنزلة العین من الحدقہ والروح من الجسد۔"[3]

ہائے میرے بابا! ہائے ابوطالب! میں آپ کی وفات سے کس قدر غمگین ہوں۔ کس طرح آپ کی مصیبت کو میں بھول جاؤں، اے وہ شخص جس نے بچپن میں میری پرورش اور تربیت کی اور بڑے ہونے پر میری دعوت پر لبیک کہی، میں آپ کے نزدیک اس طرح تھا جیسے آنکھ خانۂ چشم میں اور روح بدن میں۔

---

[1] و [2] خزانة الادب، تاریخ ابن کثیر، شرح ابن ابی الحدید، فتح باری، بلوغ الارب، تاریخ ابو الفدا، سیرۃ نبوی و..... (یہ حوالہ جات الغدیر جلد ۸ کے مطابق درج کئے گئے ہیں)۔

[3] "شیخ الاباطح" بنقل از ابوطالب مومن قریش۔

نیز آپ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ:

"ما نالت منی قریش شیئًا اکرھہ حتی مات ابو طالب"[1]

اہلِ قریش اس وقت تک کبھی میرے خلاف ناپسندیدہ اقدام نہ کر سکے جب تک ابو طالب کی وفات نہ ہو گئی۔

۴۔ ایک طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو ابو طالب کی وفات سے کئی سال پہلے یہ حکم مل چکا تھا کہ وہ مشرکین کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ رابطہ نہ رکھیں، اس کے باوجود ابو طالب کے ساتھ اس قسم کے تعلق اور مہر و محبت کا اظہار اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں مکتب توحید کا معتقد جانتے تھے، ورنہ یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی تھی کہ دوسروں کو تو مشرکین کی دوستی سے منع کریں اور خود ابو طالب سے عشق کی حد تک مہر و محبت رکھیں۔

۵۔ اُن احادیث میں بھی کہ جو اہلِ بیت پیغمبرؐ کے طرق سے ہم تک پہنچی ہیں حضرت ابو طالب کے ایمان و اخلاص کے بڑی کثرت سے مدارک نظر آتے ہیں، کہ جن کا یہاں نقل کرنا طول کا باعث ہوگا، یہ احادیث منطقی اور عقلی استدلالات کی حامل ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث جو چوتھے امام علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے اس میں امام علیہ السلام نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا ابو طالب مومن تھے؛ جواب دینے کے بعد ارشاد فرمایا:

ان ھنا قومًا یزعمون انہ کافر اس کے بعد فرمایا کہ:

"واعجبًا کل العجب ایطعنون علی ابی طالب او علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وقد نہاہ اللہ ان تقر مؤمنۃ مع کافر غیر آیۃ من القرآن ولا یشک احد ان فاطمۃ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا من المؤمنات السابقات فانہا لم تزل تحت ابی طالب حتی مات ابو طالب رضی اللہ عنہ"

"یعنی تعجب کی بات ہے کہ بعض لوگ یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ ابو طالب کافر تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ وہ اس عقیدہ کے ساتھ پیغمبرؐ اور ابو طالب پر طعن کرتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ قرآن کی کئی آیات میں اس بات سے منع کیا گیا ہے (اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ) مومن عورت ایمان لانے کے بعد کافر کے ساتھ نہیں رہ سکتی اور یہ بات مسلم ہے کہ فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا سابق ایمان لانے والوں میں سے ہیں اور وہ ابو طالب کی زوجیت میں ابو طالب کی وفات تک رہیں۔"[2]

۶۔ ان تمام باتوں کو چھوڑتے ہوئے اگر ہر چیز میں ہی شک کریں تو کم از کم اس حقیقت میں تو کوئی شک نہیں کر سکتا کہ ابو طالب اسلام اور پیغمبر اکرمؐ کے درجۂ اوّل کے حامی و مددگار تھے، ان کی اسلام اور پیغمبرؐ کی حمایت اس درجہ تک

---

[1] طبری: مطابق نقل ابو طالب مومن قریش۔

[2] کتاب الحجہ۔ درجات الرفیعہ نقل از الغدیر جلد ۸۔

پہنچی ہوئی تھی کہ جسے کسی طرح بھی رشتہ داری اور قبائلی تعصبات سے نتھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس کا زندہ نمونہ شعب ابوطالب کی داستان ہے۔ تمام مورخین نے لکھا ہے کہ جب قریش نے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کا ایک شدید اقتصادی، سماجی اور سیاسی بائیکاٹ کر لیا اور اپنے ہر قسم کے روابط اُن سے منقطع کر لیے تو آنحضرتؐ کے واحد حامی اور مدافع ابوطالب نے اپنے تمام کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا اور برابر تین سال تک ہاتھ کھینچے رکھا اور بنی ہاشم کو ایک درہ کی طرف لے گئے جو مکہ کے پہاڑوں کے درمیان تھا اور شعب ابوطالب کے نام سے مشہور تھا اور وہاں پر سکونت اختیار کر لی۔ ان کی فداکاری اس مقام تک جا پہنچی کہ قریش کے حملوں سے بچانے کے لیے کئی ایک مخصوص قسم کے بُرج تعمیر کرنے کے علاوہ ہر رات پیغمبر اکرمؐ کو ان کے بستر سے اُٹھاتے اور دوسری جگہ اُن کے آرام کے لیے مہیا کرتے اور اپنے فرزند دلبند علیؑ کو ان کی جگہ پر سلا دیتے اور جب حضرت علیؑ کہتے، بابا جان! میں تو اس حالت میں قتل ہو جاؤں گا تو ابوطالب جواب میں کہتے: میرے پیارے بچے بردباری اور صبر ہاتھ سے نہ چھوڑو، ہر زندہ موت کی طرف رواں دواں ہے۔ میں نے تجھے فرزند عبداللہ کا فدیہ قرار دے دیا ہے۔ یہ بات اور بھی طالب توجہ ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام باپ کے جواب میں کہتے ہیں کہ بابا جان! میرا یہ کلام اس بنا پر نہیں تھا کہ میں راہ محمدؐ میں قتل ہونے سے ڈرتا ہوں، بلکہ میرا یہ کلام اس بنا پر تھا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ میں کس طرح سے آپ کا اطاعت گزار اور احمد مجتبیٰ کی نصرت و مدد کے لیے آمادہ و تیار ہوں۔[1]

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص بھی تعصب کو ایک طرف رکھ کر غیر جانبداری کے ساتھ ابوطالب کے بارے میں تاریخ کی سنہری سطروں کو پڑھے گا تو وہ ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغہ کا ہمصدا ہو کر کہے گا:

ولولا ابوطالب و ابنه —— لما مثل الدين شخصا وقاما

فذاك بمكة آوى وحامى —— وهذا بيثرب جس الحماما[2]

"اگر ابوطالب اور ان کا بیٹا نہ ہوتے تو ہرگز دین و مکتب اسلام باقی نہ رہتا اور اپنا قد سیدھا نہ کرتا۔ ابوطالب تو مکہ میں پیغمبر کی مدد کے لیے آگے بڑھے اور علیؑ یثرب (مدینہ) میں حمایت اسلام کی راہ میں گرداب موت میں ڈوب گئے۔"

۲۷۔ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ○

۲۸۔ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا یُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

---

[1] الغدیر جلد ۸۔

[2] الغدیر جلد ۸۔

ترجمہ

۲۷۔ اگر تم (ان کی حالت) دیکھو جس وقت وہ آگ کے سامنے کھڑے ہوئے کہتے ہیں کہ کاش ہم (دوبارہ دنیا کی طرف) پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی باتوں کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین میں سے ہو جاتے۔

۲۸۔ (وہ واقع میں پشیمان نہیں ہیں) بلکہ اُن کے وہ اعمال و نیات جنہیں وہ پہلے چھپائے ہوئے تھے ان کے سامنے آشکار ہو گئے (اور وہ وحشت میں پڑ گئے ہیں) اور اگر وہ پلٹ جائیں تو وہ پھر انہی اعمال کی طرف لوٹ جائیں گے جن سے انہیں روکا گیا ہے۔ اور وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔

تفسیر

وقتی اور بے اثر بیداری

گذشتہ دو آیات میں مشرکین کی ہٹ دھرمی کے کچھ اعمال کی طرف اشارہ ہوا تھا اور ان دو آیات میں ان کے اعمال کے نتائج کا منظر مجسم ہوا ہے تاکہ وہ دیکھ لیں کہ انہیں کیسا بُرا انجام در پیش ہے اور وہ بیدار ہو جائیں یا کم از کم ان کی کیفیت دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اگر تم ان کی حالت جب وہ قیامت کے دن جہنم کی آگ کے سامنے کھڑے ہوں گے، دیکھو، تو تم تصدیق کرو گے کہ وہ کس دردناک انجام و عاقبت میں گرفتار ہوئے ہیں (ولو تری اذ وقفوا علی النار ......)[1]۔

وہ اس حالت سے اس طرح منقلب ہوں گے کہ داد و فریاد کریں گے کاش اس سرنوشت شوم سے نجات اور بُرے کاموں کی تلافی کے لیے دوبارہ دنیا میں پلٹ جاتے، اور وہاں آیات خدا کی تکذیب نہ کرتے اور مومنین کی صف میں قرار پاتے (فقالوا یٰلیتنا نرد ولا نکذب بآیٰت ربنا و نکون من المؤمنین)[2]۔

---

[1] اس بنا پر " لو " بمعنی شرط ہے اور اس کی جزا وضاحت کی وجہ سے محذوف ہے۔

[2] اہم نکتہ کہ جس کی طرف توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ مشہور قرائت کے مطابق جو دسترس میں ہے " نرد " رفع کے ساتھ اور " لا نکذب " اور " نکون " نصب کے ساتھ پڑھا گیا ہے، حالانکہ ظاہراً ایک دوسرے پر معطوف ہیں لہٰذا تمام کو ایک جیسا ہونا چاہیے۔ اس کی بہترین توجیہ یہ ہے کہ " نرد " جزء تمنی ہے اور " لا نکذب " حقیقت میں اس کا جواب ہے اور " واؤ " یہاں بمنزلہ " فا " کے ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمنی کا جواب جب " فا " کے بعد ہو تو منصوب ہوتا ہے، فخر الدین رازی، مرحوم طبرسی اور ابوالفتوح رازی جیسے مفسرین نے اس کی اور وجوہ بھی ذکر کی ہیں، لیکن جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ سب سے زیادہ واضح ہے اس بنا پر یہ آیت سورہ " زمر " کی آیہ ۵۸ کے مشابہ ہے جو اس طرح ہے: لو ان لی کرۃ فاکون من المحسنین۔

بعد والی آیت میں کہا گیا ہے کہ یہ جھوٹی آرزو ہے بلکہ یہ اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں جو عقائد نیتیں اور اعمال انہوں نے چھپا رکھے تھے وہ سب اُن کے سامنے آشکار ہو گئے ہیں اور وہ وقتی طور پر بیدار ہوگئے ہیں (بل بدا لھم ما کانوا یخفون من قبل)۔

لیکن یہ پائیدار اور محکم بیداری نہیں ہے، اور مخصوص حالات میں پیدا ہوئی ہے لہٰذا " اگر بفرض محال وہ دوبارہ اس جہاں میں پلٹ بھی جائیں تو انہی کاموں کے پیچھے نکلیں گے جن سے انہیں روکا گیا تھا (ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ)۔

اس بنا پر وہ اپنی آرزو اور مدعا میں سچے نہیں ہیں اور وہ جھوٹ بولتے ہیں (وانھم لکاذبون)۔

چند اہم نکات

۱۔ " بدالھم " (ان کے لیے آشکار ہوا) سے ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حقائق کے ایک سلسلہ کو نہ صرف لوگوں سے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی مخفی رکھتے تھے جو قیامت کے دن اُن پر آشکار ہو جائیں گے اور یہ مقام تعجب نہیں ہے کہ انسان کسی حقیقت کو خود اپنے آپ تک سے بھی مخفی رکھے اور اپنے وجدان اور فطرت پر پردہ ڈال دے تاکہ وہ جھوٹا اطمینان حاصل کرے۔

وجدان کو فریب دینے کا مسئلہ اور حقائق کو اپنے آپ سے چھپانا اہم مسائل میں سے ہے کہ جس پر وجدان کی فعالیت سے مربوط بحثوں میں خصوصی غور و فکر کیا گیا ہے۔ مثلاً ہم بہت سے ہوس پرست افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے ہوس آلود اعمال کے شدید نقصان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس سبب سے کہ راحت کے خیال سے اپنے اعمال کو جاری رکھیں یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اس آگاہی کو اپنے اندر ہی چھپائے رکھیں۔

لیکن بہت سے مفسرین نے لفظ " لھم " کی تعبیر کی طرف توجہ کیے بغیر آیت کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ ایسے اعمال پر منطبق ہو کہ جنہیں وہ لوگوں سے مخفی رکھتے تھے (غور کیجئے)۔

۲۔ ممکن ہے کہا جائے کہ آرزو کرنا کوئی ایسی چیز نہیں کہ جس میں جھوٹ یا سچ ہو اور وہ اصطلاح میں " انشاء " کی ایک قسم ہے اور " انشاء " میں جھوٹ یا سچ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سے " انشاء " ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ کسی خبر کا مفہوم بھی موجود ہوتا ہے، جن میں صدق یا کذب کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میری تمنا یہ ہے کہ خدا مجھے بہت سا مال دے تو میں تمہاری مدد کروں۔ یہ ایک آرزو ہے۔ لیکن اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر خدا مجھے ایسا مال دیدے تو میں تمہاری مدد کروں گا اور یہ ایک خبری مفہوم ہے۔ جو ہو سکتا ہے جھوٹا ہو۔ لہٰذا مد مقابل جو اُس کے بخل اور تنگ نظری سے آگاہ ہے کہتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، اگر خدا تجھے دے بھی دے تو پھر بھی تو ہرگز ایسا نہیں کرے گا (ایسی صورت بہت سے انشائی جملوں میں نظر آتی ہے)۔

۳۔ یہ جو ہم آیت میں پڑھتے ہیں کہ اگر وہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو دوبارہ وہی کام کرنے لگیں گے، یہ اس بنا پر ہے کہ بہت سے لوگ جس وقت اپنی آنکھ سے اپنے اعمال کے نتائج دیکھتے ہیں، یعنی مرحلہ شہود کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ وقتی طور پر پریشان اور پشیمان ہو کر یہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے اعمال کی تلافی کر سکیں۔ لیکن یہ ندامت

اور پشیمانیاں جو اسی حال شہود اور عمل کا نتیجہ دیکھنے سے مربوط ہیں، ناپائیدار ہوتی ہیں جو تمام لوگوں میں عینی سزاؤں کا سامنا کرتے وقت پیدا ہوتی رہتی ہیں لیکن جب مشاہدات عینی برطرف ہو جاتے ہیں تو یہ خاصیت بھی زائل ہو جاتی ہے اور سابقہ کیفیت پلٹ آتی ہے۔

انہی بت پرستوں کی طرح کہ جو سمندر کے سخت طوفانوں میں گرفتار ہونے پر اور خود کو موت اور فنا کے منہ میں جاتے ہوئے دیکھ کر خدا کے سوا تمام چیزیں بھول جاتے ہیں لیکن جونہی طوفان رکتا ہے اور وہ امن وامان کے ساحل تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر تمام چیزیں اپنی جگہ پلٹ آتی ہیں[1]

۴۔ اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ مذکورہ بالا حالات بت پرستوں کی ایک خاص جماعت کے ساتھ مخصوص ہیں کہ جن کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے یہ نہیں کہ سب بت پرست ایسے تھے۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات پر مامور تھے کہ باقی تمام کو پند و نصیحت کریں، انہیں بیدار کریں اور ہدایت کریں۔

۲۹۔ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ○

۳۰۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○

۳۱۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ○

۳۲۔ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

ترجمہ

۲۹۔ انہوں نے کہا: اس دنیاوی زندگی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور ہم ہرگز دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے نہیں جائیں گے۔

---

[1] یونس۔ ۲۲۔

۳۰۔ اگر تم انہیں اس وقت دیکھو جب وہ اپنے پروردگار (کی عدالت) کے سامنے کھڑے ہوں گے تو انہیں کہا جائے گا: کیا یہ حق نہیں ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں کہیں گے: جی ہاں! ہمارے پروردگار کی قسم (یہ حق ہے)۔ تو وہ کہے گا: جس بات کا تم انکار کیا کرتے تھے اس کی سزا میں اب عذاب کا مزہ چکھو۔

۳۱۔ جنہوں نے لقائے پروردگار کا انکار کیا مسلمہ طور پر انہوں نے نقصان اٹھایا (اور یہ انکار ہمیشہ رہے گا) یہاں تک کہ قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے ہائے افسوس کہ ہم نے اس کے بارے میں کوتاہی کی۔ وہ اپنے گناہوں کا (بھاری بوجھ) اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوں گے اور کیسا بُرا بوجھ ہے جو انہوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہوگا۔

۳۲۔ اور دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ہے اور آخرت کا گھر اُن لوگوں کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگار ہیں۔ کیا تم سوچتے نہیں ہو۔

تفسیر

پہلی آیت کی تفسیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک احتمال تو یہ ہے کہ یہ ہٹ دھرم اور سخت قسم کے مشرکین کی گفتگو کے بعد ہونے والی حالت کی نشاندہی ہے کہ جو قیامت کا منظر دیکھ کر یہ آرزو کریں گے کہ دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور تلافی کریں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ لوگ پلٹ بھی جائیں تو نہ صرف یہ کہ تلافی کی فکر نہیں کریں گے اور اپنے کاموں کو جاری رکھیں گے بلکہ اصلاً دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے جانے اور قیامت کا ہی انکار کردیں گے اور بڑے تعجب کے ساتھ کہیں گے کہ زندگی تو صرف یہ دنیاوی زندگی ہی ہے اور اب ہم کبھی دوبارہ زندہ کرکے اٹھائے نہیں جائیں گے (وقالوا ان ھی الا حیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین)[1]

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہ آیت مشرکین کے ایک ایسے گروہ کے بارے میں ہے کہ جو معاد کا بالکل ہی انکار کرتے تھے اور یہ ایک جدا بحث پیش کر رہی ہے کیونکہ مشرکین عرب میں ایک ایسی جماعت بھی تھی جو معاد کا عقیدہ نہیں رکھتی تھی جبکہ بعض ایسے لوگ بھی تھے جو کسی نہ کسی طرح معاد پر ایمان رکھتے تھے۔

بعد کی آیت میں قیامت کے دن ان کے انجام کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے قرآن یوں کہتا ہے: اگر تم

---

[1] اس احتمال کے مطابق "وقالوا" عطف ہے "عادوا" پر اور اس احتمال کو تفسیر "المنار" کے مؤلف نے اختیار کیا ہے۔

اُس وقت انہیں دیکھو کہ جب وہ اپنے پروردگار کی بارگاہ میں کھڑے ہوں گے اور اُن سے کہا جائے گا کیا یہ حق نہیں ہے؛ (ولو ترى اذ وقفوا على ربهم قال اليس هٰذا بالحق) تو وہ جواب میں کہیں گے: جی ہاں! ہمارے پروردگار کی قسم یہ حق ہے (قالوا بلى وربنا)۔

دوبارہ اُن سے کہا جائے گا: پس تم عذاب اور سزا کا مزہ چکھو، کیونکہ تم اس کا انکار کیا کرتے تھے اور کفر کرتے تھے (قال فذوقوا العذاب بما كنتم تكفرون)۔

مسلمہ طور پر (پروردگار کے سامنے کھڑے ہونا) یہ نہیں ہے کہ خدا کوئی مکان رکھتا ہو بلکہ یہ اس کی سزا کے سامنے کھڑا ہونے کے معنی میں ہے جیسا کہ بعض مفسرین نے بیان کیا ہے یا یہ عدالت الٰہی میں حاضر ہونے کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ نماز کے وقت انسان یہ کہتا ہے کہ میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں۔

بعد والی آیت میں معاد و قیامت کا انکار کرنے والوں کے نقصان اور گھاٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جنہوں نے پروردگار کی ملاقات کا انکار کیا ہے مسلمہ طور پر نقصان میں گرفتار ہیں (قد خسر الذين كذبوا بلقاء الله)۔

جیسا کہ پہلے اشارتاً بیان کیا جا چکا ہے پروردگار کی ملاقات سے مراد یا تو ملاقات معنوی اور ایمان شہودی ہے (شہود باطنی) یا میدان قیامت اور اس کی جزا و سزا کے مناظر سے ملاقات ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ انکار ہمیشہ کے لیے جاری نہیں رہے گا اور یہ صرف اس وقت تک ہو گا جب اچانک قیامت برپا ہو جائے اور وہ ان وحشتناک مناظر کا سامنا کریں اور اپنے اعمال کے نتائج اپنی آنکھ سے دیکھ لیں، اس موقع پر ان کی فریاد بلند ہو گی: ہائے افسوس! ہم نے ایسے دن کے لیے کس قدر کوتاہی کی تھی (حتى اذا جاءتهم الساعة بغتة قالوا يا حسرتنا على ما فرطنا فيها)۔ "ساعت" سے مراد ہے قیامت کا دن، اور "بغتة" کا معنی ہے بطور ناگہانی اور اچانک کہ جس کے وقت کو خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، واقع ہو جائے گی اور قیامت کے دن کے لیے اس نام (ساعة) کے انتخاب کا سبب یا تو یہ ہے کہ اس گھڑی لوگوں کا حساب بڑی تیزی کے ساتھ انجام پائے گا اور یا یہ اس کے ناگہانی طور پر وقوع پذیر ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لوگ عالم برزخ سے عالم قیامت کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔

"حسرت" کا معنی "کسی چیز پر افسوس کرنا" ہے، لیکن عرب جب زیادہ متاثر ہوں تو خود حسرت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں "یا حسرتنا" گویا حسرت کی شدت و سختی اس قدر ہے جیسے وہ ایک موجود چیز کی شکل میں اُن کے سامنے مجسم کھڑی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے وہ گناہوں کا بوجھ اپنے دوش پر لیے ہوئے ہیں (وهم يحملون اوزارهم على ظهورهم)۔ "اوزار" جمع ہے "وزر" کی جس کا معنی ہے سنگین بوجھ، اور یہاں اس سے مراد گناہ ہیں اور یہ آیت تجسم اعمال کی ایک دلیل بن سکتی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذمہ داری اور جوابدہی کے بار کی سنگینی مراد ہو، کیونکہ ذمہ داریوں کو ہمیشہ بھاری بوجھ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں فرماتا ہے "کیسا برا بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوں گے (الا ساء ما یزرون)۔

مندرجہ بالا آیت میں منکرین معاد کے خسارے اور نقصان کی کچھ باتیں بیان ہوئی ہیں۔ اس بات کی دلیل واضح ہے کیونکہ معاد پر ایمان رکھنا علاوہ اس کے کہ انسان کو ہمیشہ کی سعادت بخش زندگی کے لیے آمادہ کرتا ہے اور اسے کمالات علمی وعملی کی تحصیل کی دعوت دیتا ہے، آلودگیوں اور گناہوں کے مقابلہ میں انسان کو کنٹرول کرنے میں بھی گہرا اثر رکھتا ہے۔ ہم معاد سے مربوط مباحث میں انشاء اللہ انفرادی واجتماعی نظر سے اس کے اصلاحی اثر کو وضاحت سے بیان کریں گے۔

اس کے بعد آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کی حیثیت بیان کرنے کے لیے یوں ارشاد ہوتا ہے، دنیاوی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں (وما الحیوۃ الدنیا الا لعب ولھو)۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے صرف دنیا سے دل باندھا ہوا ہے اور اس کے علاوہ اور کسی چیز کے نہ وہ خواہش مند ہیں اور نہ ہی طلبگار ہیں درحقیقت یہ ایسے ہوس باز بچے ہیں کہ جنہوں نے عمر کا ایک حصہ کھیل کود میں گزار دیا ہے اور ہر چیز سے بے خبر رہے ہیں۔

دنیاوی زندگی کو لہو ولعب سے تشبیہ اس وجہ سے دی گئی ہے کیونکہ عام طور پر کھیل کود کے کام اندر سے خالی اور بے بنیاد ہوتے ہیں، جو حقیقی زندگی کے متن سے دور ہیں۔ نہ تو وہ شکست کھاتے ہیں، جنہوں نے فی الحقیقت شکست کھائی ہے اور نہ ہی وہ شکست یافتہ ہوتے ہیں جنہوں نے بازی کو جیت لیا ہے کیونکہ کھیل کے ختم ہونے پر ہر چیز اپنی جگہ پر لوٹ جاتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے ایک دوسرے کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور کھیل شروع کر دیتے ہیں ایک کو "امیر" اور دوسرے کو "وزیر"، ایک کو "چور" اور ایک کو قافلہ بناتے ہیں، لیکن تھوڑی سی دیر نہیں گزرتی کہ نہ کوئی امیر رہتا ہے نہ وزیر، نہ چور رہتا ہے اور نہ قافلہ۔

یا نمائشیں جو کھیل کود کے طور پر انجام پاتی ہیں اُن میں جنگ، عشق یا دشمنی کے منظر مجسم ہوتے ہیں لیکن گھڑی بھر کے بعد کسی چیز کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔

دنیا ایک ڈرامے کی طرح ہی ہے کہ جس کے کردار اس دنیا کے لوگ ہیں اور کبھی کبھی یہ بچگانہ کھیل ہمارے عقلمندوں اور فہمیدہ لوگوں تک کو بھی اپنے میں مشغول رکھتا ہے، لیکن بہت جلدی کھیل اور ڈرامہ ختم ہونے کا اعلان ہو جاتا ہے۔

"لعب" (بروزن لزج) اصل میں مادہ لعاب (بروزن غبار) لعاب دہن اور رالوں کے معنی میں ہے جو لبوں سے گرتی ہیں اور یہ جو کھیل کو لعب کہتے ہیں اس بنا پر ہے کہ وہ بھی منہ سے رال کے گرنے کی طرح ہے، جو بغیر کسی مقصد کے انجام پاتا ہے۔

اس کے بعد آخرت کی زندگی کا اس سے موازنہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: آخرت کا گھر متقی لوگوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم فکر نہیں کرتے اور عقل سے کام نہیں لیتے ہو (وللدار الاخرۃ خیر للذین یتقون افلا تعقلون)۔

کیونکہ وہ فنا نہ ہونے والی اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، جس کا جہاں بہت وسیع ہے، اور جس کی سطح بہت ہی اونچی ہے۔ وہ ایک ایسے عالم میں ہے جس کا تعلق حقیقت کے ساتھ ہے نہ کہ مجاز کے ساتھ۔ وہ ایک واقعیت ہے خیال نہیں ہے۔ وہ ایک ایسا جہان ہے جس کی نعمتیں درد و رنج کے ساتھ ملی ہوئی نہیں ہیں اور سراسر خالص نعمتیں ہی نعمتیں ہیں جن میں دُکھ تکلیف نہیں ہے۔

چونکہ ان واقعات کو صحیح طور پر سمجھنا، دنیا کے فریب دینے والے مظاہر کو پیش نظر رکھتے ہوئے، غور و فکر کرنے والے لوگوں کے سوا دوسروں کے لیے ممکن نہیں ہے لہٰذا آیت کے آخر میں روئے سخن ایسے ہی افراد کی طرف ہے۔

ایک حدیث میں جو ہشام بن حکم کے واسطے سے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے، آپ نے یوں فرمایا ہے:

اے ہشام! خدا نے عقلمند لوگوں کو نصیحت کی ہے اور آخرت کے لیے تعلق رکھنے والا بنایا ہے، اور کہا ہے کہ دنیا کی زندگی سوائے کھیل کود کے اور کچھ نہیں ہے اور دارِ آخرت متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیے بہتر ہے، کیا تم اپنی عقل اور فکر کو کام میں نہیں لاتے ہو۔[1]

شاید یہ بات ذکر کرنے کی ضرورت نہ ہو کہ ان آیات کا ہدف اور اصل مقصد مادی دنیا کے مظاہر کے ساتھ دل لگانے اور وابستگی اختیار کرنے اور اس کے آخری مقصد کو بھلا دینے کے خلاف جہاد ہے۔ ورنہ وہ لوگ جنہوں نے دنیا کو حصولِ سعادت کا وسیلہ قرار دے لیا ہے وہ حقیقت میں آخرت کے متلاشی ہیں نہ کہ دنیا کے۔

۳۳۔ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ○

۳۴۔ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ ○

ترجمہ

۳۳۔ ہم جانتے ہیں کہ تجھے ان لوگوں کی گفتگو غمگین کر دیتی ہے (مگر تم غم نہ کھاؤ اور جان لو) کہ وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ وہ ظالم تو آیاتِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۱ صفحہ ۷۱۱۔

۳۴۔ تجھ سے پہلے پیغمبروں کی بھی تکذیب کی گئی ہے مگر انہوں نے اُن تکذیبوں کے مقابلہ میں صبر کیا اور استقامت سے کام لیا اور (اس راہ میں) انہوں نے رنج و تکلیف اٹھائی، یہاں تک کہ ہماری مدد اُن تک آن پہنچی (تم بھی اسی طرح رہو اور یہ اللہ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے) اور کوئی چیز اللہ کی سنتوں کو بدل نہیں سکتی اور تمہیں گذشتہ پیغمبروں کی خبریں تو پہنچ ہی گئی ہیں۔

تفسیر

مصلحین کے راستے میں ہمیشہ مشکلات رہی ہیں

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی منطقی گفتگو اور فکری مبارزات میں جو وہ ہٹ دھرم اور سخت مشرکین کے ساتھ رکھتے تھے بعض اوقات ان کی ہٹ دھرمی سے اور اپنی باتوں سے اُن کی روح میں اثر نہ ہونے سے اور بعض اوقات ان کی اُن غیر مناسب نسبتوں سے جو وہ حضرتؐ کی طرف دیتے تھے غمگین اور اندوہ ناک ہو جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ بارہا قرآن مجید میں اپنے پیغمبرؐ کو ایسے مواقع پر تسلی اور دلاسا دیا کرتا تھا تاکہ آنحضرتؐ زیادہ گرمجوشی اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنے پروگرام میں مشغول رہیں۔ انہی میں سے مندرجہ بالا آیات بھی ہیں پہلی آیت میں فرماتا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تجھے محزون و مغموم کر دیتی ہیں (قد نعلم انه لیحزنك الذی یقولون)۔

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے وہ تو درحقیقت ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اصل مخالف تو حقیقت میں ہم ہیں نہ کہ تم (فانهم لا یکذبونك ولکن الظّٰلمین بأیات الله یجحدون)۔

اور اس بات کی نظیر ہمارے درمیان گفتگو میں بھی نظر آتی ہے جبکہ بعض اوقات بزرگ تر شخصیت اپنے نمائندے کے ناراحت ہونے کے وقت اُس سے کہتی ہے کہ تم کوئی غم نہ کرو یہ اصل میں تو انہوں نے میری مخالفت کی ہے، لہٰذا اگر کوئی مشکل پیدا ہوگی تو وہ میرے لیے ہوگی نہ کہ تمہارے لیے اور اس طرح سے وہ شخصیت اس کی تسلی و تشفی کے اسباب مہیا کرتی ہے۔

زیرِ نظر آیت میں مفسرین نے کچھ اور احتمالات بھی پیش کیے ہیں۔ لیکن ظاہر مفہوم وہی ہے جو ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں۔

یہ احتمال بھی ایک جہت سے قابلِ ملاحظہ ہے کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ تیرے مخالفین حقیقت میں تو تیرے صدق و راستی کے معتقد ہیں اور تیری دعوت کے حق ہونے میں شک نہیں رکھتے اگرچہ ان کے منافع خطرے میں پڑ جانے کا خوف ان کے لیے حق کو تسلیم کرنے میں مانع ہو جاتا ہے یا تعصب اور ہٹ دھرمی اسے قبول کرنے کی اجازت

نہیں دیتی۔

تواریخ اسلامی سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سخت ترین دشمن تک باطناً آپ کی صداقت اور راست بازی کے معتقد تھے۔ ان میں سے ایک یہ واقعہ ہے کہ ایک دن ابوجہل نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے مصافحہ کیا، تو کسی نے اس پر اعتراض کیا: تم اس شخص سے مصافحہ کیوں کر رہے ہو۔ اس نے کہا: خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ وہ پیغمبر ہے لیکن کیا ہم کسی زمانے میں "عبد مناف" کے تابع اور پیرو رہے ہیں، (یعنی اس کی دعوت کو قبول کرنا اس بات کا سبب بن جائے گا کہ ہم ان کے قبیلہ کے تابع ہو جائیں) اور یہ بھی تاریخوں میں لکھا ہوا ہے کہ ایک رات ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق، جو مشرکین مکہ کے سردار اور رئیس تھے ہیں سے ہر ایک اپنے مخفی طریقے سے کہ کوئی شخص ان کی طرف متوجہ نہ ہو، یہاں تک کہ یہ تینوں افراد بھی ایک دوسرے کی حالت سے باخبر نہیں تھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات سننے کے لیے ایک گوشہ میں چھپ کر بیٹھ گئے اور صبح تک آیات قرآن کی تلاوت سنتے رہے۔ جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو وہاں سے چلتے بنے لیکن لوٹتے وقت راستہ میں ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہو گیا تو ہر ایک اپنا عذر دوسرے سے بیان کرنے لگا۔ پھر انہوں نے عہد کیا کہ اب دوبارہ یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ اگر قریش کے جوانوں کو اس بات کی خبر ہو گئی تو یہ بات ان کے محمدؐ کی طرف جھکاؤ کا سبب بن جائے گی۔

دوسری رات اس گمان سے کہ اس کے ساتھی اس رات نہیں آئیں گے ہر ایک آیات قرآن سننے کی غرض سے پیغمبرؐ کے گھر کے قریب یا مسلمانوں کے مجمع کے قریب آ گیا۔ لیکن صبح ہوتے ہی پھر ان کا راز ایک دوسرے پر فاش ہو گیا اور ایک دوسرے کو سرزنش اور ملامت کرنے لگے اور نئے سرے سے عہد و پیمان باندھا کہ یہ آخری بار ہے۔

لیکن اتفاق کی بات ہے کہ یہ کام تیسری رات پھر دہرایا گیا، جب صبح ہوئی تو اخنس بن شریق اپنا عصا لیے ہوئے ابوسفیان کی تلاش میں نکلا اور اُس سے کہنے لگا۔ مجھے صاف صاف بتا کہ تمہارا اُن باتوں کے بارے میں جو تم نے محمدؐ سے سنی ہیں کیا عقیدہ ہے۔ تو وہ کہنے لگا خدا کی قسم کچھ چیزیں تو میں نے ایسی سنی ہیں جنہیں میں نے اچھی طرح جان لیا ہے اور ان کا مقصود و مضمون اچھی طرح سمجھ لیا ہے لیکن کچھ ایسی آیات بھی سنی ہیں جن کا معنی و مقصد میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اخنس نے کہا خدا کی قسم میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں اس کے بعد وہ اٹھا اور ابوجہل کی تلاش میں گیا اور یہی سوال اُس سے کیا کہ اُن باتوں کے بارے میں جو تم نے محمدؐ سے سنی ہیں تمہاری کیا رائے ہے۔ اُس نے کہا تو کیا سننا چاہتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اور اولاد عبد مناف سرداری کے حصول میں ایک دوسرے کے رقیب ہیں۔ انہوں نے لوگوں کو کھانا کھلایا تو ہم نے بھی اس غرض سے کہ کہیں پیچھے نہ رہ جائیں کھانا کھلایا، انہوں نے سواریاں بخشیں تو ہم نے بھی سواریاں بخشیں، انہوں نے اور دوسری عنایات کیں تو ہم نے بھی اور دوسری عنایات کیں تو اس طرح سے ہم ایک دوسرے کے دوش بدوش تھے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہم میں پیغمبر ہے کہ جس پر آسمانی وحی نازل ہوتی ہے لیکن اب ہم اس امر میں ان کی رقابت کس طرح کر سکتے ہیں (واللہ لا نؤمن بہ ابدًا ولا نصدقہ) خدا کی قسم ہم کبھی بھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے، اخنس کھڑا ہو گیا اور اس کی مجلس سے نکل گیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن "اخنس بن شریق" کا ابوجہل سے آمنا سامنا ہوگیا جب کہ وہاں پر اور کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا۔ تو اخنس نے اس سے کہا: سچ بتاؤ محمدؐ سچا ہے یا جھوٹا، قریش میں سے کوئی شخص سوا میرے اور تیرے یہاں موجود نہیں ہے جو ہماری باتوں کو سنے۔

ابوجہل نے کہا: وائے ہو تجھ پر خدا کی قسم! وہ میرے عقیدے میں سچ کہتا ہے اور اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا لیکن اگر یہ اس بات کی بنا ہو جائے کہ محمدؐ کا خاندان سب چیزوں کو اپنے قبضہ میں کرلے، حج کا پرچم، حاجیوں کو پانی پلانا، کعبہ کی پردہ داری اور مقام نبوت تو باقی قریش کے لیے کیا باقی رہ جائے گا[1]

ان روایات اور ان ہی جیسی دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے سخت ترین دشمن باطناً آپ کی سچائی کے معترف تھے لیکن قبائلی رقابتیں اور اسی قسم کی دوسری باتیں انہیں اجازت نہیں دیتی تھیں یا وہ اس بات کی جرأت نہیں رکھتے تھے کہ باقاعدہ ایمان لے آئیں۔

البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کا باطنی اعتقاد جب تک روح تسلیم کے ساتھ نہ ملا ہو کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا اور انسان کو سچے مومنین کے زمرہ میں قرار نہیں دیتا۔

بعد والی آیت میں، اس تسلّی کی تکمیل کے لیے گذشتہ انبیاء کے حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: یہ امر صرف تیری ذات کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے بلکہ تجھ سے پہلے جتنے رسول گزرے ہیں ان کی بھی اسی طرح سے تکذیب کی جاتی تھی (ولقد کذبت رسل من قبلك)۔

لیکن ان انبیاء نے ان تکذیبوں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں پامردی اور استقامت دکھائی یہاں تک کہ ہماری مدد نصرت ان کو پہنچی اور آخرکار وہ کامیاب ہوئے (فصبروا علی ما کذبوا و اوذوا حتی اتاھم نصرنا)۔

اور یہ ایک سنت الٰہی ہے کہ جسے کوئی چیز دگرگوں نہیں کرسکتی (ولا مبدل لکلمات اللہ)۔

اس بنا پر تم بھی ان تکذیبوں اور آزاروں اور سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کے حملوں کے مقابلے میں صبر و استقامت سے کام لو اور یہ جان لو کہ اسی سنت کے مطابق خداوند تعالیٰ کی امداد اور پروردگار عالم کے بے انتہا الطاف تمہیں حاصل ہوں گے اور آخرکار تم بھی ان سب پر کامیابی حاصل کروگے اور وہ خبریں جو گذشتہ پیغمبروں کے حالات کی تجھ تک پہنچی ہیں کہ انہوں نے مخالفتوں اور شدائد کے مقابلے میں کس طرح صبر و تحمل کیا اور کامیاب ہوئے، وہ تمہارے لیے ایک واضح و روشن گواہ ہیں (ولقد جاءك من نبأ المرسلین)۔

درحقیقت اوپر والی آیت ایک بنیادی کلیہ کی طرف اشارہ کررہی ہے اور وہ کلیہ یہ ہے کہ ہمیشہ معاشرے کے صالح رہنما جو پست افکار اور معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط رسموں اور خرافات کے مقابلے میں اصلاحی پروگرام پیش کرنے اور صحیح راہ دکھانے کے لیے قیام کرتے ہیں، انہیں ایسے منافع خور اور دروغ گو لوگوں کی سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا

---

[1] مندرجہ بالا روایات تفسیر المنار اور مجمع البیان سے اس آیت کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر سے لی گئی ہیں۔

تھا کہ جن کے منافع اس جدید دین و مذہب کی ترقی سے خطرے میں پڑ جاتے تھے۔

وہ اپنے بُرے مقاصد کی پیش رفت کے لیے کسی بھی بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے اور تمام حربے مثلاً تکذیب کا حربہ، تہمت کا حربہ، محاصرۂ اجتماعی کا حربہ، تکلیفیں اور دکھ پہنچانے کا حربہ، قتل کرنے اور لوٹ مار کرنے کا حربہ غرضیکہ وہ ہر وسیلے کو کام میں لاتے تھے لیکن حقیقت اپنی اُس جذب و کشش اور گہرائی کے ذریعہ جو اُس کے اندر ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی کے مطابق۔ آخر کار اپنا کام کرے گی اور راستے کے یہ تمام کانٹے ایک ایک کرکے سب ختم ہو جائیں گے۔

لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ اس کامیابی کی بنیادی شرط بردباری، مقاومت، پامردی اور استقامت ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سنن کو "کلمات اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ "کلم و کلام" دراصل ایک ایسی تاثیر کے معنی میں ہے کہ جو آنکھ یا کان سے محسوس ہو سکے "کلم" "تاثیرات عینی کے معنی میں ہے اور "کلام" "ان تاثیرات" کو کہتے ہیں جو کانوں سے محسوس کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس میں وسعت پیدا ہو گئی اور اب "الفاظ" کے علاوہ معانی پر بھی "کلمہ" کا لفظ بولا جانے لگا ہے۔ یہاں تک کہ "عقیدہ"، "مکتب" اور "روش و سنت" پر بھی بولا جاتا ہے۔

۳۵۔ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○

۳۶۔ اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○

ترجمہ

۳۵۔ اور اگر تم پر اُن کا اعراض (روگردانی) کرنا گراں ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین میں نقب لگا لو یا آسمان میں سیڑھی لگا لو۔ (اور زمین و آسمان کی گہرائیوں میں جستجو کرو) تاکہ کوئی آیت (یا دوسری کوئی اور نشانی) ان کے لیے لا سکو (لیکن یہ جان لو کہ یہ ہٹ دھرم پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے) لیکن اگر خدا چاہے تو انہیں (جبراً) ہدایت پر جمع کر سکتا ہے (لیکن جبری ہدایت کا کیا فائدہ ہے) پس تم ہرگز جاہلوں میں سے نہ ہونا۔

۳۶۔ صرف وہ لوگ (تیری دعوت) قبول کرتے ہیں جو سننے والے کان رکھتے ہیں۔ لیکن مُردے (اور وہ لوگ جو روحِ انسانی ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں ایمان نہیں لائیں گے اور) خدا انہیں (قیامت کے دن) مبعوث کرے

گا پھر وہ اس کی طرف پلٹ جائیں گے۔

تفسیر

زندہ نما مردے

یہ دونوں آیات اُن آیات کا بقیہ ہیں جو پیغمبر کو تسلی کے سلسلے میں گذشتہ آیات میں گزر چکی ہیں۔ چونکہ فکر و روحِ پیغمبرؐ مشرکین کی گمراہی اور ہٹ دھرمی سے زیادہ دکھی اور پریشان تھی اور آپ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو سکے انہیں مومنین کی صف میں کھینچ لائیں، خدا فرماتا ہے: اگر ان کا اعراض و روگردانی تیرے لیے زیادہ سخت اور گراں ہے تو اگر تم سے ہو سکے تو زمین کو پھاڑ ڈالو اور اس میں نقب لگالو اور جستجو کرو، یا آسمان پر کوئی سیڑھی لگالو اور اطراف آسمان کی بھی جستجو کرو اور اُن کے لیے کوئی اور آیت یا کوئی دوسری نشانی تلاش کر کے لاسکو تو لے آؤ لیکن یہ جان لو کہ وہ اس قدر ہٹ دھرم ہیں کہ پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے (وان کان کبر علیک اعراضھم فان استطعت ان تبتغی نفقًا فی الارض اوسلمًا فی السماء فتأتیھم باٰیۃ)۔[1]

"نفق" اصل میں نقب اور زمین کے نیچے کے راستوں کے معنی میں ہے اور اگر منافق کو منافق کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی مناسبت کی وجہ سے ہے کہ وہ ظاہری راہ وروش کے علاوہ اپنے لیے ایک مخفی راہ و روش بھی رکھتا ہے اور "سلم" سیڑھی کے معنی میں ہے۔

خداوند تعالیٰ اس جملے کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو یہ سمجھا رہا ہے کہ تمہاری تعلیمات، دعوت اور سعی و کوشش میں کسی قسم کا نقص نہیں ہے بلکہ نقص و عیب ان کی طرف سے ہے انہوں نے یہ پختہ ارادہ کر رکھا ہے کہ وہ حق کو قبول نہیں کریں گے۔ لہٰذا کسی قسم کی کوئی کوشش ان پر اثر نہیں کرتی تو تم پریشان نہ ہو جاؤ۔

لیکن اس بنا پر کسی کو یہ توہم نہ ہو جائے کہ خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ اُن سے اپنی بات کو تسلیم کرا سکے، بلا فاصلہ فرماتا ہے: اگر خدا چاہے تو وہ اُن سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا ہے، یعنی وہ تیری دعوت کے سامنے ان کا سرِ تسلیم خم کرا کے انہیں حق اور ایمان کا اعتراف کرنے پر آمادہ کر سکتا ہے (ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدٰی)۔

لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کا جبری ایمان بے فائدہ ہے۔ انسان کی فطرت میں حصول کمال کے لئے "اختیار اور آزادیٔ ارادہ" ہی بنیاد ہوتے ہیں۔ یہ آزادیٔ ارادہ ہی ہے کہ جس کی وجہ سے مومن کی کافر سے، نیک کی بد سے، امانت دار کی خائن سے، سچے کی جھوٹے سے قیمت پہچانی جاتی ہے، ورنہ جبری ایمان و تقویٰ سے اچھے اور بُرے کے درمیان کسی قسم کا فرق باقی نہیں رہے گا اور یہ مفاہیم جبر کی صورت میں اپنی قدر و قیمت بالکل کھو بیٹھتے ہیں۔

---

[1] حقیقت میں "ان استطعت" کا جملہ شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور اس کی تقدیر اس طرح ہے۔ ان استطعت...... فافعل ولکنھم لا یؤمنون۔

اس کے بعد کہتا ہے یہ باتیں ہم نے تجھ سے اس لیے کہی ہیں کہ کہیں تو جاہلوں میں سے نہ ہو جائے ۔ یعنی بیتاب نہ ہو، صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ دے اور ان کے کفر و شرک پر اتنا دکھی نہ ہو، اور یہ جان لو کہ راستہ تو وہی ہے کہ جس پر تم چل رہے ہو (فلا تکونن من الجاھلین)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ پیغمبر ان حقائق کو خوب اچھی طرح سے جانتے تھے لیکن خداوند تعالیٰ یاد دہانی اور تسلی کے طور پر اپنے پیغمبر کے لیے ان الفاظ کو دہرا رہا ہے ۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ ہم کسی ایسے شخص کو جس کا بیٹا مر گیا ہو یوں کہتے ہیں کہ: غم نہ کھاؤ، دنیا فنا کی جگہ ہے، سب ہی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، اس کے علاوہ تم تو ابھی جوان ہو، تمہاری اور بھی اولاد ہو جائے گی، لہٰذا زیادہ بیتاب نہ ہو۔

مسلمہ طور پر دار دنیا کا فانی ہونا یا اس کا جوان ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جو اس پر پوشیدہ ہو، یہ تمام باتیں اس سے صرف یاد دہانی کے طور پر کہی جاتی ہیں۔

باوجود اس کے کہ اُوپر والی آیت جبر کی نفی کرنے والی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے، بعض مفسرین جیسے فخرالدین رازی نے اسے مسلک جبر کی دلیلوں میں سے ایک دلیل سمجھا ہے اور وہ لفظ (ولو شاء .....) کا سہارا لیتے ہوئے کہتا ہے: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نہیں چاہتا کہ کفار ایمان لائیں۔

(حالانکہ وہ اس سے) غافل ہیں کہ مشیت و ارادہ اُوپر والی آیت میں مشیت و ارادہ اجباری ہے یعنی خدا یہ نہیں چاہتا کہ لوگ جبر سے اور زبردستی ایمان لائیں بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی رضا و رغبت اور اپنے ارادہ سے بخوشی ایمان لائیں۔ اس بنا پر یہ آیت جبریوں کے عقیدہ کی نفی پر واضح گواہ ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع کی تکمیل اور پیغمبر کی مزید دلجوئی اور تسلّی کے لیے کہتا ہے کہ جو لوگ سننے والے کان رکھتے ہیں وہ تیری دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس پر لبیک کہتے ہیں (انما یستجیب الذین یسمعون)۔

لیکن وہ لوگ جو عملاً مردوں کی صف میں شامل ہیں وہ ایمان نہیں لاتے یہاں تک کہ خدا انہیں قیامت کے دن اٹھائے اور وہ اس کی بارگاہ میں لوٹیں (و الموتیٰ یبعثھم اللہ ثم الیہ یرجعون[1])۔

وہ ایسا دن ہے کہ قیامت کے مناظر دیکھ کر وہ ایمان لے آئیں گے لیکن اُن کا اس وقت ایمان لانا انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا کیونکہ یہ عظیم منظر دیکھ کر جو لوگ ایمان لائیں گے ان کا یہ ایمان ایک قسم کا اضطراری ایمان ہو گا۔

شاید اس بات کے وضاحت کرنے کی کوئی ضرورت نہ ہو کہ "موتیٰ" (مردے) سے مراد اُوپر والی آیت میں جسمانی طور پر مردے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد باطنی و معنوی مردے ہیں کیونکہ ہم دو قسم کی موت و حیات رکھتے ہیں، ایک حیات و موت مادی ہے اور دوسری موت و حیاتِ معنوی ۔ اسی طرح شنوائی اور بینائی بھی دو قسم کی ہے ایک مادی اور دوسری

---

[1] ترکیب کی نظر سے " الموتیٰ " مبتدا ہے اور " یبعثھم اللہ " اس کی خبر ہے اور یہ جو کہتا ہے کہ وہ مردوں کو مبعوث کرے گا اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی قسم کی تبدیلی ان کے حالات میں پیدا نہیں ہو گی سوائے اس کے کہ وہ قیامت میں مبعوث ہوں گے اور حقائق کو دیکھیں گے۔

معنوی ۔ اسی دلیل سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایسے اشخاص کے بارے میں کہ جو آنکھیں بھی رکھتے ہیں کان بھی رکھتے ہیں یا زندہ و سالم تو ہیں لیکن وہ حقائق کو نہیں سمجھتے رکھتے ہیں کہ وہ اندھے بہرے ہیں یا بالکل مردہ ہیں، کیونکہ جو ردعمل ایک بینا و شنوا یا ایک زندہ انسان سے ہونا چاہیے وہ حقائق کے سامنے نہیں دکھاتے ۔ قرآن مجید میں ایسی تعبیرات کثرت سے نظر آتی ہیں اور ان میں ایک خاص کشش پائی جاتی ہے بلکہ قرآن حیات مادی اور ظاہری زندگی کو جس کی نشانی صرف کھانا، سونا اور سانس لینا ہے، کچھ اہمیت نہیں دیتا ۔ وہ ہمیشہ حیاتِ معنوی و انسانی پر جو ذمہ داری وجوابدہی اور احساس و درد اور بیداری و آگاہی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، انحصار کرتا ہے ۔

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ نابینائی و ناشنوائی اور معنوی موت خود ان کی اپنی وجہ سے ہے ، وہ خود ہی وہ لوگ ہیں کہ جو بار بار گناہ کرنے اور اس پر اصرار اور ہٹ دھرمی کرنے کے سبب سے اس مرحلہ تک پہنچ جاتے ہیں کیونکہ بالکل اسی طرح سے جیسا کہ اگر کوئی انسان ایک مدت تک اپنی آنکھ کو بند کیے رکھے تو وہ آہستہ آہستہ اپنی بینائی اور نظر کو گنوا بیٹھے گا اور شاید ایک روز بالکل اندھا ہو جائے ۔ جو اشخاص اپنے دل کی آنکھوں کو حقائق کی طرف سے بند کر لیں تو وہ تدریجاً اپنی معنوی بصارت کی قوت کو زائل کر دیں گے ۔

۳۷۔ وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قُلْ إِنَّ اللَّهَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَن يُنَزِّلَ آيَةً وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○

ترجمہ

۳۷۔ اور انہوں نے کہا کہ کوئی نشانی (اور معجزہ) اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں نازل نہیں ہوتا، تم کہہ دو کہ خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی نشانی نازل کرے لیکن اُن میں سے اکثر کو اس کا علم نہیں ہے ۔

تفسیر

اس آیت میں مشرکین کی بہانہ جوئیوں میں سے ایک بہانہ جوئی کو بیان کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ جب سردارانِ قریش میں سے کچھ قرآن کا مقابلہ کرنے سے عاجز آ گئے تو پیغمبرؐ سے کہنے لگے کہ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے اگر تم سچ کہتے ہو تو عصائے موسیٰ اور ناقہ صالح جیسے معجزات ہمارے لیے لے آؤ ۔ قرآن اس بارے میں کہتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ کوئی نشانی اور معجزہ اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر کیوں نازل نہیں ہوا (وقالوا لولا نزل علیہ آیۃ من ربہ) ۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ یہ تجویز حقیقت کی تلاش کے لیے پیش نہیں کرتے تھے کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے لیے کافی مقدار میں معجزات لاچکے تھے اور اگر قرآن کے علاوہ جو مضامین عالیہ پر مشتمل ہے۔ آپؐ کے پاس اور کوئی معجزہ نہ بھی ہوتا تو وہی قرآن جو انہیں کئی آیات میں باقاعدہ مقابلے کی دعوت دے چکا تھا اور اصطلاح کے مطابق انہیں چیلنج کرچکا تھا، وہی آپ کی نبوت کے اثبات کے لیے کافی تھا لیکن یہ ابوالہوس بہانہ جو ایک طرف سے یہ چاہتے تھے کہ قرآن کی تحقیر کریں اور دوسری طرف سے پیغمبرؐ کی دعوت قبول کرنے سے روگردانی کریں۔ لہٰذا پے در پے نئے سے نئے معجزہ کی درخواست کرتے تھے اور مسلمہ طور پر اگر پیغمبرؐ ان کی درخواست کو تسلیم بھی کرلیتے تو "ھٰذا سحر مبین" کہہ کر سب کا انکار کردیتے۔ جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: خداوند تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی ایسی نشانی اور معجزہ (کہ جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو) اپنے پیغمبر پر نازل کرے (قل ان اللہ قادر علی ان ینزل اٰیۃ) لیکن اس میں ایک ایسا اشکال ہے کہ جس سے تم بے خبر ہو اور وہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کے تقاضوں پر جو تم ہٹ دھرمی کی بنا پر کرتے ہو تمہاری بات مان لی جائے اور تم پھر بھی ایمان نہ لاؤ تو تم سب کے سب خداوند تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہو کر نابود ہوجاؤ گے۔ کیونکہ یہ پروردگار عالم کی بارگاہ اقدس میں اور اس کے بھیجے ہوئے رسول اور اس کے آیات و معجزات کی انتہائی بے حرمتی ہے لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ہیں (ولٰکن اکثرھم لا یعلمون)۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

جیسا کہ تفسیر مجمع البیان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں پہلے بعض مخالفین اسلام نے اس آیت کو دستاویز قرار دیتے ہوئے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے پاس کوئی معجزہ نہیں تھا کیونکہ جس وقت کفار اُن سے معجزہ دکھانے کا تقاضا کیا کرتے تھے تو وہ اُن سے صرف اتنا کہنے پر ہی قناعت کیا کرتے تھے کہ خدا ہی ایسی چیزوں پر قدرت رکھتا ہے لیکن تمہاری اکثریت نہیں جانتی۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ متاخرین میں سے بعض لکھنے والوں نے بھی یہی پُرانا افسانہ دہرایا ہے اور اپنی تحریروں میں اسی پُرانے اعتراض کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قبل و بعد کی آیات کا ٹھیک طور پر مطالعہ نہیں کیا ہے اور یہ غور نہیں کیا کہ یہاں پر اُن ہٹ دھرم لوگوں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جو کسی طرح بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اب اگر پیغمبرؐ نے اُن کے تقاضا کو پورا نہیں کیا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ ورنہ قرآن میں یہ کہاں ہے کہ حق کی جستجو اور حق کی طلب کرنے والے افراد نے پیغمبرؐ سے معجزہ کا تقاضا کیا ہو اور آپؐ نے ان کی خواہش کو رد کردیا ہو۔ اسی سورہ انعام کی آیہ ۱۱۱ میں اسی قسم کے "ہٹ دھرم" افراد کے سلسلہ میں ہے:

٭ ولو اننا نزلنا الیھم الملائکۃ وکلمھم الموتیٰ وحشرنا علیھم کل شیء قبلا ما کانوا لیؤمنوا[1]

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ مطالبہ سرداران قریش کی ایک جماعت کی طرف سے تھا اور انہوں نے قرآن کریم کی تحقیر اور اس سے بے پرواہی برتتے ہوئے اس قسم کا مطالبہ کیا تھا اور یہ بات مسلم ہے کہ پیغمبر ایسے تقاضوں کے سامنے جن کا سرچشمہ ایسے اسباب ہوں سر نہیں جھکا سکتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں انہوں نے گویا قرآن کریم کی باقی تمام آیات کو اپنی نگاہ سے دور کر رکھا ہے کہ کس طرح قرآن نے خود ایک جاودانہ معجزہ کے طور پر اپنا تعارف کروایا ہے اور بار ہا مخالفین کو مقابلے کی دعوت دیتا رہا ہے اور اُن کے ضعف و ناتوانی کو آشکار کر چکا ہے۔

معترضین نے سورۂ اسراء کی پہلی آیت کو بھی بھلا دیا ہے جو صراحتاً کہتی ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ایک ہی رات میں مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ تک لے گیا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ قرآن انبیاء و مرسلین کے معجزات اور خارق عادات سے پُر ہو اور پیغمبر اسلامؐ کہے کہ میں تمام انبیاء کا خاتم ہوں، سب سے افضل و برتر ہوں اور میرا دین بالاترین دین ہے لیکن حق کے متلاشیوں کے لیے کمترین معجزہ بھی اپنی طرف سے نہ دکھا سکے۔ کیا اس صورت میں غیر جانبدار حقیقت طلب افراد کے لیے اس کی دعوت میں نقطۂ ابہام پیدا نہیں ہوگا۔

اگر اُن کے پاس کوئی معجزہ نہ ہوتا تو ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ دوسرے انبیاء کے معجزات کا بالکل ہی نام تک نہ لیتے تاکہ وہ اپنے پروگرام کی توجیہ کر سکیں اور اپنے اُوپر کیے جانے والے اعتراضات کے راستوں کو بند کر دیں، اور یہ بات کہ وہ برملا طور پر کھلے دل کے ساتھ پے درپے دوسروں کے معجزات بیان کر رہے ہیں اور موسیٰؑ بن عمران، عیسیٰؑ بن مریمؑ، ابراہیمؑ، صالحؑ اور نوحؑ کے خارق عادت کام اور معجزات کو ایک ایک کر کے بیان کرتے چلے جا رہے ہیں یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ اپنے معجزات کی طرف سے کاملاً مطمئن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تواریخ اسلام، معتبر روایات اور نہج البلاغہ میں پیغمبر اکرمؐ سے مختلف قسم کے معجزات نقل ہوئے ہیں کہ جن کا مجموعہ حد تواتر کو پہنچا ہوا ہے۔

۳۸۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۳۸۔ کوئی زمین میں چلنے والا جانور اور کوئی دو پروں سے اُڑنے والا پرندہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہ تمہاری طرح کی

---

[1] ۔ آیت کا مفہوم یہ ہے: اگر ہم ان کے پاس فرشتے بھی نازل کرتے اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگتے اور تمام چیزوں کو گروہ در گروہ ان کے پاس لا کھڑا کرتے تو یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ (مترجم)

اُمت ہیں۔ ہم نے کسی چیز کو اس کتاب میں فروگذاشت نہیں کیا ہے پھر وہ سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف محشور ہوں گے۔

تفسیر

چونکہ یہ آیت وسیع مباحث اپنے پیچھے رکھتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے آیت کے الفاظ کے معانی اور پھر اس کی اجمالی تفسیر ذکر کرکے، پھر باقی مباحث کو بیان کریں۔

"دابۃ" "دبیب" کے مادہ سے آہستہ چلنے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے معنی میں ہے عام طور پر زمین پر چلنے والے سب جانداروں کو دابہ کہا جاتا ہے اگر ہم دیکھتے ہیں کہ سخن چین اور چغل خور کو "دیبوب" کہا جاتا ہے اور حدیث میں وارد ہوا ہے:

"لا یدخل الجنۃ دیبوب"

کبھی چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

یہ بھی اسی لحاظ سے ہے کہ وہ آہستہ آہستہ دو افراد کے درمیان آمد و رفت کرتا ہے تاکہ انہیں ایک دوسرے سے بدبین اور بدظن کردے۔

"طائر" ہر قسم کے پرندے کو کہا جاتا ہے۔ البتہ چونکہ بعض مواقع پر ایسے امورِ معنوی و روحانی پر بھی جو پیشرفت اور پرواز رکھتے ہیں، یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا زیرِ بحث آیت میں اس لحاظ سے کہ نگاہ صرف پرندوں پر مرکوز رہے (یطیر بجناحیہ) یعنی اپنے دو پروں کے ساتھ اڑتا ہے، کے جملہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

"امم" جمع ہے "اُمت" کی اور اُمت کا معنی ہے" وہ جماعت جو ایک قدرِ مشترک رکھتی ہو" مثلاً ان کا دین ایک ہو یا زبان ایک ہو یا صفات اور افعال ایک جیسے ہوں۔

"یحشرون" "حشر" کے مادہ سے جمع کرنے کے معنی میں ہے لیکن قرآن میں عام طور پر روزِ قیامت کے اجتماع پر یہ لفظ بولا جاتا ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ "الی ربھم" کا ضمیمہ ہو۔

گذشتہ آیات مشرکین کے بارے میں بحث کر رہی تھیں اور انہیں اس انجام کی طرف جو انہیں قیامت میں پیش آئے گا متوجہ کر رہی تھیں۔ اب یہ آیت تمام زندہ موجودات اور تمام قسم کے حیوانات کے عام حشر و نشر اور قیامت میں اٹھنے کا بیان کر رہی ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: کوئی زمین پر چلنے والا جانور نہیں اور کوئی دو پروں سے اُڑنے والا پرندہ نہیں مگر یہ کہ وہ بھی تمہاری طرح کی اُمت ہیں (وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم)

اور اس طرح سے تمام قسم کے جانور اور ہر قسم کے پرندے انسانوں کی طرح اپنے لیے ایک اُمت ہیں لیکن یہ کہ یہ ایک جیسا ہونا اور یہ شباہت کس جہت سے ہے، اس بارے میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض ان کی انسانوں سے شباہت خلقت کے تعجب خیز اسرار کی جہت سے سمجھتے ہیں کیونکہ دونوں ہی خالق و آفریدگار کی عظمت کی نشانیاں اپنے ساتھ لیے ہوئے ہیں۔

بعض سمجھتے ہیں کہ یہ شباہت زندگی کی مختلف ضروریات کی جہت سے ہے یا اُن وسائل کے لحاظ سے کہ جن کے ذریعے وہ اپنی طرح طرح کی حاجتوں کو پورا کرتے ہیں۔

جبکہ کچھ دوسرے لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی انسان کے ساتھ شباہت سے مراد ادراک اور فہم و شعور میں شباہت ہے۔ یعنی وہ بھی اپنے عالم میں علم، شعور اور ادراک رکھتے ہیں، وہ خدا کی معرفت رکھتے ہیں اور اپنی توانائی کے مطابق اس کی تسبیح و تقدیس کرتے ہیں اگرچہ ان کی فکر، انسانی فکر و فہم سے بہت نچلی سطح پر ہے اور جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا، آیت کا ذیل آخری نظریے کو تقویت دیتا ہے۔

پھر بعد کے جملے میں ہے: ہم نے کتاب میں کسی چیز کو فروگذاشت نہیں کیا ہے (ما فرطنا فی الکتاب من شیءٍ)۔

ممکن ہے کہ "کتاب" سے مراد قرآن مجید ہو کہ تمام چیزیں (یعنی وہ تمام امور جو انسان کی تربیت و ہدایت اور تکامل و ارتقا سے مربوط ہیں) اس میں موجود ہیں۔ البتہ بعض اوقات کلی صورت میں بیان ہوئے ہیں جیسے ہر قسم کے علم و دانش کی طرف دعوت اور بعض اوقات جزئیات کو بھی بیان کیا گیا ہے جیسے بہت سے احکام اسلامی اور مسائل اخلاقی۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ "کتاب" سے مراد "عالم ہستی" ہو کیونکہ عالم آفرینش ایک عظیم کتاب کی مانند ہے کہ جس میں تمام چیزیں آگئی ہیں اور کوئی چیز اس میں فروگذار نہیں ہوئی۔

اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ آیت میں دونوں تفاسیر ہی مراد ہوں کیونکہ نہ تو قرآن میں مسائل تربیتی فروگذار ہوئے ہیں اور نہ ہی عالم آفرینش و خلقت میں کوئی نقص، کمی اور کسر رہ گئی ہے۔

اور آیت کے آخر میں ہے: وہ تمام خدا کی طرف قیامت میں جمع ہوں گے (ثم الی ربھم یحشرون)۔

ظاہر یہ ہے کہ "ھم" کی ضمیر اس جملے میں تمام چلنے والے جانوروں اور پرندوں کی تمام اصناف اور انواع و اقسام کی طرف لوٹتی ہے اور اس طرح سے قرآن اُن کے لیے بھی قیامت میں محشور ہونے کا قائل ہوا ہے اور زیادہ تر مفسرین نے اسی مطلب کو قبول کیا ہے کہ تمام قسم کے جاندار حشر و نشر اور جزا و سزا رکھتے ہیں۔ صرف بعض اس کے منکر ہوئے ہیں اور انہوں نے اس آیت کی اور دوسری آیات کی ایک اور طرح توجیہ کی ہے۔ مثلاً انہوں نے کہا ہے کہ "حشر الی اللہ" سے مراد زندگی کا ختم ہونا اور موت ہے[1]

لیکن جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں قرآن مجید میں اس تعبیر کا ظاہر وہی قیامت میں حشر و نشر کا ہونا اور دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جانا ہے۔ اس بنا پر آیت مشرکین کو آگاہ کر رہی ہے کہ وہ خدا جس نے تمام قسم کے جانوروں کو پیدا کیا، اُن کی ضروریات کو مہیا کیا اور ان کے تمام افعال کا نگران ہے اور اُن سب کے لیے اُس نے حشر و نشر قرار دیا ہے

---

[1] یہ احتمال المنار کے مؤلف نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ وہ تمہارے لیے حشر و نشر قرار نہ دے اور بعض مشرکین کے قول کے مطابق دنیاوی زندگی اور اس کی حیات و موت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہو۔

چند قابلِ غور باتیں

۱۔ کیا جانوروں کے لیے بھی حشر و نشر ہے؟ اس میں شک نہیں کہ حساب و کتاب اور جزا و سزا کی پہلی شرط مسئلہ عقل و شعور ہے اور اس کے بعد فرائض کا وجوب اور جوابدہی کی ذمہ داری ہے۔ اس عقیدے کے طرفدار کہتے ہیں کہ ایسے ثبوت موجود ہیں کہ جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جانور بھی اپنی مقدار و اندازہ کے مطابق فہم و ادراک رکھتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ ہے کہ بہت سے جانوروں کی زندگی ایسے تعجب انگیز اور پرکشش نظام کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو اُن کے فہم و شعور کی سطح عالی کو واضح کرتی ہے۔ کون ایسا شخص ہے کہ جس نے چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں اور ان کے عجیب و غریب تمدن اور ان کے چھتے اور بلوں کے تعجب انگیز نظام کی باتیں نہ سنی ہوں اور اُن کے تحسین آمیز ادراک و شعور پر آفرین نہ کہی ہو۔ اگرچہ بعض حضرات اس بات کی طرف مائل ہیں کہ ان تمام باتوں کو ایک فطری اور طبعی الہام جانیں۔ حالانکہ اس پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے کہ ان کے اعمال لاعلمی کی صورت میں (فطری طور پر بغیر عقل کے) انجام پاجاتے ہیں۔

اس بات میں کونسا امر مانع ہے کہ ان کے یہ تمام اعمال جیسا کہ ان کا ظاہر نشاندہی کرتا ہے، عقل و ادراک کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جانور بغیر گذشتہ تجربہ کے اور پیش بینی نہ ہونے کے حوادثات کے مقابلے میں نئی راہ تلاش کر لیتے ہیں۔ مثلاً وہ بھیڑ جس نے عمر میں کبھی بھیڑیے کو نہیں دیکھا جب پہلی بار اس کو دیکھتی ہے تو اچھی طرح اُس دشمن کے خطرناک ہونے کی تشخیص کر لیتی ہے اور جس ذریعہ سے ہو سکے اپنے دفاع اور خطرے سے نجات کے لیے کوشش کرتی ہے۔

بہت سے جانور جو اپنے مالکوں کے ساتھ تدریجی طور پر لگاؤ اور محبت پیدا کر لیتے ہیں اس موضوع کا دوسرا گواہ ہیں۔ بہت سے درندے اور خطرناک کتے اپنے مالکوں کے ساتھ حتیٰ کہ اُن کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ بھی ایک مہربان خدمت گار کی طرح برتاؤ کرتے ہیں۔

جانوروں کی وفاداری کے بہت سے واقعات اور یہ کہ وہ کس طرح سے انسانی خدمات کا بدلہ اتارتے ہیں کتابوں میں اور لوگوں کے درمیان مشہور ہیں کہ اُن تمام کو محض افسانہ نہیں کہا جاسکتا۔

مسلّم ہے کہ ان تمام باتوں کو آسانی کے ساتھ فطرت کی پیداوار نہیں کہا جاسکتا کیونکہ فطرت عام طور پر ایک ہی قسم کے دائمی کاموں کا سرچشمہ ہوتی ہے لیکن وہ اعمال جو ایسی خاص شرائط میں پیش بینی کے قابل نہ تھے عکس العمل کے عنوان سے انجام پاتے ہیں فطرت کی نسبت فہم و شعور سے زیادہ شباہت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں بہت سے جانوروں کو اہم مقاصد کے لیے تربیت دی جاتی ہے، مجرموں کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس کے کتے، خطوں کو پہنچانے کے لیے کبوتر، دکانوں سے سودا سلف خریدنے کے لیے بعض جانور، شکار کرنے کے

یہ شکاری جانور سدھائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اہم اور مشکل فرائض عجیب و غریب عمدگی سے انجام دیتے ہیں (آجکل تو بعض جانوروں کے لیے باقاعدہ تربیتی ادارے معرضِ وجود میں آچکے ہیں)۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر، قرآن کی متعدد آیات میں ایسے مطالب دکھائی دیتے ہیں جو بعض جانوروں کے فہم و شعور کے بارے میں قابلِ ملاحظہ دلیل شمار ہوتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے لشکر کو دیکھ کر چیونٹیوں کے فرار کرنے کا واقعہ اور ہدہد کا سبا اور یمن کے علاقے میں آنا اور وہاں سے ہیجان انگیز خبروں کو سلیمان کے پاس لانا، اس مدعا پر شاہد ہیں۔

روایات اسلامی میں بھی متعدد احادیث جانوروں کے قیامت میں اُٹھنے کے سلسلے میں نظر آتی ہیں منجملہ اُن کے حضرت ابوذر سے نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے دو بکریوں نے ایک دوسرے کو سینگ مارے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جانتے ہو کہ انہوں نے ایک دوسرے کو سینگ کیوں مارے ہیں، حاضرین نے عرض کیا کہ نہیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا لیکن خدا جانتا ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا اور عنقریب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا۔[1]

اور ایک روایت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطریق اہلِ سنت نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

"ان اللّٰہ یحشر ھذہ الامم یوم القیامۃ و یقتص من بعضھا لبعض حتی یقتص للجماء من القرناء"۔

خداوند تعالیٰ ان تمام جانوروں کو قیامت کے دن محشور کرے گا اور بعض کا بعض سے قصاص لے گا۔ یہاں تک کہ اُس جانور کا قصاص کہ جس کے سینگ نہیں ہیں اور کسی دوسرے نے بلا وجہ اُسے سینگ مارا ہے اُس سے لے گا۔[2]

سورۂ تکویر کی آیہ پانچ میں ہے:

"وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ"

اور اس وقت جب کہ جانور محشور کیے جائیں گے۔

اگر اس آیت کا معنی قیامت کے دن کا حشر لیں (نہ کہ دنیا کے ختم ہونے کے وقت محشور و جمع ہونا) تو اوپر والی بحث کی منقول دلیلوں میں سے یہ ایک اور دلیل ہو گی۔

۲۔ حشر و نشر ہے تو پھر فرائض بھی ہیں، ایک اہم سوال جو یہاں پیش آتا ہے، اور جب تک وہ حل نہ ہو اوپر والی

---

[1] تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین محل بحث آیہ کے ذیل میں۔

[2] تفسیر المنار، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

آیت کی تفسیر واضح نہیں ہوتی اور دوسوال یہ ہے کہ کیا ہم یہ قبول کر سکتے ہیں کہ حیوانات بھی فرائض و واجبات رکھتے ہیں جبکہ شرعی تکلیف کی مسلم شرائط میں سے ایک عقل ہے اور اسی بنا پر بچہ اور دیوانہ شخص شرعی تکلیف کے دائرے سے خارج ہیں تو کیا جانور ایسی عقل رکھتے ہیں کہ ان پر تکلیف عائد ہو۔ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ ایک جانور ایک نابالغ بچے اور حتیٰ کہ دیوانوں سے زیادہ سمجھ رکھتا ہو؟ اور اگر ہم یہ قبول کرلیں کہ وہ اس قسم کی عقل وادراک نہیں رکھتے تو پھر یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ فرائض و واجبات اُن پر لاگو ہوں۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ تکلیف یعنی فرائض و واجبات کے کئی مراحل ہوتے ہیں اور ہر مرحلے کے لیے اپنی مناسبت سے ادراک و عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بہت سی تکالیف اور واجبات و فرائض جو قوانین اسلامی میں ایک انسان کے لیے بنائے گئے ہیں ایسے ہیں کہ جو عقل وادراک کی ایک سطح عالی کے بغیر انجام دیئے ہی نہیں جاسکتے اور ہم ہرگز ایسی تکالیف جانوروں کے لیے قبول نہیں کرسکتے کیونکہ اُن کو بجالانے کی شرط اُن جانوروں کو حاصل ہی نہیں ہے۔

لیکن تکلیف کا ایک آسان اور نچلی سطح کا مرحلہ بھی متصور ہوتا ہے کہ جس کے لیے مختصر فہم و شعور بھی کافی ہے۔ ہم اس قسم کے فہم و شعور اور اس قسم کی تکالیف کا جانوروں سے قطعی انکار نہیں کرسکتے۔

یہاں تک کہ ان بچوں اور دیوانوں کے بارے میں بھی جو کچھ مسائل کو سمجھتے ہیں تمام تکالیف کا انکار کرنا مشکل ہے۔ مثلاً اگر ہم چودہ سالہ نوخیز بچوں کو جو حد بلوغ کو تو نہیں پہنچے لیکن مکمل طور سے تمام مطالب انہوں نے پڑھے اور سمجھے ہیں، نظر میں رکھیں اب اگر وہ عمداً قتل نفس کے مرتکب ہوں جب کہ وہ اس عمل کے تمام نقصانات و مضرات کو جانتے ہیں تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُن سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا دنیاوی تعزیراتی قوانین بھی غیر بالغ افراد کو بعض گناہوں میں سزا دیتے ہیں۔ اگرچہ ان کی سزائیں مسلمہ طور پر بہت خفیف ہوتی ہیں۔

اس بنا پر بلوغ و عقل کامل مرحلہ عالی و کامل میں شرط تکلیف ہے، لیکن نچلے مراحل میں یعنی چند ایسے گناہوں کے بارہ میں کہ جن کی قباحت اور برائی نچلی سطح کے انسانوں کے لیے بھی مکمل طور سے قابلِ فہم ہے ان کے لیے بلوغ اور عقل کامل کو شرط نہیں جانا جاسکتا۔

مراتبِ تکلیف کے فرق اور مراتب عقل کے فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ اعتراض جانوروں کے بارے میں بھی حل ہو جائے گا۔

۳۔ کیا یہ آیت تناسخ کی دلیل ہے: تعجب کی بات یہ ہے کہ تناسخ کے بیہودہ عقیدہ کے بعض طرفداروں نے اس آیت سے اپنے مسلک کے لیے استدلال کیا ہے اور انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت یہ کہتی ہے کہ جانور بھی تمہاری طرح اُمتیں ہیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ذاتی طور پر ہماری طرح نہیں ہیں تو اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسانوں کی روح بدن سے جدا ہونے کے بعد جانوروں کے بدن میں چلی جاتی ہے اور اس ذریعے سے وہ اپنے بعض بُرے اعمال کی سزا پائے۔

لیکن اس بات کے علاوہ کہ عقیدہ تناسخ قانون ارتقا اور عقل و منطق کے خلاف ہے اور اس سے قیامت و معاد کا انکار لازم آتا ہے (جیسا کہ اپنے مقام پر ہم نے اسے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے) اُوپر والی آیت کسی طرح بھی اس مسلک پر دلالت نہیں کرتی کیونکہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مجتمعات حیوانی کئی جہات سے انسانی مجتمعات کی طرح ہیں اور شباہت صرف بالقوۃ نہیں بلکہ بالفعل ہے (یعنی عملی طور پر ایسا ہے) کیونکہ وہ بھی ادراک و شعور کا کچھ حصّہ اور مسؤلیت کا کچھ حصّہ اور حشر و نشر اور قیامت میں اٹھائے جانے کا کچھ حصّہ رکھتے ہیں لہٰذا ان جہات سے انسان کے ساتھ شباہت رکھتے ہیں۔

لیکن اس بات سے کوئی اشتباہ اور غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے مختلف جانوروں کے لیے ایک خاص مرحلہ میں مسؤلیت و تکلیف رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُن کے لیے بھی کوئی رہبر و پیشوا (نبی و امام) ہوتا ہے اور وہ بھی کوئی نہ کوئی مذہب اور شریعت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ بعض صوفیوں سے نقل ہوا ہے بلکہ اس قسم کے مواقع پر ان کا رہبر و رہنما صرف ان کا ادراک و شعورِ باطنی ہی ہوتا ہے یعنی وہ معین مسائل کا فہم رکھتے ہیں اور اپنے شعور کی مقدار اور اندازے کے مطابق اس کے مقابلہ میں مسئول و جوابدہ ہیں۔

۳۹۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

ترجمہ

۳۹۔ اور وہ لوگ جو ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں تاریکیوں میں بہرے اور گونگے قرار پاتے ہیں۔ جسے خدا چاہتا ہے (اور وہ اسی کا مستحق ہوتا ہے) اُسے وہ گمراہ کرتا ہے اور جسے وہ چاہتا ہے (اور اس کو اس بات کے لائق پاتا ہے) اسے سیدھے راستے پر قرار دیتا ہے۔

تفسیر

بہرے اور گونگے

قرآن ہٹ دھرم منکرین کی بحث کو دوبارہ شروع کر رہا ہے اور کہتا ہے: وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا بہرے اور گونگے ہیں اور ظلمت و تاریکی میں قرار پائے ہیں (و الذین کذبوا بایاتنا صم و بکم فی الظلمٰت) نہ تو وہ ایسے سننے والے کان رکھتے ہیں کہ جو حقائق کو سنیں اور نہ ہی ایسی حق گو زبان رکھتے ہیں کہ اگر انہوں نے کسی حقیقت کو سمجھ لیا ہو تو دوسروں سے بیان کر دیں اور چونکہ خود خواہی، خود پرستی، ہٹ دھرمی اور

جہالت کی تاریکی نے انہیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے لہٰذا وہ حقائق کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تو اس طرح سے وہ ان تین عظیم نعمتوں (یعنی سننا، دیکھنا اور بولنا) سے جو انہیں خارجی دنیا سے مربوط کرتی ہیں محروم ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ بہروں سے مراد وہ مقلد ہیں جو بغیر چون وچرا کے اپنے گمراہ رہبروں کی پیروی کرتے ہیں اور انہوں نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں اور خدائی رہبروں کی بات نہیں سنتے اور گونگے افراد سے مراد وہی گمراہ رہبر ہیں جو حقائق کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں لیکن اپنی حیثیت اور اپنے مادی منافع کی حفاظت کے لیے انہوں نے اپنے لبوں پر مہر سکوت لگائی ہوئی ہے اور دونوں گروہ جہالت اور خود پرستی کی تاریکی میں گرفتار ہیں[1]

اور اس کے بعد فرماتا ہے کہ "خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے جادۂ مستقیم پر برقرار رکھتا ہے من یشا اللہ یضللہ و من یشأ یجعلہ علی صراط مستقیم)

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مشیت وارادۂ خدا کی طرف ہدایت وضلالت کی نسبت دینا ایک ایسی بات ہے کہ جس کی قرآن کی دوسری آیات سے اچھی طرح تفسیر ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ ہم پڑھتے ہیں؛

"یضل اللہ الظالمین"

خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

"وما یضل بہ الا الفاسقین"

صرف فاسقین کو گمراہ کرتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے:

"والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم انہیں سیدھی راہوں کی ہدایت کریں گے۔

ان آیات اور قرآن کریم کی دوسری آیات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ہدایتیں اور وہ ضلالتیں کہ جن کی ان مواقع پر خدا کے ارادہ کی طرف نسبت دی گئی ہے حقیقت میں وہ جزائیں اور وہ سزائیں ہیں جو وہ اپنے بندوں کو اچھے یا برُے اعمال کے بدلے دیتا ہے اور زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات انسان سے ایسے برُے اعمال سرزد ہو جاتے ہیں کہ جن کے زیر اثر ایک ایسی وحشتناک تاریکی اس کی روح کو گھیر لیتی ہے کہ جس سے حقیقت بین آنکھیں چھین لی جاتی ہیں اور اس کے کان حق کی آواز کو نہیں سنتے، اور اس کی زبان حق بات کہنے سے رک جاتی ہے۔

اس کے برعکس کبھی انسان سے ایسے بہت سے نیک کام صادر ہوتے ہیں کہ ایک عالم نور وروشنی اس

---

[1] المیزان جلد ہفتم صفحہ ۸۴۔

کی روح پر چھا در ہوتا ہے، اس کی نظر و ادراک زیادہ وسیع اور اس کی فکر فزوں تر اور اس کی زبان حق بات کہنے میں گویا تر ہو جاتی ہے۔ یہ ہے معنی ہدایت و ضلالت کا جس کی خدا کے ارادے کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔

۴۰۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

۴۱۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ○

ترجمہ

۴۰۔ کہہ دو کیا تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ اگر خدا کا عذاب تم پر نازل ہو جائے یا قیامت آ جائے تو کیا تم (اپنی مشکلات کے حل کے لیے) خدا کے سوا کسی اور کو بلاؤ گے اگر تم سچے ہو۔

۴۱۔ نہیں بلکہ تم صرف اسی کو بلاؤ گے اور اگر وہ چاہے گا تو اُس مشکل کو جس کے لیے تم نے اُسے بلایا ہے برطرف کر دے گا اور جسے (آج) تم (خدا کا) شریک قرار دیتے ہو (اسے اس دن) بھول جاؤ گے۔

تفسیر

فطری توحید

دوبارہ روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے ایک دوسرے طریقے سے توحید و یگانہ پرستی کے لیے اُن کے سامنے استدلال کرتا ہے۔ وہ اس طریقہ سے کہ انہیں اُن کی زندگی کے بہت ہی سخت اور دردناک لمحات یاد دلاتا ہے اور ان کے وجدان سے مدد چاہتا ہے کہ اس قسم کے لمحات میں جب کہ ہر چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس وقت خدا کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ انہیں اپنے لیے سجھا دیتا ہے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر خدا کا دردناک عذاب تمہارے پیچھے آ پہنچے یا قیامت اپنی اس ہولناکی، ہیجان اور وحشتناک حادثات کے ساتھ برپا ہو جائے، تو سچ بتاؤ کہ کیا تم خدا کے سوا کسی اور کو اپنے شدائد کو برطرف کرنے کے لیے پکارو گے قل ارء یتکم ان اتٰکم عذاب اللہ او اتتکم الساعۃ اغیر اللہ تدعون ان کنتم صٰدقین[1]

---

[1] جیسا کہ عربی ادب کے علماء نے تصریح کی ہے کہ "ک" "ارء یتک" میں اور "کم" "ارء یتکم" میں نہ اسم ہے نہ ضمیر بلکہ صرف خطاب ہے،

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

یہ آیت نہ صرف مشرکین کے لیے ہے بلکہ معنی کے اعتبار سے باطنی طور پر تمام افراد کے لیے شدائد اور سخت حوادث کے ظہور کے وقت قابلِ فہم ہے۔ ممکن ہے کہ عام حالات میں اور چھوٹے چھوٹے حادثات میں انسان غیر خدا کے ساتھ متوسل ہو جائے لیکن جب حادثہ بہت زیادہ سخت ہو تو انسان تمام چیزوں کو بھول جاتا ہے۔ البتہ یہی حالت ہوتی ہے وہ جبکہ وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں نجات کے لیے ایک قسم کی اُمید محسوس کرتا ہے کہ جو ایک پوشیدہ اور نامعلوم قدرت سے سرچشمہ حاصل کرتی ہے۔ یہی وہ توجہ ہوتی ہے جو خدا کی طرف ہوتی ہے اور یہی حقیقت توحید ہے۔

یہاں تک کہ مشرکین اور بت پرست بھی اس قسم کے لمحات میں، بتوں کی بات کو درمیان میں نہیں لاتے اور وہ سب کو بھلا دیتے ہیں۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: بلکہ تم صرف اسی کو پکارتے ہو اگر وہ چاہے تو تمہاری مشکل کو حل کردے اور وہ شریک جو تم نے خدا کے لیے تیار کر رکھے تھے ان سب کو بھلا دیتے ہو (بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ ان شاء و تنسون ما تشرکون)۔

چند اہم نکات

۱۔ جو استدلال اُوپر کی دو آیات میں نظر آتا ہے وہی توحید فطری والا استدلال ہے کہ جس سے دو مباحث میں استفادہ کیا جاسکتا ہے ایک خدا کے اصل وجود کے اثبات میں اور دوسرا اس کی یگانگت اور توحید ثابت کرنے میں۔ اسی لیے اسلامی روایات میں اور اسی طرح علماء کے کلام میں منکرین خدا کے مقابلے میں بھی اور مشرکین کے مقابلے میں بھی استدلال کیا گیا ہے۔

۲۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اُوپر والے استدلال میں قیامت کے بپا ہونے کی بات درمیان میں آئی ہے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ وہ تو اس قسم کے دن کو بالکل قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ اس بنا پر کس طرح ممکن ہے کہ ان کے سامنے اس قسم کا استدلال پیش کیا جائے۔

لیکن اس حقیقت پر توجہ کرنا چاہیے کہ پہلے تو وہ سب قیامت کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن میں سے ایک گروہ ایک طرح سے قیامت کا اعتقاد رکھتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ممکن ہے کہ "ساعت" سے مراد وہی موت کی

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: جو حقیقت میں تاکید کے لیے آتا ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر فعل مفرد کی شکل میں آتا ہے اور اس کا مفرد، تثنیہ اور جمع ہونا اسی حرف خطاب کے تغیرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے "ارأیتکم" میں باوجودیکہ مخاطب جمع ہے فعل "رأیت" مفرد لایا گیا اور اس کا جمع ہونا "کم" سے جو کہ حرف خطاب ہے سمجھا گیا ہے۔ ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ لفظ معنی کے لحاظ سے مساوی ہے "اخبرنی" "یا اخبرونی" کے لیکن حق یہ ہے کہ یہ لفظ اپنے استفہامی معنی کی مکمل حفاظت کرتا ہے اور "اخبرونی" اس کے معنی کا لازمہ ہے نہ کہ خود اس کا معنی ہے (غور کیجیے گا)۔

گھڑی یا وحشتناک حوادث کی گھڑی ہو جو انسان کو موت کی چوکھٹ تک لے جاتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر ہولناک حوادث کی طرف اشارہ ہو کیونکہ قرآنی آیات بار بار کہتی ہیں کہ قیامت کی ابتدا بہت ہی ہولناک حوادث کے سلسلے کے ساتھ شروع ہوگی اور زلزلے، طوفان، بجلیاں اور ایسی ہی دوسری ناگہانی آفتیں اس وقت وقوع پذیر ہونگی۔

۳۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ قیامت کا دن اور اس سے قبل کے حوادث حتمی اور یقینی مسائل میں سے ہیں اور کسی طرح بھی قابلِ تغیر نہیں ہیں تو پھر اُوپر والی آیت میں یہ کیوں کہا گیا ہے: اگر خدا چاہے تو اُسے برطرف کردے گا۔ کیا اس سے صرف پروردگار عالم کی قدرت کا بیان کرنا مقصود ہے یا کوئی اور معنی مراد ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ خدا ان کی دعا سے اصل قیام ساعت اور روز قیامت کو ہی ختم کردے گا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین بلکہ غیر مشرکین بھی جب قیامت کے روبرو ہوں گے تو اس کے حوادث مشکلات اور اس کے سخت ترین عذاب سے جو انہیں در پیش ہوگا، وحشت اور پریشانی میں ہوں گے اور خدا سے درخواست کریں گے کہ وہ اس کیفیت اور حالت کو ان کے لیے آسان کردے اور انہیں خطرات سے رہائی بخشے۔ تو حقیقت میں یہ دعا دردناک حوادث سے اپنے آپ کی نجات کے لیے ہے نہ کہ قیامت کے ختم ہو جانے کی دعا۔

۴۲۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ○

۴۳۔ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۴۴۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ○

۴۵۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

ترجمہ

۴۲۔ ہم نے اُن اُمتوں پر جو تم سے پہلے تھیں (پیغمبر بھیجے اور جب وہ ان کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے

ہوئے) تو ہم نے انہیں شدت و تکلیف اور رنج و بے آرامی میں مبتلا کر دیا کہ شاید (وہ بیدار ہو جائیں اور حق کے سامنے) سر تسلیم خم کر دیں۔

۴۳۔ جب ہمارا عذاب ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے (خضوع کیوں نہیں کیا؟) اور سر تسلیم کیوں خم نہ کیا؛ لیکن اُن کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ہر اُس کام کو جو وہ کرتے تھے اُن کی نظروں میں پسندیدہ کر کے دکھایا۔

۴۴۔ جب (نصیحتوں نے کوئی فائدہ نہ دیا اور) جو کچھ انہیں یاد دہانی کرائی گئی تھی وہ اُسے بھول گئے تو ہم نے (نعمتوں میں سے) تمام چیزوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دیئے یہاں تک کہ وہ (مکمل طور پر) خوشحال ہو گئے (اور انہوں نے ان کے ساتھ دل لگا لیا) تو ہم نے یکایک انہیں دھر پکڑا (اور سخت سزا دی) تو اُس وقت وہ سب کے سب مایوس ہو گئے (اور امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو گئے)۔

۴۵۔ اور (اس طرح سے) جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا (اور ان کی نسل منقطع ہو گئی) اور حمد مخصوص ہے اس خدا کے لیے کہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

تفسیر

نصیحت قبول نہ کرنے والوں کا انجام

ان آیات میں بھی گمراہوں اور مشرکین کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور قرآن ایک دوسرے راستے سے ان کو بیدار کرنے کے لیے اس موضوع کا پیچھا کرتا ہے۔ یعنی ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گذشتہ زمانوں اور صدیوں کی طرف لے جاتا ہے اور گمراہ، ستمگر اور مشرک امتوں کی کیفیت ان سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح سے تربیت و بیداری کے عوامل ان کے لیے بروئے کار لائے گئے لیکن ان میں سے ایک گروہ نے پھر بھی کسی کی طرف توجہ نہ کی اور آخر کار ایسی بدبختی ان کو دامنگیر ہوئی کہ وہ آنے والوں کے لیے عبرت بن گئے۔

پہلے کہتا ہے کہ ہم نے گذشتہ امتوں کی طرف پیغمبر بھیجے اور چونکہ انہوں نے کوئی پرواہ نہیں کی لہٰذا ہم نے انہیں بیداری اور تربیت کی خاطر مشکلات اور سخت حوادث مثلاً فقر و فاقہ، خشک سالی و بیماری، درد و رنج اور "بأساء" و "ضراء"[1]

---

[1] "بأساء" اصل میں شدت و رنج کے معنی میں ہے اور جنگ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اسی طرح قحط و خشک سالی اور فقر و غیرہ کے لیے

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

سے دوچار کر دیا، کہ شاید وہ متوجہ ہو جائیں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں (ولقد ارسلنا الی امم من قبلک فاخذنٰھم بالبأساء والضراء لعلھم یتضرعون)۔

بعد والی آیت میں کہتا ہے کہ انہوں نے ان دردناک اور بیدار کرنے والے عوامل سے نصیحت کیوں نہ لی اور بیدار کیوں نہ ہوئے اور خدا کی طرف کیوں نہ لوٹے (فلولا اذ جاءھم بأسنا تضرعوا)۔

اصل میں ان کے بیدار نہ ہونے کی دو وجوہات تھیں۔ اُن میں سے پہلی وجہ تو یہ تھی کہ گناہ کی زیادتی اور شرک میں ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے دل تاریک اور سخت ہو گئے اور ان کی روح کوئی اثر قبول نہیں کرتی تھی (ولکن قست قلوبھم)۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ شیطان نے (ان کی نفس پرستی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) ان کے اعمال کو ان کی نگاہ میں زینت دے رکھا تھا اور جس برے عمل کو وہ انجام دیتے تھے اسے خوبصورت و زیبا اور ہر غلط کام کو درست و صحیح خیال کرتے تھے (وزین لھم الشیطان ما کانوا یعملون)۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے کہ جب سخت گیریاں اور گوشمالیاں اُن کے لیے مؤثر ثابت نہ ہوئیں تو ہم نے ان کے ساتھ محبت اور مہربانی کا راستہ اختیار کیا اور جب اُنہوں نے پہلے سبق کو بھلا دیا تو ہم نے اُن کے لیے دوسرا سبق شروع کر دیا اور طرح طرح کی نعمتوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دیئے کہ شاید وہ بیدار ہو جائیں اور اپنے پیدا کرنے والے اور ان نعمتوں کو بخشنے والے کی طرف توجہ کرلیں اور راہِ راست کو پالیں (فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء)۔

لیکن یہ سب نعمتیں دوہری خصوصیت رکھتی تھیں، یہ ان کی بیداری کے لیے اظہارِ محبت بھی تھیں اور اگر بیدار نہ ہوں تو دردناک عذاب کا مقدمہ بھی تھیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب انسان ناز و نعمت میں ڈوبا ہوا ہو اور اچانک وہ سب نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کے لیے انتہائی دردناک ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر اس سے تدریجاً واپس لی جائیں تو اس صورت میں اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔

اسی لیے کہتا ہے کہ ہم نے انہیں اس قدر نعمتیں دیں کہ جس سے وہ مکمل طور پر خوش حال ہو گئے، لیکن وہ بیدار نہ ہوئے، لہٰذا ہم نے اُن سے وہ اچانک چھین لیں اور ہم نے انہیں عذاب دیا اور اُمید کے سب دروازے ان پر بند ہو گئے (حتّٰی اذا فرحوا بما اوتوا اخذنٰھم بغتۃ فاذا ھم مبلسون[1])۔

تفسیر نمونہ سابقہ۔ بھی لیکن "ضراء" روحانی تکالیف مثلاً غم و اندوہ، جہالت و نادانی یا وہ پریشانیاں جو بیماری یا مقام و منصب اور مال و ثروت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پیدا ہوتی ہیں کے معنی میں ہے۔ شاید ان دونوں میں فرق اس سبب سے ہے کہ "بأساء" عام طور سے خارجی پہلو رکھتا ہے اور "ضراء" روحانی اور معنوی پہلو رکھتا ہے۔ یعنی روحانی تکالیف کو "ضراء" کہتے ہیں۔ تو اس بنا پر "بأساء"، "ضراء" کے عوامل کی ایجاد میں سے ایک عامل ہے (غور کیجیے گا)۔

[1] "مبلسون" اصل میں مادۂ ابلاس سے اُس غم و اندوہ کے معنی میں ہے جو انسان کو ناگوار حوادث کی شدت سے عارض ہو اور ابلیس کا نام بھی یہیں سے لیا گیا ہے اور اُوپر والی تعبیر شدتِ غم و اندوہ کی نشاندہی کرتی ہے جو گنہگاروں کو گھیر لیتی ہے۔

اور اس طرح ستمگروں کی نسل منقطع ہوگئی اور ان کی دوسری نسل آگے نہ چل سکی (فقطع دابر القوم الذین ظلموا)۔

"دابر" اصل میں کسی چیز کے پچھلے اور آخری حصہ کو کہتے ہیں اور چونکہ خداوند تعالیٰ نے ان کی تربیت کے لیے تمام ذرائع کو بروئے کار لانے میں کسی قسم کی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لہٰذا آیت کے آخر میں کہتا ہے: حمد مخصوص اس خدا کے لیے ہے کہ جو تمام عالمین کا پروردگار ہے (والحمد للہ رب العالمین)۔

چند اہم نکات

۱۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان آیات اور گذشتہ آیات کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ گذشتہ آیات میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کی گئی تھی کہ مشرکین ہجوم مشکلات کے وقت خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور خدا کے سوا ہر کسی کو بھلا دیتے ہیں لیکن ان آیات میں ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت بھی وہ بیدار نہیں ہوتے۔

ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے یہ ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ شدائد کے ظہور کے وقت جلدی گزر جانے والی اور وقتی بیداریاں بیداری شمار نہیں ہوسکیں کیونکہ وہ جلد ہی اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ جاتے ہیں گذشتہ آیات میں چونکہ توحید فطری کا بیان کرنا مقصود تھا، اس کے ثبوت کے لیے وہی بیداریاں اور وقتی توجہات اور غیر خدا کو فراموش کرنا ہی کافی تھا خواہ ایسا حادثہ کے موقع پر ہی ہوا ہو لیکن ان آیات میں موضوعِ سخن ہدایت یابی اور بے راہ روی سے راہ راست کی طرف پلٹنے سے متعلق ہے اور مسلمہ طور پر جلد گزر جانے والی اور وقتی بیداری اس میں کوئی اثر نہیں کرتی۔

بعض اوقات خیال ہوتا ہے کہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ گذشتہ آیات پیغمبرؐ کے ہمعصر مشرکین کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن زیر بحث آیات گذشتہ اقوام سے متعلق ہیں لہٰذا ان دونوں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے[1]

لیکن یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ پیغمبرؐ کے ہمعصر ہٹ دھرم مشرک گذشتہ زمانہ کے گمراہوں سے بہتر ہوں۔ اس بنا پر صحیح حل وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکا۔

۲۔ زیر نظر آیات میں ہے کہ جب شدائد کے ظہور سے تربیتی اثر نہ ہو تو خداوند عالم ایسے گنہگاروں پر نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے، تو کیا یہ کام تنبیہ کے بعد تشویق کے لیے ہے یا عذاب کے دردناک ہونے کا ایک مقدمہ ہے؛ یعنی اصطلاح کے مطابق اس قسم کی نعمتیں نعمت استدراجی ہیں۔ جو سرکش بندوں کو بتدریج آہستہ آہستہ ناز و نعمت، خوشحالی و سرور اور ایک قسم کی غفلت میں ڈبو دیتی ہیں اور پھر ایک دم ان سے تمام نعمتوں کو چھین لیا جاتا ہے۔ آیت میں کچھ ایسے قرائن موجود ہیں جن سے دوسرے احتمال کی تقویت ملتی ہے لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ دونوں ہی احتمال مراد ہوں۔ یعنی پہلے بیداری کے لیے تشویق ہو اور اگر وہ موثر نہ ہو تو وہ نعمت

---

[1] فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے (جلد ۱۲ صفحہ ۲۲۴)۔

کے چھیننے اور دردناک عذاب کرنے کے لیے ایک مقدمہ ہو۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح نقل ہوا ہے:

اذا رأیت اللہ یعطی العبد من الدنیا علی معاصیہ ما یحب فانما ھو استدراج ثم تلا رسول اللہ (ص) فلما نسوا......

"جب تم یہ دیکھو کہ خدا گناہوں کے مقابلے میں نعمت بخشتا ہے تو تم سمجھو کہ یہ سزا کا مقدمہ اور تمہید ہے" پھر آپ نے اوپر والی آیت کی تلاوت کی" (مجمع البیان و نور الثقلین ذیل آیہ)۔

حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"یا ابن آدم اذا رأیت ربك سبحانہ یتابع علیك نعمہ و انت تعصیہ فاحذرہ"

(نہج البلاغۃ کلمہ ۲۵)

اے آدم کے بیٹے! جب تو یہ دیکھے کہ خدا تجھے پے در پے نعمتیں بخش رہا ہے جب کہ تو گناہ کرتا جارہا ہے، تو تو اس کی سزا اور عذاب سے ڈر کیونکہ یہ عذاب کا مقدمہ ہے۔

کتاب تلخیص الاقوال میں امام حسن عسکری ؑ سے اس طرح نقل ہوا ہے:

امیر المومنین کے غلام قنبر کو حجاج کے سامنے پیش کیا گیا تو حجاج نے اس سے پوچھا کہ تو علی بن ابی طالب کے لیے کیا کام کیا کرتا تھا۔ قنبر نے کہا کہ میں آپ کے لیے وضو کے اسباب فراہم کرتا تھا۔ حجاج نے پوچھا کہ علی جب وضو سے فارغ ہوتے تھے تو کیا کہا کرتے تھے۔ قنبر نے کہا کہ وہ یہ آیت پڑھا کرتے تھے:۔

فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیھم ابواب کل شیء — اور آخر آیت تک تلاوت کی۔ حجاج نے کہا کہ میرا گمان یہ ہے کہ علی اس آیت کو ہم پر تطبیق کیا کرتے تھے۔ قنبر نے پوری دلیری کے ساتھ جواب دیا، کہ جی ہاں! (نور الثقلین جلد اصفحہ ۱۸)۔

۳۔ ان آیات میں ہے کہ بہت سے رنج آور حوادث سے مراد تو طلوع بیداری کی حالت کو لوٹا دکرنا ہے اور یہ آفات اور بلاؤں کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔ جس کے متعلق ہم توحید[1] کی بحث میں گفتگو کر چکے ہیں۔

لیکن توجہ کے لائق بات یہ ہے کہ اس امر کو پہلے لفظ "لعل" (شاید) کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے ذکر کا سبب یہ ہے کہ مصائب اور بلائیں بیداری کے لیے تنہا کافی نہیں ہیں بلکہ یہ تو آمادگی رکھنے والے دلوں کے لیے زمین ہموار کرتی ہیں۔ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ "لعل" کلام خدا میں عام طور سے ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں اور دوسری شرائط بھی درمیان میں پائی جاتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ یہاں تضرع کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو اصل میں دودھ کے پستان میں آجانے اور دوہنے والے کے سامنے

---

[1] کتاب "آفریدگار جہاں" اور کتاب "جستجوئے خدا" کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس کے مطیع ہونے کے معنی میں ہے پھر اس کے بعد یہ لفظ تواضع اور خضوع کے ساتھ ملی ہوئی اطاعت کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا یعنی ان دردناک حادثات کو ہم اس لیے ایجاد کرتے تھے تاکہ وہ غرور و سرکشی اور خود خواہی کی سواری سے نیچے اتریں اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔

۴۔ یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں خداوند تعالیٰ (الحمد للہ رب العالمین) کہتا ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ ظلم و فساد کی جڑ کو کاٹنا اور ایسی نسل کا نابود ہو جانا جو اس کام کو جاری رکھ سکے اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ شکر و سپاس کی جگہ ہے۔

ایک حدیث میں جو فضیل بن عیاض نے امام صادق علیہ السلام سے نقل کی ہے میں آپ نے فرمایا:

من احب بقاء الظالمین فقد احب ان یعصی اللہ، ان اللہ تبارک و تعالیٰ حمد بنفسہ بھلاک الظلمۃ فقال: فقطع دابر القوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العالمین۔

جو شخص ستمگروں اور ظالموں کی بقا چاہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی نافرمانی ہوتی رہے (موضوع ظلم اس قدر اہم ہے کہ) خدا نے ظالموں کو نابود کرنے کے مقابلہ میں اپنی حمد و ستائش کی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ ستمگر قوم کی نسل منقطع کر دی گئی اور حمد و سپاس مخصوص ہے اس خدا کے لیے جو عالمین کا پروردگار ہے۔

۴۶۔ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ○

۴۷۔ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ○

۴۸۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

۴۹۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ کہہ دو کہ کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اگر خدا تمہارے کان اور آنکھیں تم سے لے لے اور تمہارے دل

پر مہر لگا دے (کہ تم کوئی بات نہ سمجھ سکو) تو خدا کے سوا اور کون ہے کہ جو یہ چیزیں تمہیں دیدے، دیکھو ہم آیات کی کس طرح مختلف طریقوں سے تشریح کرتے ہیں اس کے بعد وہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔

۴۷۔ کہہ دو کہ کیا تم نے یہ بھی غور کیا کہ اگر خدا کا عذاب اچانک (اور پوشیدہ) یا آشکار تمہارے پاس آجائے تو کیا ظالموں کے گروہ کے سوا اور کوئی ہلاک ہوگا۔

۴۸۔ اور ہم پیغمبروں کو نہیں بھیجتے سوائے اس کے کہ وہ بشارت دینے والے اور ڈرانے والے ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ ایمان لے آئیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

۴۹۔ وہ لوگ جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں، ان کی نافرمانیوں کے سبب خداوند تعالیٰ کا عذاب انہیں پہنچے گا۔

تفسیر

نعمتیں بخشنے والے کو پہچانیئے

روئے سخن بدستور مشرکین ہی کی طرف ہے۔

ان آیات میں ایک دوسرے بیان کے ذریعے ان کو بیدار کرنے کے لیے استدلال ہوا ہے اور دفع ضرر کے حوالے سے کہا گیا ہے: اگر خدا کان اور آنکھ جیسی اپنی گراں بہا نعمتیں تم سے لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے اس طرح سے کہ تم اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے درمیان تمیز نہ کر سکو تو خدا کے سوا کون ہے جو یہ نعمتیں تمہیں پلٹا سکے (قل ارءیتم ان اخذ اللہ سمعکم وابصارکم وختم علی قلوبکم من الٰہ غیر اللہ یأتیکم بہ)۔

حقیقت میں مشرکین بھی قبول کرتے تھے کہ خالق و رازق خدا ہی ہے اور بتوں کی بارگاہ خدا میں شفاعت کے عنوان سے پرستش کرتے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ان بے قدر و قیمت بتوں کی پرستش کرو کہ جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، تم براہ راست خدا کے دروازے پر کیوں نہیں جاتے، وہ خدا جو تمام نیکیوں اور برکات کا سرچشمہ ہے۔

اس اعتقاد کے علاوہ جو تمام بت پرست خدا کے بارے میں رکھتے تھے، یہاں پر ان کی عقل کو بھی فیصلہ کی دعوت دی جارہی ہے کہ وہ بت جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں اور نہ ہی عقل و ہوش رکھتے ہیں، دوسروں کو یہ چیزیں کیسے عطا کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: دیکھو ہم کس طرح مختلف طریقوں سے آیات و دلائل کی تشریح کرتے ہیں لیکن وہ پھر بھی حق سے منہ پھیر لیتے ہیں (انظر کیف نصرف الآیات ثم ھم یصدفون)۔

"ختم" کے معنی اور اس بات کی علت کہ "سمع" قرآن کی آیات میں عام طور پر مفرد اور ابصار جمع کیوں آتا ہے؟ اس بارے میں ہم نے اسی تفسیر کی پہلی جلد ص ۱۰۱ (اُردو ترجمہ) پر بحث کی ہے۔

"نصرف" تصریف کے مادہ سے تغییر کے معنی میں ہے اور یہاں مختلف شکل کے استدلال کرنا مراد ہے۔

"یصدفون" "صدف" (بروزن ہدف) کے مادہ سے ہے جو "سمت" اور "طرف" کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان اعراض کرتے وقت منہ پھیرنے کے وقت دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے لہٰذا یہ لفظ اعراض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ البتہ جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے یہ مادہ اعراض کرنے اور شدید روگردانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

بعد والی آیت میں ان تینوں عظیم الٰہی نعمتوں (آنکھ، کان اور فہم) کے ذکر کے بعد کہ جو دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہیں، تمام نعمتوں کے کلی طور پر سلب ہونے کے امکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہیں کہہ دو کہ اگر خدا کا عذاب اچانک بلا کسی اطلاع کے یا آشکارا بانکے پکارے تمہارے پاس آجائے تو کیا ظالموں کے سوا کوئی اور نابود ہوگا (قل ارءیتکم ان اتاکم عذاب الله بغتة او جهرة هل یهلك الا القوم الظالمون)۔[1]

"بغتة" کا معنی ناگہانی اور اچانک ہے اور "جهرة" آشکارا در علی الاعلان کے معنی میں ہے۔ قاعدہ کی رو سے تو آشکار کے مقابلہ میں پنہاں ہونا چاہیے نہ کہ ناگہانی۔ لیکن چونکہ ناگہانی امور کے مقدمات عام طور پر مخفی اور پنہاں ہوتے ہیں، کیونکہ اگر وہ پنہاں نہ ہوں تو ناگہانی نہیں بنتے، اس بنا پر "بغتة" کے لفظ میں پنہاں کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔

اس سے منظور یہ ہے کہ جو ذات طرح طرح کی سزائیں دینے اور نعمتوں کے چھین لینے پر قدرت رکھتی ہے وہ صرف اور صرف ذات خدا ہے اور بتوں کا اس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

اس بنا پر کوئی دلیل اور وجہ نہیں ہے کہ ان کی پناہ لو لیکن چونکہ خدا حکیم اور رحیم ہے لہٰذا وہ ستم گاروں کو ہی سزا دیتا ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "ظلم" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو قسم قسم کے شرک اور گناہوں کو شامل ہے بلکہ قرآن کی آیات میں شرک کو ظلم عظیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے کہا تھا:

لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

بیٹا! خدا کا کسی کو شریک نہ بنانا کیونکہ شرک ظلم عظیم ہے۔ (لقمان - ۱۳)

بعد والی آیت میں خدائی پیغمبروں کے فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: نہ صرف یہ کہ یہاں بتوں سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ بزرگ انبیاء اور خدائی رہبر و رہنما بھی سوائے ابلاغ رسالت، بشارت و نذارت اور تشویق و تہدید

---

[1] "ارءیتکم" کے معنی اور اس کے تجزیہ اور ترکیب کے بارے میں اس سورہ کی آیہ ۴۰ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں اور یہ بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ اسے "اخبرونی" کے معنی میں لیں بلکہ اس کا مفہوم ہے "هل علمتم" (کیا تمہیں معلوم ہے)۔

کے اور کوئی کام نہیں کرتے اور جو بھی نعمت ہے وہ خدا کے حکم سے اور اُسی کی طرف سے ہے اور وہ (انبیاء) بھی اپنی حاجات کو اسی سے طلب کرتے ہیں (وما نرسل المرسلین الا مبشرین و منذرین)۔

اس آیت کے گذشتہ آیات کے ساتھ تعلق کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ گذشتہ آیات میں کئی قسم کی تشویق و تہدید سے متعلق گفتگو تھی، اس آیت میں ہے کہ یہ وہی ہدف ہے کہ جس کے لیے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ ان کا کام بھی بشارت و نذارت (خوشخبری دینا اور ڈرانا ہی) تھا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ راہِ نجات دو چیزوں میں منحصر ہے: وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور اپنی اصلاح کرلیں (اور عمل صالح انجام دیں) انہیں نہ خدائی سزا کا خوف ہے اور نہ ہی انہیں اپنے گذشتہ اعمال کا غم و اندوہ ہے (فمن اٰمن و اصلح فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون)۔

اور ان کے مقابلے میں جو لوگ آیات الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں وہ اس فسق اور نافرمانی کے بدلے میں خدائی سزا اور عذاب میں گرفتار ہوں گے (والذین کذبوا باٰیاتنا یمسھم العذاب بما کانوا یفسقون)۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ آیاتِ خدا کی تکذیب کرنے والوں کی سزا کے بارے میں "یمسھم العذاب" کی تعبیر ہوئی ہے (یعنی پروردگار کا عذاب انہیں مس کرتا ہے)۔ گویا عذاب ہر جگہ ان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور اس کے بعد وہ انہیں بدترین طریقہ سے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

اس نکتہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ "فسق" ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے اور ہر طرح کی نافرمانی، خدا کی اطاعت سے باہر ہو جانا یہاں تک کہ کفر کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اُوپر والی آیت میں بھی یہی معنیٰ مراد ہے۔ اس بنا پر ان بحثوں کا جو فخر الدین رازی اور دیگر مفسرین نے فسق کے بارے میں اس مقام پر کی ہیں اور اُسے گناہوں کے معنیٰ میں بھی شامل سمجھتے ہوئے دفاع کے لیے کھڑے ہوگئے ہیں، کوئی محل باقی نہیں رہتا۔

۵۰۔ قُلْ لَّاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَ لَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَ الْبَصِیْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۠

ترجمہ

۵۰۔ کہہ دو کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں اور نہ میں غیب سے آگاہ ہوں (سوائے اس کے جو خدا مجھے تعلیم دیتا ہے) اور میں تمہیں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو خدا کی طرف سے مجھ پر وحی ہوتی ہے، کہہ دو کہ کیا نابینا اور بینا برابر ہیں تم اس پر غور کیوں

نہیں کرتے ؟

تفسیر

غیب سے آگاہی

اُوپر والی آیت میں کفار و مشرکین کے مختلف اعتراضات پر دیئے گئے جوابات کا آخری حصہ بیان ہوا ہے اور ان کے اعتراضات کے تین حصوں کا مختصر جملوں میں جواب دیا گیا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ وہ (کفار و مشرکین) پیغمبرؐ سے عجیب و غریب معجزات کے مطالبے کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا مطالبہ اس کی اپنی خواہش کے مطابق ہوا کرتا تھا یہاں تک کہ وہ دوسروں کی درخواست پر دکھائے جانے والے معجزات کے مشاہدہ پر بھی قناعت نہیں کرتے تھے۔ وہ پیغمبرؐ سے کبھی سونے کے مکانات کا، کبھی ملائکہ کے نزول کا، کبھی مکہ کی خشک اور بے آب و گیاہ زمین کے سرسبز و شاداب باغوں میں بدل جانے کا اور کبھی دوسری قسم کے مطالبات کا تقاضا کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۹۰ کے ذیل میں اس کی تفصیل آئے گی۔

گویا وہ ایسے عجیب و غریب تقاضے کر کے پیغمبرؐ کے لیے ایک قسم کے مقام الوہیت اور زمین و آسمان کی ملکیت کی توقع رکھتے تھے۔ لہٰذا ان افراد کے جواب میں پیغمبرؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ یہ کہیں کہ میرا یہ ہرگز دعویٰ نہیں ہے کہ خدائی خزانے میرے ہاتھ میں ہیں (قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ)۔

"خزائن" جمع ہے "خزینہ" کی اور خزینہ ہر چیز کے منبع و مرکز کو کہتے ہیں کہ جس کی حفاظت کے لیے اور دوسروں کے اس تک دسترس حاصل کرنے کے لیے اُسے وہاں جمع کیا گیا ہو۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ (سورہ حجر آیہ ۲۱)

اور ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور ہم معلوم اندازے کے سوا اُسے نازل نہیں کرتے۔

اس آیت کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ "خزائن اللہ"، تمام چیزوں کے منبع اور مرکز کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور حقیقت میں یہ منبع اسی ذات لامتناہی کے قبضہ قدرت میں ہے کہ جو تمام کمالات اور قدرتوں کا سرچشمہ ہے۔

اس کے بعد اُن افراد کے مقابلے میں کہ جو یہ توقع رکھتے تھے کہ پیغمبرؐ انہیں تمام گذشتہ اور آئندہ کے اسرار سے آگاہ کریں یہاں تک کہ انہیں یہ بھی بتلائیں کہ اُن کی زندگی سے متعلق کون سے حادثات رونما ہوں گے تاکہ وہ رفع ضرر اور جلب منفعت کے لیے آمادہ ہو جائیں، کہتا ہے: کہیے! میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں تمام پوشیدہ امور اور اسرار غیب سے آگاہ ہوں (ولا اعلم الغیب)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ تمام چیزوں سے صرف وہی ذات باخبر ہو سکتی ہے جو ہر مکان اور ہر

زمان میں حاضر وناظر ہو اور وہ صرف خدا ہی کی ذات پاک ہے لیکن اس کے سوا ہر وہ شخص کہ جس کا وجود ایک معین زمان و مکان میں محدود ہو طبعاً ہر چیز سے باخبر نہیں ہو سکتا لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ خداوند عالم علم غیب کا کچھ حصہ کہ جس کی وہ مصلحت جانتا ہے اور جو خدائی رہبروں کی رہبری کی تکمیل کے لیے ضروری ہے ان کے اختیار میں دیدے۔ البتہ اس کو بالذات علم غیب نہیں کہتے بلکہ اس کو بالعرض علم غیب کہتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں یہ عالم الغیب سے یاد کیا ہوا اور پڑھا ہوا ہوتا ہے۔

قرآن کی متعدد آیات گواہی دیتی ہیں کہ خدا نے اس قسم کا علم نہ صرف یہ کہ انبیاء اور خدائی رہنماؤں کو دیا ہے بلکہ بعض اوقات اُن کے غیر کو بھی دیا ہے۔ منجملہ اُن آیات کے سورۂ جن آیہ ۲۶ و ۲۷ میں ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ

خدا تمام پوشیدہ امور سے آگاہ ہے اور وہ کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر اُن رسولوں کو جن سے وہ راضی ہو۔

اصولی طور پر مقام رہبری کی تکمیل کے لیے۔ علی الخصوص ایسی رہبری جو تمام لوگوں کے لیے ہو، بہت سے ایسے مسائل پر مطلع ہونے کی ضرورت ہے جو باقی دوسرے لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں اور اگر خدا یہ علم غیب اپنے بھیجے ہوئے افراد اور اپنے اولیاء کو نہ دے تو ان کا مقام رہبری تکمیل تک نہیں پہنچتا (غور کیجئے گا)۔

یہ بات تو اپنے مقام پر مسلم ہے کہ بعض اوقات ایک موجود زندہ بھی اپنی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے غیب کے ایک گوشہ کو جاننے کا محتاج ہے اور خدا اُسے اُس کے اختیار میں دیتا ہے۔ مثلاً ہم نے سنا ہے کہ بعض حشرات اور کیڑے مکوڑے گرمیوں میں سردیوں کے موسمی حالات کی پیش بینی کرتے ہیں۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے یہ علم غیب خصوصیت کے ساتھ انہیں دے رکھا ہے کیونکہ ان کی زندگی اس کے بغیر بسا اوقات فنا کی گود میں چلی جاتی ہے۔ ہم اس امر کی مزید تفصیل انشاء اللہ سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ کے ذیل میں بیان کریں گے۔

تیسرے جملے میں اُن لوگوں کے سوال کے جواب میں کہ جو یہ توقع رکھتے تھے کہ خود پیغمبرؐ کو فرشتہ ہونا چاہیے یا کسی فرشتہ کو ان کے ہمراہ ہونا چاہیے اور کسی قسم کے عوارض بشری (مثلاً کھانا، کوچہ و بازار میں چلنا پھرنا) اس میں نظر نہ آئیں ارشاد ہوتا ہے: میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں فرشتہ ہوں (ولا اقول لکم انی ملک)۔

بلکہ" میں تو صرف ان احکام و تعلیمات کی پیروی کرتا ہوں کہ جو پروردگار کی طرف سے بذریعہ وحی مجھ تک پہنچتے ہیں (ان اتبع الا ما یوحیٰ الی)۔

اس جملے سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس جو کچھ بھی تھا اور آپ جو کچھ بھی کرتے تھے اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہی تھی اور جیسا کہ بعض حضرات نے خیال کیا ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے، ایسا ہرگز نہیں ہے اور اسی طرح نہ وہ قیاس پر عمل کرتے تھے اور نہ ہی کسی اور بات پر بلکہ دینی امور میں آپ کا پروگرام صرف وحی کی پیروی میں ہوتا تھا[1]

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا جارہا ہے کہ " کہہ دو کہ کیا نابینا اور بینا افراد برابر ہیں اور کیا وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنی آنکھوں اور فکر و عقل کو بند کر رکھا ہے ان اشخاص کے برابر ہیں جو حقائق کو اچھی طرح سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کیا تم اس بات پر غور نہیں کرتے (قل هل یستوی الاعمٰی والبصیر افلا تتفکرون)۔

گذشتہ تین جملوں کے بعد اس جملے کا ذکر ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ اس سے پہلے جملوں میں پیغمبر نے فرمایا میں نہ خدائی خزانے رکھتا ہوں، نہ غیب کا عالم ہوں اور نہ ہی میں فرشتہ ہوں میں تو صرف وحی کا پیروکار ہوں، لیکن یہ گفتگو اس معنی میں نہیں ہے کہ تم جیسے ہٹ دھرم بت پرستوں کی طرح ہوں بلکہ میں ایک بینا انسان ہوں جب کہ تم نابیناؤں کی طرح ہو اور یہ دونوں مساوی نہیں ہیں۔

اس جملہ کا پہلے جملوں سے تعلق اور جوڑ کے بارے میں دوسرا احتمال یہ ہے کہ توحید اور پیغمبر کی حقانیت کی دلیلیں بالکل واضح و آشکار ہیں لیکن انہیں دیکھنے کے لیے چشم بینا کی ضرورت ہے اور اگر تم قبول نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بات مبہم یا پیچیدہ ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بینا نہیں ہو۔ کیا بینا اور نابینا برابر ہیں ؟

۵۱۔ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○

ترجمہ

۵۱۔ اس (قرآن) کے ذریعے اُن لوگوں کو ڈراؤ جو حشر و نشر اور قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں (وہ دن کہ جس میں) یار و یاور، سرپرست اور شفاعت کرنے والا سوائے اس (خدا) کے نہ رکھتے ہوں گے، شاید وہ تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کریں۔

تفسیر

گذشتہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا تھا کہ نابینا اور بینا یکساں نہیں ہیں اور اس کے عین بعد اس آیت میں پیغمبر کو حکم دیا جارہا ہے: "قرآن کے ذریعے ایسے لوگوں کو ڈراؤ اور بیدار کرو جو قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں۔ یعنی کم از کم ان کے دل کی آنکھیں اتنی ضرور کھلی ہوئی ہیں کہ وہ یہ احتمال رکھتے ہیں کہ حساب و کتاب ہوگا اور اس احتمال کے زیر سایہ اور جوابدہی کے خوف سے قبول کرنے کے لیے آمادگی رکھتے ہیں (وانذر به الذین یخافون ان یحشروا الی ربهم)۔

حاشیہ بر صفحہ سابقہ: لے پیغمبر کے تمام امور دینی تھے وہاں دنیاوی اور دینی امور کا کوئی الگ الگ تصور نہیں ہے (مترجم)۔

شاید ہم کئی بار بیان کر چکے ہیں کہ افراد کی ہدایت کے لیے صرف ایک لائق رہبر اور ایک جامع تربیتی پروگرام ہی کافی نہیں ہے بلکہ خود افراد میں بھی ایک قسم کی آمادگی ضروری ہے۔ جیسا کہ آفتاب کی روشنی چاہ سے راہ کو تلاش کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ چشم بینا کی بھی ضرورت ہے اور مستعد و آمادہ بیج بھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک کہ زمین آمادہ و تیار نہ ہو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس سے واضح ہو گیا ہے کہ "بہ" کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹتی ہے، اگرچہ قبل کی آیات میں قرآن کا صراحت کے ساتھ ذکر نہیں ہوا، لیکن یہ بات قرائن سے واضح ہے۔

اسی طرح "یخافون" (ڈرتے ہیں) سے مراد وہی نقصان و ضرر کا احتمال ہے کہ جو ہر عقلمند کے ذہن میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ انبیاء اور رہبران خدا کی دعوت پر غور کرتا ہے کہ شاید ان کی دعوت حق ہو، اور اس کی مخالفت زیاں اور خسارے کا سبب بنے لہٰذا کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان کی دعوت کا مطالعہ کروں اور ان کے دلائل پر غور کروں؟۔

یہ ہدایت کی اولین شرائط میں سے ایک ہے، اور یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے علمائے عقائد لزوم "دفع ضرر محتمل" کے عنوان سے مدعی نبوت کی دعوت کے مطالعہ کے وجوب اور خدا کی شناسائی کے بارے میں مطالعہ کے لزوم کی دلیل قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیدار دل افراد اس دن سے ڈرتے ہیں کہ جب سوائے خدا کے اور کوئی پناہ گاہ اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا (لیس لھم من دونہ ولی و لا شفیع)۔

ہاں ایسے افراد کو ڈراؤ اور انہیں خدا کی طرف دعوت دو کیونکہ اُن کے بارے میں تقویٰ اور پرہیزگاری کی اُمید ہے (لعلھم یتقون)۔

البتہ اس آیت میں غیر خدا کی شفاعت و ولایت کی نفی مردان خدا کی ولایت و شفاعت کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں بالذات شفاعت و ولایت کی نفی مراد ہے، یعنی یہ دو مقام ذاتی طور پر خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اب اگر اس کا غیر مقام ولایت و شفاعت رکھتا ہے تو وہ اس کے اذن و اجازت اور فرمان کے ساتھ ہے جیسا کہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ؕ

کون ہے جو اس کی بارگاہ میں اُس کے حکم کے بغیر شفاعت کرے (بقرہ ۲۵۵)۔

اس کی مزید توضیح اور شفاعت کی مکمل بحث کے بارے میں تفسیر نمونہ کی جلد اول صفحہ ۱۹۸ (اُردو ترجمہ) اور جلد دوم صفحہ ۱۵۵ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۵۲۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ

وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۵۳۔ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○

ترجمہ

۵۲۔ ان لوگوں کو جو صبح شام خدا کو پکارتے ہیں اور اس کی ذات پاک کے علاوہ کسی پر نگاہ نہیں رکھتے اپنے سے دور نہ کر۔ نہ ان کا حساب تجھ پر ہے اور نہ تیرا حساب ان پر ہے، اگر تو ان کو دھتکارے گا تو ظالموں میں سے ہو جائے گا۔

۵۳۔ اور اس طرح ہم نے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ساتھ آزمایا ہے (تونگروں کو فقیروں کے ذریعے) تاکہ وہ یہ کہیں کہ کیا یہ ہیں وہ کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان سے (چنا ہے اور) ان پر احسان کیا ہے (اور انہیں نعمت ایمان سے نوازا ہے) تو کیا خدا شکر کرنے والوں کو بہتر طور پر پہچانتا نہیں ہے؟

تفسیر

شانِ نزول

اُوپر والی آیات کی شان نزول میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں کہ جو سب کی سب ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک وہ ہے کہ جو تفسیر "درالمنثور" میں اس طرح نقل ہوئی ہے کہ قریش کی ایک جماعت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے گزری جب کہ صہیب، عمار، بلال اور خباب اور ان ہی جیسے دوسرے فقیر اور مزدور قسم کے مسلمان پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر تھے، انہوں نے یہ منظر دیکھ کر تعجب کیا (اور چونکہ وہ شخصیت کو مال و ثروت اور مقام و منصب میں منحصر سمجھتے تھے لہٰذا وہ ان مردانِ بزرگ کے مقام روحانی کی عظمت اور آئندہ کے عظیم اسلامی اور انسانی معاشرے کی تشکیل کے سلسلے میں ان کے کارناموں کے نقوش کو سمجھ نہ سکے) اور کہنے لگے کہ اے محمدؐ! کیا آپ نے ساری جمعیت میں سے بس انہی افراد پر قناعت کرلی ہے؟ کیا یہی ہیں وہ کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان میں سے منتخب کیا ہے؟ کیا

ہم ان کے پیرو ہو جائیں ؛ جتنا جلدی ہو سکے آپ انہیں اپنے سے دور کر دیجیے تو شاید ہم آپ کے قریب آ جائیں اور آپ کی پیروی کریں ۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اس تقاضے اور مطالبے کو شدت کے ساتھ رد کر دیا گیا۔

بعض مفسرین اہل سنت نے اسی جیسی ایک حدیث نقل کی ہے ، مثلاً "المنار" کے مؤلف نے اسی کے مانند روایت کرتے ہوئے مزید اضافہ کیا ہے کہ عمر بن خطاب وہاں حاضر تھے اور انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے یہ تقاضا کیا کہ اس میں کیا حرج ہے کہ ہم ان کے مطالبہ کو مان لیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں تو اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اس تقاضے کو بھی رد کر دیا ۔

اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اس سورہ کی بعض آیات کی شان نزول کا ذکر کرنا اس بات کے منافی نہیں کہ یہ پوری سورت ایک ہی جگہ پر نازل ہوئی ہو ۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس سورت کے نزول سے پہلے طرح طرح کے حوادث مختلف فاصلوں میں رونما ہو چکے ہوں اور یہ سورت ان سب حوادث کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو ۔

اس مقام پر اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری نظر آتا ہے کہ کچھ روایات میں یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرمؐ نے ان کی پیش کش قبول نہ کی تو انہوں نے یہ درخواست کی کہ اشراف قریش اور فقیر صحابہ کے درمیان باری مقرر کر لیں ، یعنی ایک روز ان کے لیے اور ایک دن ان کے لیے مقرر دیں تاکہ وہ اکٹھے ایک ہی جلسہ میں نہ بیٹھیں تو پیغمبر اکرمؐ نے (پہلے) ان کی یہ تجویز قبول کر لی تاکہ شاید یہ بات ان کے ایمان لانے کا ذریعہ بن جائے تو انہوں نے کہا کہ یہ مطلب ایک قرارداد کے عنوان سے تحریر میں لایا جائے پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو مذکورہ قرارداد لکھنے پر مامور ہی کیا تھا کہ اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس کام سے روک دیا گیا ۔

لیکن یہ روایت علاوہ اس کے کہ تعلیمات اسلامی کی روح کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور آپؐ نے کبھی اس قسم کے امتیازی سلوک کی طرف جھکاؤ کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہر جگہ معاشرۂ اسلامی کی وحدت کی بات کی ہے ، قبل کی آیت کے ساتھ بھی مطابقت نہیں رکھتی جس میں کہا گیا ہے کہ : " ان اتبع الا ما یوحیٰ الی " (میں تو صرف وحی الٰہی کی پیروی کرتا ہوں) ، یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبرؐ نے وحی کا انتظار کیے بغیر اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا ہو ۔

علاوہ ازیں " لا تطرد " کا جملہ جو زیر بحث آیت کی ابتدا میں ہے ، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا مطالبہ اصحاب پیغمبرؐ کے اس گروہ کو مطلقاً ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کرنے کے لیے تھا نہ کہ نوبت اور باری مقرر کرنے کا مطالبہ تھا ۔ کیونکہ "تناوب" اور "طرد" میں بہت فرق ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شانِ نزول وہی ہے جو ہم ابتدا میں بیان کر چکے ہیں ۔

طبقاتی تقسیم کے خلاف جنگ

اس آیت میں مشرکین کی ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہیں توقع تھی کہ پیغمبرؐ فقیر

طبقے کے مقابلے میں ثروت مندوں کے لیے امتیاز کے قائل ہو جائیں گے اور ان کا خیال تھا کہ ان کا ان اصحابِ پیغمبرؐ کے پاس بیٹھنا ان کے لیے عیب اور بہت بڑا نقص ہے حالانکہ وہ اس بات سے غافل تھے کہ اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ وہ اس قسم کے لغو اور بے بنیاد امتیازات کو ختم کر دے۔ اسی لیے وہ اس تجویز پر بہت مُصر تھے کہ پیغمبرؐ اس گروہ کو اپنے قرب سے دور کریں لیکن قرآن صراحت کے ساتھ اور وزنی دلائل پیش کر کے ان کی تجویز کی نفی کرتا ہے۔ پہلے کہتا ہے: اُن اشخاص کو کہ جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور سوائے اس کی ذات پاک کے ان کی نظر کسی پر نہیں ہے انہیں ہرگز اپنے سے دور نہ کرنا (ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداوۃ والعشی یریدون وجھہ[1])۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ یہاں بجائے اس کے کہ ان اشخاص کا نام یا عنوان ذکر کیا جاتا صرف اس صفت کے ذکر کرنے پر قناعت ہوئی ہے کہ وہ صبح و شام — اور دوسرے لفظوں میں ہمیشہ — خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں اور یہ عبادت و پرستش اور پروردگار کی طرف توجہ نہ تو کسی اور غرض کے لیے ہے اور نہ ہی ریاکاری سے بلکہ (ان کی یہ عبادت) صرف اس کی ذات پاک کے لیے ہے، وہ اُسے صرف، خود اُسی کی خاطر چاہتے ہیں اور اس کے پاس آتے ہیں اور کوئی امتیاز اس امتیاز کی برابری نہیں کر سکتا۔

قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ثروت مند اور خود پسند مشرکین کی طرف سے یہ پہلی اور آخری بار نہ تھا کہ انہوں نے پیغمبرؐ کو ایسی تجویز پیش کی ہو۔ بلکہ وہ بارہا ایسا اعتراض کر چکے تھے کہ پیغمبرؐ نے کچھ بیکس و بینوا افراد کو اپنے گرد کیوں جمع کر لیا ہے اور ان کا یہ اصرار تھا کہ آپ انہیں اپنے پاس سے چلتا کر دیں۔

حقیقت میں یہ لوگ ایک پرانی غلط روایت کی بنا پر سمجھتے تھے کہ افراد میں امتیاز دولت و ثروت کے سبب سے ہوتا ہے اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ معاشرے کے طبقات جو ثروت کی بنیاد پر وجود میں آئے ہیں وہ محفوظ رہنے چاہئیں اور ہر وہ دین اور ہر وہ دعوت جو طبقاتی زندگی کو ختم کرنا چاہے اور ان امتیازات کو نظر انداز کرے وہ ان کی نظر میں مطرود اور ناقابلِ قبول ہے۔

ہم حضرت نوح علیہ السلام کے حالات میں بھی پڑھتے ہیں کہ ان کے زمانے کے "بڑے آدمی" اُن سے یہ کہتے تھے:

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ

ہم نہیں دیکھتے کہ کسی نے تمہاری پیروی کی ہو سوائے اُن لوگوں کے کہ جو ہم میں سے فرومایہ اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں (ہود آیہ ۲۷)۔

اور وہ اسے ان کی رسالت کے باطل ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔

ایک نشانی اسلام اور قرآن کی عظمت کی بلکہ کلی طور پر انبیاء کی عظمت کی یہ ہے کہ اُن سے جتنی سختی کے ساتھ ہو سکتا

---

[1] "وجہ" کا معنی لغت میں چہرہ ہے اور بعض اوقات ذات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت میں اس سے مراد دوسرا معنی ہی ہے۔ اس موضوع کے بارے میں مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد دوم صفحہ ۲۰۵ (اردو ترجمہ) پر مطالعہ کریں۔

تھا اس قسم کی سوچوں کا مقابلہ کیا اور ایسے معاشروں میں کہ جن میں طبقاتی اختلاف ایک دائمی مسئلہ شمار ہوتا تھا، اس موہوم امتیاز کو کچلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ سلمان، ابی ذر، صہیب، خباب اور بلال جیسے پاک دل، صاحب ایمان اور عقلمند افراد میں مال و دولت نہ رکھنے کے باوجود معمولی سی بھی کمزوری اور نقص نہیں ہے اور بے مغز، کوردل، خودخواہ اور متکبر ثروت مند اپنی دولت و ثروت کی وجہ سے اجتماعی اور معنوی امتیازات سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے۔

بعد والے جملے میں فرمایا گیا ہے: "کوئی وجہ نہیں کہ اس قسم کے صاحبان ایمان کو تو اپنے سے دور کرے، نہ ان کا حساب تیرے اُوپر ہے اور نہ تیرا حساب اُن کے اُوپر ہے (ما علیك من حسابهم من شیء وما من حسابك علیهم من شیء) اس کے باوجود اگر تم اُن کو اپنے سے دور کروگے تو ستمگروں اور ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (فتطردهم فتكون من الظٰلمین)۔

اس بارے میں کہ یہاں پر حساب سے کونسا حساب مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا احتمال ہے کہ اس سے مراد ان کی روزی کا حساب ہے۔

یعنی اگر ان کا ہاتھ مال و دولت سے خالی ہے تو وہ تمہارے کندھے پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے کیونکہ ان کی روزی کا حساب تو اللہ پر ہے، جیسا کہ تم بھی اپنی زندگی کا بوجھ ان پر نہیں ڈالتے، اور تمہاری روزی کا حساب اُن پر نہیں ہے۔

ابھی ہم وضاحت کریں گے یہ احتمال بعید نظر آتا ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ حساب سے مراد اعمال کا حساب ہے جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ کس طرح فرماتا ہے کہ ان کے اعمال کا حساب تم پر نہیں ہے حالانکہ ان کا کوئی بُرا عمل نہیں تھا کہ ایسی بات کرنا ضروری ہوتا، یہ اس بنا پر ہے کہ مشرکین اصحاب پیغمبرؐ میں سے فقراء کو مال و ثروت نہ ہونے کی وجہ سے خدا سے دُور سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے اعمال خدا کے ہاں قابل قبول ہوتے تو پھر انہیں زندگی کے لحاظ سے خوشحال کیوں نہیں بنایا گیا۔ علاوہ ازیں وہ انہیں اس بات سے متہم کرتے تھے کہ شاید ان کا ایمان لانا زندگی کی اصلاح اور روٹی پانی کے حصول کے لیے تھا۔

قرآن انہیں جواب دیتا ہے کہ فرض کرو کہ ایسے ہی ہو، لیکن ان کا حساب تو خدا کے ساتھ ہے۔ صرف اس بات پر کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اور مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے ہیں، کسی قیمت پر انہیں دھتکارا نہیں جانا چاہیے اور اس طرح سے امراء قریش کی بہانہ جوئیوں پر گرفت کی گئی ہے

شاید یہ تفسیر وہی ہے کہ جو حضرت نوحؑ کی داستان میں بیان ہوئی ہے جو اشراف قریش کی داستان کے مشابہ ہے۔ جہاں قوم نوح آپ سے کہتی ہے:

انؤمن لك واتبعك الارذلون۔

کیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں؟ حالانکہ بے وقعت افراد نے تیری پیروی کی ہے۔

حضرت نوحؑ ان کے جواب میں کہتے ہیں:

وما علمی بما کانوا یعملون ان حسابهم الا علی ربی لو تشعرون وما انا بطارد المؤمنین۔

مجھے ان کے اعمال کی کیا خبر ہے؟، ان کے اعمال کا حساب تو اللہ پر ہے اگر تم جانو اور جنہوں نے ایمان کا اظہار کیا ہے میں انہیں اپنے سے دور نہیں کر سکتا۔[1]

خلاصہ یہ کہ پیغمبر کی ذمہ داری یہ ہے کہ بغیر کسی فرق و امتیاز کے جو شخص بھی ایمان کا اظہار کرے خواہ وہ کسی بھی قوم، قبیلہ اور طبقہ سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو اُسے قبول کرے چہ جائیکہ وہ پاک دل اور صاحب ایمان افراد ہوں کہ جو خدا کے سوا کسی کے جویا نہیں ہیں اور ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ ان کا ہاتھ مال و ثروت سے خالی ہے اور وہ اشراف کی نکبت بار زندگی میں آلودہ نہیں ہیں۔

اسلام کا ایک عظیم امتیاز

ہم جانتے ہیں کہ آجکل کی مسیحیت میں مذہبی راہنماؤں کا دائرہ اختیار مضحکہ انگیز حد تک وسعت پا چکا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے لیے گناہ بخش دینے کے حق کے قائل ہیں اور اسی بنا پر اگر وہ چاہیں تو کسی شخص کو معمولی سی بات پر دھتکار دیں اور کافر قرار دے دیں اور چاہیں تو کسی کو قبول کر لیں۔

قرآن مجید زیر نظر آیت میں اور دیگر آیات میں صراحت کے ساتھ یاد دہانی کراتا ہے کہ نہ صرف مذہبی علماء بلکہ پیغمبر کی ذات تک بھی اظہار ایمان کرنے والے کو دھتکارنے اور دور کرنے کا حق نہیں رکھتے تھے، جب کہ انہوں نے کوئی ایسا کام بھی انجام نہیں دیا کہ جو ان کے اسلام سے خارج ہونے کا سبب بنے۔ گناہوں کی بخشش اور بندوں کا حساب و کتاب صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے سوا کوئی بھی اس کام میں دخل دینے کا حق نہیں رکھتا۔

لیکن کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو، آیت میں موضوع بحث "طرد مذہبی" ہے نہ کہ "طرد حقوقی" اس معنی میں کہ اگر مثلاً ایک مدرسہ خاص قسم کے طالب علموں کے لیے وقف ہو اور کوئی شخص ابتداء سے ان شرائط کا حامل ہو اور بعد میں اس میں یہ شرائط باقی نہ رہیں تو اسے اس مدرسہ سے نکالنا کوئی مانع نہیں رکھتا اور اسی طرح اگر مدرسہ کا متولی مدرسہ کی مصلحتوں کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کچھ اختیارات رکھتا ہو تو اس مدرسے کے نظام اور اس کی حیثیت و موقعیت کی حفاظت کے لیے ان جائز اختیارات سے استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے (اس بنا پر وہ مطالب جو تفسیر المنار میں اس آیہ کے ذیل میں اس مطلب کے برخلاف نظر آتے ہیں وہ "طرد مذہبی" کے "طرد حقوقی" سے اشتباہ سے پیدا ہوئے ہیں)۔

بعد والی آیت میں بے ایمان دولت مند افراد کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ واقعات ان کے لیے آزمائش ہیں اور اگر وہ ان آزمائشوں کی بھٹی سے صحیح طریقے سے باہر نہ نکل سکے تو وہ دردناک عواقب و انجام کے متحمل ہوں گے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اس طرح سے ان میں سے بعض کو دوسرے بعض کے ذریعے آزمایا (وکذالك فتنا بعضهم ببعض) یہاں "فتنة" آزمائش کے معنی میں ہے۔[2]

---

[1] شعراء ۱۱۱ تا ۱۱۴۔

[2] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۲ سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۱ (صفحہ ۲۰ اُردو ترجمہ) اور آیہ ۱۹۳ (صفحہ ۲۹ اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اس سے سخت آزمائش اور کیا ہوگی کہ وہ اشراف اور دولت مند کہ جنہوں نے سالہا سال سے یہ عادت بنالی ہوئی ہے کہ اپنے تمام معاملات کو نچلے طبقے کے لوگوں سے بالکل الگ رکھیں، نہ ان کی خوشی میں شریک ہوں اور نہ ہی ان کے رنج وغم میں، یہاں تک کہ ان کی قبریں بھی ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوں، وہ یکا یک ان تمام آداب ورسوم کو توڑ ڈالیں اور ان عظیم زنجیروں کو اپنے ہاتھ پاؤں سے نکال پھینکیں اور ایسے دین کو اپنالیں کہ جس کی طرف سبقت کرنے والے لوگ اصطلاح کے مطابق نچلے درجے اور طبقہ فقراء کے آدمی شمار ہوتے ہیں۔

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے کہ ان تونگروں کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سچے مومنین کی طرف حقارت کی نگاہ ڈال کر کہتے ہیں "کیا یہی لوگ ہیں کہ جنہیں خدا نے ہمارے درمیان میں سے چن لیا ہے اور انہیں نعمت ایمان واسلام کے ساتھ نوازا ہے[1]، کیا یہ اس قسم کی باتوں کی قابلیت رکھتے ہیں (لیقولوا اھٰؤلاء من اللہ علیھم من بیننا)۔

بعد میں ان کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ صاحبان ایمان ایسے افراد ہیں کہ انہوں نے عمل و تشخیص کی نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور اُس کو روبہ عمل لائے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے پیغمبر کی دعوت کی نعمت کا شکر ادا کیا ہے اور ان کی دعوت کو قبول کیا ہے۔ اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر شکر اور کیا ہوگا۔ اسی بنا پر خدا نے ایمان کو ان کے دلوں میں راسخ کردیا ہے۔ کیا خدا شکر گزاروں کو بہتر نہیں پہچانتا (الیس اللہ باعلم بالشاکرین)۔

۵۴۔ وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۵۵۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ○

ترجمہ

۵۴۔ جب وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائے ہیں تمہارے پاس آئیں تو اُن سے کہو، تم پر سلام ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اُوپر رحمت فرض کرلی ہے۔ تم میں سے جو آدمی نادانی سے کوئی بُرا کام کرلے اس کے بعد توبہ اور اصلاح (و تلافی) کرلے تو وہ بخشنے والا مہربان ہے

---

[1] سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۶۴ کے ذیل میں اشارہ ہوچکا ہے کہ "منت" اصل میں نعمت بخشنے کے معنی میں ہے مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ (صفحہ ۱۲۲ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

۵۵۔ اور ہم اس طرح سے آیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں (اور واضح کرتے ہیں) تاکہ گنہگاروں کا راستہ آشکار ہو جائے۔

تفسیر

بعض کا نظریہ تو یہ ہے کہ پہلی آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جن کے متعلق گذشتہ آیات میں پیغمبر کو حکم دیا گیا تھا کہ انہیں اپنے پاس سے دھتکاریں نہیں اور انہیں اپنے سے جدا نہ کریں، اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کچھ گنہگاروں کے بارے میں ہے کہ جو پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے یہ اظہار کیا تھا کہ ہم نے بہت گناہ کیے ہیں اس پر رسول اللہؐ نے سکوت اختیار کیا تو زیرِ نظر آیت نازل ہوئی۔

بہر حال اس کی شانِ نزول خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس میں شک نہیں کہ آیت کا مفہوم کلی اور وسیع ہے اور سب پر محیط ہے، کیونکہ پہلے ایک قانونِ کلی کے طور پر پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام اہل ایمان کو خواہ وہ گنہگار ہی کیوں نہ ہوں، نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے دھتکاریں نہیں بلکہ انہیں گلے لگائیں اور قبول کریں، اور فرمایا گیا کہ: جب وہ لوگ کہ جو ہماری آیات پر ایمان لا چکے ہیں تیرے پاس آئیں تو ان سے کہو تم پر سلام ہو (و اذا جاءك الذين يؤمنون باٰيٰتنا فقل سلام عليكم)۔

یہ سلام ممکن ہے کہ خدا کی طرف سے اور پیغمبر کے وسیلہ سے ہو اور یا براہ راست خود پیغمبرؐ کی طرف سے ہو، اور یہ ہر حال میں ان کی پذیرائی اور استقبال کرنے اور ان سے افہام و تفہیم اور دوستی کرنے کی دلیل ہے۔

دوسرے جملہ میں مزید فرمایا گیا ہے: تمہارے پروردگار نے رحمت کو اپنے اوپر فرض کر لیا ہے (كتب ربكم على نفسه الرحمة)۔

"کتب" جو مادہ کتابت سے ہے لکھنے کے معنی میں ہے اور بہت سے مواقع پر لازم ہونے، قبول کرنے اور ذمہ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ لکھنے کے آثار میں سے ایک اثر کسی چیز کا مسلّم ہونا اور ثابت رہ جانا ہے۔

تیسرے جملہ میں کہ جو درحقیقت رحمتِ الٰہی کی توضیح و تفسیر ہے، ایک محبت آمیز تعبیر کے ساتھ یوں فرمایا گیا ہے: تم میں سے جو شخص کوئی کام از روئے جہالت انجام دے، اس کے بعد توبہ کرلے اور اصلاح اور تلافی کرے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے (انه من عمل منكم سوء بجهالة ثم تاب من بعده و اصلح فانه غفور رحيم)۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں[1] ایسے مواقع پر "جہالت" سے مراد وہی شہوت اور خواہش نفسانی کا غلبہ اور طغیان و سرکشی ہے، جس میں انسان حق سے دشمنی اور عداوت کی بنا پر نہیں بلکہ ہوی و ہوس کے غلبہ کی خاطر اس طرح ہو جاتا ہے

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۳ صـ ۲۲۸ (اردو ترجمہ)

کہ فروغ عقل اور خواہش کا کنٹرول ہاتھ سے دے بیٹھتا ہے، ایسا شخص اگرچہ گناہ اور حرام کا علم رکھتا ہے مگر چونکہ اس کا علم ہوئی وہوس کے پردے میں آگیا ہے اس لیے اس پر "جہالت" کا اطلاق ہوا ہے۔ مسلمہ طور پر ایسا شخص اپنے گناہ کے لیے جوابدہ ہے، لیکن چونکہ وہ گناہ عداوت اور دشمنی کی بنا پر نہیں تھا لہٰذا وہ سعی و کوشش کرتا ہے کہ اس کی اصلاح اور تلافی ہو جائے۔

حقیقت میں یہ آیت پیغمبر اسلام کو حکم دے رہی ہے کہ تم کسی بھی صاحب ایمان فرد کو خواہ وہ کسی طبقہ سے ہو، کسی نسل سے ہو اور کیسے ہی حالات سے دوچار ہو نہ صرف یہ کہ اپنے پاس سے نہ دھتکارو بلکہ اپنے دامن کو یکساں طور پر سب کے لیے کھول دو، یہاں تک کہ اگر کچھ لوگ بہت سے گناہوں میں آلودہ بھی ہوں تو انہیں بھی قبول کرلو اور ان کی اصلاح کرو۔

بعد والی آیت میں اس مطلب کی تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم اپنی آیات، نشانیاں اور احکام اس طرح روشن اور مشخص کرتے ہیں کہ حق کے متلاشیوں اور اطاعت گزاروں کا راستہ بھی واضح و آشکار ہو جائے اور ہٹ دھرم گنہگار دل اور حق کے دشمنوں کی راہ بھی معلوم و روشن ہو جائے (وکذالك نفصل الأيات ولتستبين سبيل المجرمين)[1]۔

واضح ہے کہ اوپر والی آیت میں "مجرم" سے مراد ہر گنہگار نہیں ہے، کیونکہ اس آیت میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب گنہگار ان کے پاس آئیں، خواہ انہوں نے نادانی کی بنا پر کتنے ہی غلط اعمال انجام دیئے ہوں، انہیں قبول کریں۔ اس بنا پر یہاں مجرم سے مراد وہی ہٹ دھرم اور سخت قسم کے گنہگار ہیں جو کسی ذریعہ سے بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے ہوں، یعنی حق کی طرف اس عمومی اور ہمہ گیر دعوت کے بعد، یہاں تک کہ ان گنہگاروں کو دعوت دینے کے بعد کہ جو اپنے کام سے پشیمان ہیں، اب ہٹ دھرم اور ناقابل توجہ مجرموں کے طرز عمل کو مکمل طور پر واضح کیا جا رہا ہے۔

۵۶۔ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّاۤ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ○

۵۷۔ قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ○

---

[1] حقیقت میں جملہ "ولتستبین" عطف ہے ایک محذوف جملہ پر جو مقابل کے قرینہ سے سمجھا جاتا ہے یعنی "لتستبین سبیل المؤمنین المطیعین ولتستبین سبیل المجرمین" تاکہ اطاعت کرنے والے مومنین کا راستہ اور گنہگاروں کا راستہ الگ الگ واضح اور روشن ہو جائے۔

۵۸۔ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ○

ترجمہ

۵۶۔ تم کہہ دو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ کہہ دو کہ میں تمہاری ہوا و ہوس کی پیروی نہیں کرتا، اگر میں ایسا کروں گا تو گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔

۵۷۔ تم کہہ دو کہ میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح اور روشن دلیل رکھتا ہوں اور تم نے اس کی تکذیب کی ہے (اور اسے قبول نہیں کیا) وہ چیز کہ جس کے بارے میں تمہیں زیادہ جلدی ہے وہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حکم اور فرمان جاری کرنا صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ (حق کو باطل سے) بہترین (طریقے پر) جدا کرنے والا ہے۔

۵۸۔ تم کہہ دو کہ اگر وہ چیز جس کے بارے میں تمہیں جلدی ہے میرے پاس ہوتی (اور میں تمہاری درخواست پر عمل کرتا تو عذاب الٰہی تم پر نازل ہو جاتا اور) میرا اور تمہارا کام انجام کو پہنچ جاتا اور خدا ظالموں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے۔

تفسیر

بے جا اصرار اور ہٹ دھرمی

ان آیات میں روئے سخن اسی طرح ہٹ دھرم مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہے جیسا کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات اسی بحث کے گرد گھومتی ہیں۔ ان آیات کا لب ولہجہ کچھ اس طرح کا ہے جیسا کہ انہوں نے پیغمبر کو دعوت دی تھی کہ پیغمبر اُن کے دین کی طرف جھک جائے لہٰذا پیغمبرؐ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ انہیں صراحت کے ساتھ کہہ دے کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جن کی تم خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہو (قل انی نهیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ)۔

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

لفظ "نہیت " (ممنوع قرار دیا گیا ہوں) جو فعل ماضی مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ بتوں کی پرستش کا ممنوع ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔

اس کے بعد "کہہ دو اے پیغمبرؐ میں تمہاری ہوا و ہوس کی پیروی نہیں کرتا" (قل لا اتبع اھوائکم)۔ اس جملے کے ذریعے ان کے مطالبہ کا واضح جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ کہ بت پرستی کوئی منطقی دلیل نہیں رکھتی اور ہرگز عقل و خرد سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ عقل اچھی طرح سے سمجھتی ہے کہ انسان جماد سے اشرف ہے تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان دوسری مخلوق کے سامنے یہاں تک کہ ایک پست تر مخلوق کے سامنے سر تعظیم جھکائے۔ اس کے علاوہ زیادہ تر بت خود انسان کے گھڑے اور بنے ہوئے ہوتے تھے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ چیز جو خود انسان کی مخلوق ہو اس کی معبود اور اس کی حلالِ مشکلات ہو جائے۔ اس بنا پر بت پرستی کا سرچشمہ اندھی تقلید، خرافات اور ہوا پرستی کی پیروی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

آخر میں مزید تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: اگر میں ایسا کام کروں تو یقیناً گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے نہ رہوں گا (قد ضللت اذًا و ما انا من المھتدین)۔

بعد والی آیت میں انہیں ایک اور جواب دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح اور روشن دلیل رکھتا ہوں، اگرچہ تم نے اسے قبول نہیں کیا اور اس کی تکذیب کی ہے (قل انی علی بینة من ربی و کذبتم بہ)۔

"بینة" اصل میں ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جو دو چیزوں کے درمیان اس طرح سے جدائی ڈال دے کہ ان میں کسی طرح سے دوبارہ اتصال اور باہمی تعلق نہ ہو سکے۔ اس کے بعد روشن اور واضح دلیل کو بھی کہا جانے لگا کیونکہ وہ حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔

فقہی اصطلاح میں اگرچہ "بینة" دو عادل افراد کی گواہی کو کہا جاتا ہے لیکن اس کا لغوی معنی کامل طور پر وسیع ہے اور دو عادلوں کی گواہی اس کا ایک مصداق ہے، اور اگر معجزات کو "بینة" کہا جاتا ہے تو وہ بھی اسی بنا پر ہے کہ وہ حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں، اور اگر آیات و احکام الٰہی کو "بینة" کہتے ہیں تو وہ بھی اس وسیع مفہوم کے ایک مصداق کے طور پر۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں بھی پیغمبرؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کا سہارا لیں کہ خدا پرستی کی راہ میں اور بتوں سے جنگ میں میرا مدرک کامل طور سے روشن اور آشکار ہے اور تمہارا انکار اور تکذیب اس کی اہمیت میں کوئی کمی پیدا نہیں کر سکتے۔

حاشیہ صفحہ سابق: لفظ "الذین" کا استعمال جو ذوی العقول جمع مذکر کے لیے ہوتا ہے بتوں کے لیے اس بنا پر ہوا ہے، کیونکہ ان کی فکر کے دریچہ سے ان سے گفتگو کی جا رہی ہے۔

اس کے بعد ان کی بہانہ سازیوں میں سے ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ اگر تم حق پر ہو تو وہ عذاب کہ جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو اسے جلدی لے آؤ۔ پیغمبر اُن کے جواب میں کہتے ہیں، وہ چیز کہ جس کے بارے میں تم جلدی کر رہے ہو وہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے (ما عندی ما تستعجلون به) تمام کام اور تمام احکام سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں (ان الحکم الا لله)۔

اور بعد میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: وہی ہے کہ جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہے اور وہ حق کو باطل سے سب سے بہتر طور پر جدا کرنے والا ہے (یقص الحق و ھو خیر الفاصلین)۔

ظاہر ہے کہ حق کو باطل سے وہی اچھی طرح جدا کر سکتا ہے کہ جس کا علم سب سے زیادہ ہو اور اُس کے لیے حق و باطل کی شناخت کامل طور سے روشن ہو۔ علاوہ ازیں وہ اپنے علم و دانش کو روبرعمل لانے کے لیے کافی قدرت بھی رکھتا ہو اور یہ دونوں صفات (علم و قدرت) نامحدود اور بے پایاں طور پر صرف خداوند تعالیٰ کی ذاتِ پاک کے ساتھ مخصوص ہیں، لہٰذا وہی حق کو باطل سے سب سے بہتر طور پر جدا کرنے والا ہے۔

بعد والی آیت میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اس ہٹ دھرم اور نادان گروہ کی جانب سے عذاب و سزا کے مطالبہ پر انہیں کہہ دو کہ وہ چیز جس کے جلدی ہو جانے کا مطالبہ تم مجھ سے کرتے ہو اگر وہ میرے قبضہ و اختیار میں ہوتی اور میں تمہاری درخواست پر عمل کر دیتا تو میرا اور تمہارا کام ختم ہو گیا ہوتا (قل لو ان عندی ما تستعجلون به لقضی الامر بینی و بینکم)۔

لیکن اس غرض سے کہ کہیں وہ یہ خیال نہ کریں کہ ان کی سزا کو بھلا دیا گیا ہے آخر میں قرآن کہتا ہے: خداوند تعالیٰ ستم گاروں اور ظالموں کو سب سے بہتر طور پر پہچانتا ہے اور موقع پر انہیں سزا دے گا (و الله اعلم بالظالمین)۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی گذشتہ قومیں اپنے انبیاء سے یہی درخواست کرتی رہیں کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اُس عذاب کو، جس کے ہمارے اُوپر نازل ہونے کی توقع رکھتے ہو ہماری طرف کیوں نہیں بھیجتے۔

قوم نوحؑ نے بھی اُن سے یہی درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ اے نوحؑ! تم ہم سے اتنی باتیں کیوں کرتے ہو اور ہم سے کیوں جھگڑتے ہو، اگر تم سچ کہتے ہو تو وہ عذاب جس سے ہمیں ڈرا رہے ہو اُسے جلدی سے لے آؤ۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ۔

(ھود۔ ۳۲)

ایسا ہی تقاضا قوم صالحؑ نے بھی اُن سے کیا تھا۔ (اعراف۔ ۷۷)

قوم عاد نے بھی اپنے پیغمبر ہودؑ سے ایسا ہی تقاضا کیا تھا (اعراف۔ ۷۰)

سورہ بنی اسرائیل سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخواست پیغمبر اسلامؐ سے بارہا کی گئی یہاں تک کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے مگر اس وقت جب تم چند کاموں میں سے کوئی ایک انجام نہ دو اُن میں سے

ایک یہ ہے کہ تم آسمانی پتھر ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر پھینکو (اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا) (بنی اسرائیل ۹۲)
یہ نامعقول تقاضے یا تو استہزاء اور تمسخر کے طور پر ہوتے تھے۔

اور یا سچ مچ طلبِ اعجاز کے لیے اور دونوں صورتوں میں یہ ایک احمقانہ فعل تھا کیونکہ دوسری صورت میں ان کی نابودی کا سبب ہوتا لہٰذا معجزہ سے استفادہ کا محل ہی باقی نہ رہتا اور پہلی صورت میں بھی اُن واضح دلائل اور نشانیوں کے ہوتے ہوئے کہ جو تمام پیغمبر اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جن سے ہر دیکھنے والے کی نگاہ میں کم از کم ان کی صداقت کا احتمال تو پیدا ہو جاتا تھا تو ایسے احتمال کے ہوتے ہوئے کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنی نابودی کا تقاضا کرے یا اس سے مذاق کرے، لیکن تعصب اور ہٹ دھرمی ایک ایسی عظیم بلا ہے کہ جو ہر قسم کی فکر و منطق کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔

۲۔ " ان الحکم الا للہ " کا جملہ ایک واضح معنی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر قسم کے فرامین و احکام خواہ وہ عالم آفرینش و تکوین سے متعلق ہوں یا وہ عالم احکام دینی و تشریع سے تعلق رکھتے ہوں، سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اس بنا پر اگر کوئی پیغمبر ان کاموں میں سے کسی کام کو کرکے دکھاتا ہے تو وہ بھی اسی کے فرمان سے کرتا ہے۔

مثلاً اگر حضرت عیسیٰ مردہ کو زندہ کرتے ہیں تو وہ بھی اُسی کے اذن سے ہے اسی طرح ہر وہ منصب جو کسی کو سپرد ہوا ہے خواہ وہ رہبری الٰہی ہو یا قضاوت و حکمرانی، پروردگار کی طرف سے ہے۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اتنے واضح اور روشن جملے سے پوری تاریخ میں بارہا غلط استفادہ کیا گیا ہے۔ کبھی خوارج نے جنگ صفین میں "حکمین" کے تعین کے مسئلہ پر اعتراض کرتے ہوئے کہ جو خود اُن کے اور اُن جیسے لوگوں کے تقاضے پر صورت پذیر ہوا تھا اس جملے کا سہارا لیا اور حضرت علیؑ کے ارشاد کے مطابق وہ ایک کلمۂ حق کو ایک باطل معنی میں استعمال کرتے رہے اور رفتہ رفتہ جملۂ (لا حکم الا للہ) ان کا شعار ہو گیا۔

وہ اس قدر نادان و احمق تھے کہ خیال کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص خدا کے فرمان اور دستورِ اسلام کے مطابق بھی کسی موضوع میں حَکم مقرر ہو جائے تو وہ " ان الحکم الا للہ " کا مخالف ہے حالانکہ وہ قرآن کو زیادہ پڑھتے تھے لیکن اُسے بہت کم سمجھتے تھے کیونکہ قرآن تو اسلامی خاندانی جھگڑوں کے سلسلے میں بھی عورت اور مرد کی طرف سے حَکم کے انتخاب کی تصریح کرتا ہے:

فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا (نساء - ۳۵)

کچھ دوسرے لوگوں نے۔ جیسا کہ فخرالدین رازی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اس جملے کو مسلک جبر کی ایک دلیل قرار دیا ہے۔ کیونکہ جب ہم یہ قبول کرلیں کہ جہانِ آفرینش کے تمام فرمان خدا کے ہاتھ میں ہیں تو پھر تو کوئی اختیار کسی کے لیے باقی ہی نہیں رہتا۔

حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ بندوں کے ارادہ کی آزادی اور ان کا مختار ہونا بھی پروردگار کے فرمان سے ہے۔ یہ خدا ہی تو ہے کہ جو یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے کاموں میں مختار اور آزاد ہوں تاکہ ان کے مختار اور آزاد ہونے کی حالت میں ان کے کندھوں پر ذمہ داری کا بوجھ ڈالے اور ان کی تربیت ہو۔

۳ ۔ "یقص" لغت میں "قطع کرنے" اور "کسی چیز کے توڑنے" کے معنی میں آیا ہے[1] اور یہ جو زیر نظر آیت میں ہے "یقص الحق" (خدا حق کو توڑتا ہے) یعنی مکمل طور پر اُسے باطل سے جدا اور الگ کر دیتا ہے، تو اس بنا پر بعد والا جملہ "وھو خیر الفاصلین" (وہ بہترین طور پر جدا کرنے والا ہے) اس امر کی تاکید شمار ہوگا اور اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "یقص" "قصہ" سے نہیں ہے کہ جس کا معنی سرگذشت اور داستان بیان کرنا ہے، جیسا کہ بعض مفسرین نے خیال کیا ہے۔

۵۹۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○

۶۰۔ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰٮكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۶۱۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ○

۶۲۔ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰٮهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۟ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ○

ترجمہ

۵۹۔ غیب کی چابیاں صرف اسی کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اُسے نہیں جانتا اور خشکی اور دریا میں جو کچھ ہے وہ اُسے جانتا ہے کوئی پتہ (کسی درخت سے) نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اُس سے آگاہ ہے، اور نہ زمین کی پوشیدہ

---

[1] قاموس کہتا ہے: "قص الشعر والظفر قطع منھما بالمقص ای المقراض" بالوں اور ناخنوں کو مقراض یعنی قینچی سے کاٹنے کو عرب قص اور مقراض کو مقص (کسر میم و فتح قاف کے ساتھ) کہتے ہیں۔

تاریک جگہوں میں کوئی دانہ ہے اور نہ ہی کوئی خشک وتر چیز وجود رکھتی ہے مگر یہ کہ وہ واضح کتاب (کتاب علم خدا) میں ثبت ہے۔

۶۰۔ وہی وہ ذات ہے کہ جو تمہاری روح کو رات کے وقت (نیند میں) لے لیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کسب کیا (اور انجام دیا) ہے اس سے باخبر ہے پھر وہ دن میں (نیند سے) تمہیں اٹھاتا ہے (اور یہ کیفیت ہمیشہ جاری رہتی ہے) یہاں تک کہ معین گھڑی آپہنچے۔ اس کے بعد تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہوگی اور جو کچھ عمل تم کرتے ہو وہ اس کی تمہیں خبر دے گا۔

۶۱۔ وہ اپنے بندوں پر مکمل تسلط رکھتا ہے، اور تمہارے اوپر نگہبان بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آپہنچے تو ہمارے بھیجے ہوئے اس کی جان لے لیتے ہیں اور وہ (بندوں کے اعمال کے حساب کی نگہداری میں) کوتاہی نہیں کرتے۔

۶۲۔ اس کے بعد (تمام بندے) خدا کی طرف جو ان کا مولائے حقیقی ہے پلٹ جائیں گے۔ جان لو کہ حکم کرنا اسی کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ سب سے جلدی حساب کرنے والا ہے۔

تفسیر

اسرارِ غیب

گذشتہ آیات میں گفتگو خدا کے علم وقدرت اور اس کے حکم وفرماں کے دائرے کی وسعت کے بارے میں تھی اب ان آیات میں اس بیان کی جو گذشتہ آیات میں اجمالاً ذکر ہوا تھا وضاحت کی جا رہی ہے۔

سب سے پہلے علم خدا کے موضوع کو لیتے ہوئے کہتا ہے:

"غیب کے خزانے (یا غیب کی چابیاں) سب کی سب خدا کے پاس ہیں اور اس کے علاوہ کوئی انہیں نہیں جانتا (وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمها الا هو)۔

"مفاتح" جمع "مفتح" (بروزن بہتر) چابی کے معنی میں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جمع "مفتح" (بروزن دفتر) خزانہ اور کسی چیز کی حفاظت کے مرکز کے معنی میں ہو۔

پہلی صورت میں آیت کا معنی اس طرح ہو گا کہ تمام غیب کی چابیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں اور دوسری صورت میں معنی یہ ہو گا کہ غیب کے تمام خزانے اسی کے قبضے میں ہیں۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ دونوں ہی معانی ایک عبارت میں مراد ہوں اور جیسا کہ ہم علم اصول میں ثابت کر چکے ہیں کہ ایک لفظ کا استعمال چند معانی میں کوئی مانع نہیں رکھتا اور دونوں صورتوں میں یہ دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، کیونکہ جہاں کہیں خزانہ ہے وہاں چابی بھی موجود ہے۔

لیکن زیادہ تر یہی نظر میں آتا ہے کہ "مفاتح" چابیوں کے معنی میں ہے نہ کہ خزائن کے معنی میں، کیونکہ مقصد و ہدف یہاں علم خدا کو بیان کرنا ہے اور وہ چابی کے مسئلہ کے ساتھ ــ جو مختلف ذخائر سے آگاہی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے ــ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ دو اور مواقع پر جہاں قرآن میں لفظ "مفاتح" استعمال ہوا ہے، وہاں بھی چابی ہی مراد ہے[1]۔

اس کے بعد مزید توضیح و تاکید کے لیے کہتا ہے: جو کچھ بر و بحر میں ہے خدا اُسے جانتا ہے (ویعلم ما فی البر والبحر)۔

"بر" وسیع مکان کے معنی میں ہے اور عام طور پر خشک علاقوں کو "بر" کہا جاتا ہے اور "بحر" بھی اصل میں وسیع جگہ کے معنی میں ہے کہ جس میں زیادہ پانی جمع ہو اور عام طور پر یہ لفظ سمندروں پر اور کبھی بڑے بڑے دریاؤں پر بھی بولا جاتا ہے۔

بہرحال خدا کی اُن چیزوں سے آگاہی کہ جو خشکیوں اور سمندروں میں ہے اس کے علم کے تمام چیزوں پر احاطے کے معنی میں ہے اور اس جملے کے معنی کی وسعت کی طرف توجہ سے (جو کچھ خشکیوں میں اور سمندروں میں ہے خدا اُسے جانتا ہے) حقیقت میں اس کے وسیع علم کا ایک گوشہ واضح ہوتا ہے۔

یعنی وہ سمندروں کی گہرائیوں میں چھوٹے اور بڑے اربوں زندہ موجودات کی جنبش سے۔

اور تمام جنگلوں اور پہاڑوں میں درختوں کے پتوں کے ہلنے سے۔

اور ہر غنچے کے چٹخنے اور ہر پھول کے کھلنے کی قطعی تاریخ سے۔

اور بیابانوں میں نسیم کی موجوں کے چلنے اور دروں کی خمیدگی سے۔

اور ہر انسان کے بدن کی رگوں کی صحیح گنتی اور خون کے گلوبیولز (GLO BULES) سے۔

اور ایٹم کے اندر تمام الیکٹرانوں (ELECTRONS) کی مخفی حرکتوں سے۔

اور آخر یہ کہ تمام افکار و تخیلات جو ہمارے دماغوں کے پردوں کے اندر سے گزرتے ہیں اور ہماری روح کی گہرائیوں تک نفوذ کرتے ہیں .... ہاں ہاں وہ ان سب سے یکساں طور پر باخبر ہے۔

پھر بعد والے جملے میں خدا کے علمی احاطہ کی تاکید کے لیے اس بارے میں خصوصیت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کوئی پتہ درخت سے جدا نہیں ہوتا مگر یہ کہ وہ اُسے جانتا ہے (وما تسقط من ورقة الا یعلمها)۔

---

[1] ما ان مفاتحه لتنوء بالعصبة اولی القوة۔ (قصص - ۷۶) او ما ملکتم مفاتحه (نور - ۶۱)

یعنی اُن پتوں کی تعداد اور شاخوں سے اُن کے جدا ہونے کا وقت، ہوا کے درمیان ان کی گردش، اور ان کے زمین پر آگرنے کا لمحہ۔ یہ سب امور اس کے علم کے سامنے واضح اور روشن ہیں اسی طرح کوئی دانہ زمین کی کسی پوشیدہ جگہ میں نہیں ٹھہرتا مگر یہ کہ وہ اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہے (ولا حبة فی ظلمات الارض)۔

درحقیقت (اس آیت میں) دو حساس نقطوں پر انگشت رکھی گئی ہے، کہ جن کا احاطہ کرنا کسی بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے، خواہ ہزاروں سال اُس کی عمر کے گزر جائیں اور خواہ وہ کتنی بھی صنعتی مہارت اور حیرت انگیز ارتقائی منزلیں کیوں نہ طے کرلے۔

ایسا کونسا انسان ہے جو یہ جانتا ہو کہ ہوائیں ہر شب و روز میں تمام کرۂ زمین پر کتنی قسم کے گھاس پھوس کے بیج اُن کے پودوں سے جدا کرکے کہاں کہاں بکھیر رہی ہیں۔ ایسے ایسے بیج جو بعض اوقات ممکن ہے کہ سالہا سال تک زمین کی گہرائیوں میں اُس وقت تک چھپے ہوئے پڑے رہیں جبکہ اُن کی نشوونما کے لیے کافی مقدار میں پانی حاصل نہ ہو جائے۔

ایسا کونسا انسان ہے جو یہ جانتا ہو کہ ہر لمحے کیڑے مکوڑوں کے ذریعے یا انسانوں کے وسیلے سے، کتنے دانے اور کس کس قسم کے بیج، اور زمین کے کن کن نقاط میں، بکھیرے جارہے ہیں۔

کونسا برقی دماغ ہے وہ جو جنگلوں کے درختوں کی شاخوں سے ہر روز جھڑنے والے پتوں کی تعداد کا شمار کرسکے۔ کسی ایک جنگل کے منظر کی طرف نگاہ کرتے ہوئے، خاص طور پر موسم خزاں میں اور خصوصاً مسلسل بارش یا تیز ہوا کے بعد، اور اس عجیب و غریب منظر کو دیکھتے ہوئے کہ جو پتوں کے پے در پے گرنے سے پیدا ہوتا ہے، یہ حقیقت اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ بات ہرگز ہرگز ممکن نہیں ہے کہ اس قسم کے علوم تک انسان کی دسترس ہوسکے۔

حقیقتاً پتوں کا گرنا ان کی موت کا وقت ہے اور تاریک زمینوں میں دانوں کا گرنا، ان کی حیات و زندگی کی طرف پہلا قدم ہے اور صرف اُسی کی ذات ہے وہ کہ جو اس موت و زندگی کے نظام سے باخبر ہے۔ یہاں تک کہ ایک دانہ اپنی کامل زندگی اور چھوٹنے کی طرف جو مختلف قدم اٹھاتا ہے، وہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کے علم کی بارگاہ میں واضح و آشکار ہے۔

اس امر کے بیان کا ایک اثر فلسفی ہے اور ایک اثر تربیتی۔ اس کا فلسفی اثر تو یہ ہے کہ یہ ان لوگوں کے خیال کی کہ جو خدا کے علم کو کلیات میں منحصر سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا اس جہان کے جزئیات سے آگاہ نہیں ہے، نفی کرتا ہے اور صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ خدا تمام کلیات و جزئیات سے مکمل آگاہی رکھتا ہے۔[1]

باقی رہا اس کا تربیتی اثر تو واضح ہے، کیونکہ اس وسیع و بے پایاں علم پر ایمان رکھنا انسان سے یہ کہتا ہے کہ تیرے وجود کے تمام اسرار، اعمال، گفتار، نیات اور افکار سب کے سب اس کی ذات پاک کے لیے واضح و آشکار ہیں۔ اس قسم کے ایمان کے ساتھ کس طرح ممکن ہے کہ انسان اپنے حالات پر نگاہ نہ رکھے اور اپنے اعمال، گفتار اور نیات پر کنٹرول نہ کرے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے کتاب "خدا را چگونہ بشناسیم" کی طرف رجوع کریں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کوئی خشک وتر نہیں ہے مگر یہ کہ وہ کتاب مبین میں ثبت ہے (ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین)۔

یہ جملہ ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ، تمام موجودات کے لیے خدا کے غیر متناہی علم کی وسعت کو بیان کرتا ہے اور کوئی چیز اُس سے مستثنیٰ نہیں ہوگی کیونکہ "تر" اور "خشک" سے مراد ان کا لغوی معنی نہیں ہے، بلکہ یہ تعبیر معمولاً عمومیت کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

کتاب مبین کے بارے میں مفسرین نے مختلف احتمال پیش کیے ہیں لیکن ان میں جو بات زیادہ صحیح دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب مبین سے مراد وہی مقام علم پروردگار ہے یعنی تمام موجودات اس کے بے پایاں علم میں ثبت ہیں اور اس کی لوح محفوظ سے تعبیر کرنا بھی اسی معنی کے مطابق قرار دینے کے قابل ہے کیونکہ یہ بات بعید نہیں ہے کہ لوح محفوظ سے مراد بھی وہی صفحہ علم خدا ہو۔

کتاب مبین کے معنی میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد عالم خلقت اور سلسلہ علت ومعلول ہو کہ تمام چیزیں اس میں لکھ دی گئی ہیں۔

بہت سی روایات میں جو اہل بیت علیہم السلام کے طرق سے پہنچی ہیں ان میں "ورقۃ" سقط شدہ جنین کے معنی میں، "حبہ" فرزند کے معنی میں، "ظلمات الارض" ماؤں کے رحم کے معنی میں اور "رطب" اُن نطفوں کے معنی میں جو زندہ رہتے ہیں اور "یابس" ان کے معنی میں جو ختم ہو جاتے ہیں تفسیر ہوئی ہے[1]

اس میں شک نہیں کہ یہ تفسیر ان الفاظ کے لغوی معنی پر جمود کی صورت میں تو تطبیق نہیں کرتی، کیونکہ "ورقہ" کا معنی ہے پتہ "حبہ" کا معنی ہے دانہ اور "ظلمات الارض" کا معنی ہے زمین کی تاریکیاں اور "رطب" کا معنی ہے تر اور "یابس" کا معنی ہے خشک۔ لیکن آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے حقیقت میں اس تفسیر سے مسلمانوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہا ہے کہ انہیں آیات قرآن میں ایک وسیع اور کشادہ نگاہ کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور ان کے معانی سمجھنے میں صرف لفظ پر جمود نہ کریں بلکہ جہاں قرآنی معنی کی وسعت پر دلالت کرتے ہوں تو وسعت معنی کی طرف نگاہ رکھیں۔

اُوپر والی روایت میں حقیقت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اُوپر والی آیت کا مفہوم صرف گھاس پھوس کے دانوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ انسانی نطفوں کے بیج تک اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

بعد والی آیت میں اعمال انسانی پر علم خدا کے احاطہ کی بحث کی گئی ہے کہ جو اس کا ہدف اصلی ہے اور خدا کی قدرت قاہرہ کو بھی مشخص کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس مجموعی بحث سے ضروری تربیتی نتائج حاصل کر سکیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسی ذات ہے کہ جو تمہاری روح کو رات کے وقت قبض کر لیتی ہے اور جو کچھ تم دن میں انجام دیتے ہو اور کمائی کرتے ہیں اُس سے آگاہ ہے (وھو الذی یتوفکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنھار)۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۲۸۔

"توفی" لغت میں واپس لے لینے کے معنی میں ہے اور یہ جو نیند کو ایک طرح سے روح کو واپس لے لینا کہا گیا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ نیند۔ جیسا کہ معروف ہے۔ موت کی بہن ہے، موت انسانی دماغ کے کارخانہ کا مکمل طور سے معطل ہو جانا ہے اور روح و جسم کے تعلق کا مطلقاً منقطع ہو جانا ہے، جبکہ نیند صرف دماغی کارخانہ کے ایک حصہ کا تعطل ہے اور اس تعلق کا ضعیف ہو جانا ہے اس بنا پر نیند موت کا ایک چھوٹا مرحلہ شمار ہوتی ہے [1]

"جرحتم" "جرح" کے مادہ سے ہے، یہاں اکتساب اور کسی چیز کو حاصل کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی تم رات دن خدا کے علم و قدرت کے سائے میں رہتے ہو۔ وہ ذات کہ جو مٹی کے اندر نباتات کے دانوں کی پرورش اور ہر زمان و مکان میں پتوں کے گرنے اور ان کی موت سے آگاہ ہے، وہ تمہارے اعمال سے بھی آگاہ ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ نیند اور بیداری کا نظام بار بار دہرایا جا رہا ہے رات کو تم سو جاتے ہو اور دن تمہیں بیدار کر دیتا ہے، اور یہ حالت اسی طرح سے جاری رہتی ہے یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحات آجاتے ہیں (ثم یبعثکم فیہ لیقضی اجل مسمّی)[2]۔

بالآخر بحث کے آخری نتیجہ کو یوں بیان کیا گیا ہے: پھر سب کی بازگشت خدا کی طرف ہے، اور وہ تمہیں اس سے جو تم انجام دے چکے ہو آگاہ کرے گا (ثم الیہ مرجعکم ثم ینبئکم بما کنتم تعملون)۔

بعد والی آیت میں دوبارہ بندوں کے اعمال کی نسبت خدا کے علمی احاطے کی مزید وضاحت اور قیامت کے دن ان کے حساب کی انتہائی دقیق نگہداشت کے بارے میں قرآن کہتا ہے: وہ اپنے بندوں پر مکمل تسلط رکھتا ہے اور وہی ہے جو تمہارے لیے محافظ و نگہبان بھیجتا ہے تاکہ وہ تمہارے اعمال کا حساب انتہائی احتیاط کے ساتھ محفوظ کریں (وھو القاھر فوق عبادہ و یرسل علیکم حفظۃ)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ "قاہریت" کسی چیز پر ایسے غلبہ اور تسلط کامل کے معنی میں ہے کہ جس میں مد مقابل میں ٹھہرنے کی کوئی طاقت و سکت ہی نہ ہو اور بعض کے نظریہ کے مطابق یہ لفظ عام طور پر ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے کہ جس میں مد مقابل عقل رکھتا ہو جبکہ لفظ "غلبہ" ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی خصوصیت نہیں رکھتا، بلکہ اس کا معنی کامل طور سے وسیع ہے۔

"حفظۃ"، "حافظ" کی جمع ہے اور یہاں اُن فرشتوں کے معنی میں ہے کہ جو انسانوں کے اعمال کی حفاظت پر مامور ہیں جیسا کہ سورہ انفطار کی آیہ ۱۰ تا ۱۲ میں ہے:

اِنَّ عَلَیْکُمْ لَحَافِظِیْنَ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ۔

---

[1] تفسیر نمونہ کی جلد ۲ صفحہ ۱۴۱ ۳ پر بھی اس سلسلہ میں گفتگو کر چکے ہیں۔

[2] "فیہ" کی ضمیر "نہار" کی طرف لوٹتی ہے اور "بعث" بھی یہاں نیند سے اُٹھنے اور بیدار ہونے کے معنی میں ہے اور "اجل مسمی" سے مراد وہ عمر ہے جو کسی شخص کے لیے مقرر ہے۔

تمہارے اُوپر نگہبانی کرنے والے محافظ (فرشتے) متعین کر دیئے گئے ہیں وہ محترم و مکرم لکھنے والے ہیں جو تمہارے ہر کام سے آگاہ ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ وہ اعمال انسانی کے محافظ نہیں ہیں بلکہ ان کی ڈیوٹی خود انسان کی اجل معین تک حوادث بلایا سے حفاظت کرنا ہے اور وہ "حتی اذا جاء احدکم الموت" کو کہ جو "حفظة" کے بعد ذکر ہوا ہے اس کا قرینہ سمجھتے ہیں اور سورۂ رعد کی آیہ ۱۱ کو بھی ممکن ہے اس بات پر شاہد قرار دیں[1]

لیکن پوری زیرِ بحث آیت پر غور و فکر کرنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ "حفظة" سے مراد یہاں وہی حفظِ اعمال ہے۔ باقی رہے وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت پر مامور ہیں اُن کے بارے میں انشاء اللہ ہم سورۂ رعد کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس حساب کی نگہداری زندگی کے ختم ہونے کے آخری لمحے اور موت کے آجانے تک جاری ہے (حتی اذا جاء احدکم الموت)۔

اس وقت ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) جو قبض ارواح پر مامور ہیں اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں (توفته رسلنا)[2]۔ آخر میں مزید کہتا ہے کہ یہ فرشتے کسی طرح بھی اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی، قصور اور تفریط نہیں کرتے، نہ روح کے لینے کے لمحہ کو مقدم کرتے ہیں اور نہ موخر (و ھم لا یفرطون) یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ صفت انسانوں کے اعمال کے حساب کی حفاظت کرنے والے فرشتوں سے مربوط ہو کہ وہ اعمال کے حساب کی نگرانی و حفاظت میں کم سے کم کوتاہی اور قصور نہیں کرتے اور زیرِ بحث آیت میں گفتگو کا مدار بھی اسی حصہ پر ہے۔

بعد والی آیت میں انسان کے آخری مرحلہ کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: افرادِ بشر اپنے دورانِ زندگی کو ختم کرنے کے بعد اپنے ان اعمال ناموں کے ساتھ کہ جن میں پوری تنظیم کے ساتھ سب کچھ ثبت و ضبط ہوگا قیامت کے دن اپنے اس پروردگار کی طرف جو اُن کا حقیقی مولا ہے پلٹ جائیں گے (ثم ردوا الی اللہ مولا ھم الحق)۔

اور اس عدالت میں انصاف کرنا، حکم دینا اور فیصلہ کرنا خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے (الا لہ الحکم)۔

اور افرادِ بشر اپنی پُرشور طولانی تاریخ میں جو جو عمل کرتے رہے اور ان کے جو اعمال نامے تھے ان کا بڑی تیزی کے ساتھ حساب کرے گا (وھو اسرع الحاسبین)۔

یہاں تک کہ بعض روایات میں ہے کہ:

انہ سبحانہ یحاسب جمیع عبادہ علی مقدار حلب شاۃ

خداوند تعالیٰ اپنے تمام بندوں کا حساب اتنے تھوڑے سے وقت میں لے لے گا جتنے وقت میں

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۷، صفحہ ۱۳۴۔

[2] قبض ارواح اور آدمی کی جان کے لینے کے بارے میں تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد ص ۸۳ کی طرف رجوع کریں۔

ایک بکری کا دودھ دوہا جاتا ہے[1]

جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۲۰۲ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں بندوں کا حساب اتنی تیزی کے ساتھ لیا جائے گا کہ لمحہ بھر میں اُن سب کا تمام حساب کر لیا جائے گا اور ایک بکری کے دودھ دوہنے کے وقت کا بیان اور اُوپر والی روایت کم سے کم وقت کی نشاندہی کے لیے ہے اور اسی لیے ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اللہ تعالیٰ یحاسب الخلائق کلھم فی مقدار لمح البصر[2]

خداوند تعالیٰ تمام بندوں کا حساب ایک لحظہ میں کرلے گا۔

اور اس کی دلیل وہی ہے جو اُوپر والی آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے اور وہ یہ کہ انسان کے اعمال خود اُس کے وجود میں اور اس کے اطراف کے موجودات میں اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ یعنی وہ بالکل ان مشینوں کی طرح ہیں کہ جو اپنی حرکت کی مقدار اور اپنی کارکردگی کو نمبروں والے آلات میں ظاہر کر دیتے ہیں زیادہ واضح الفاظ میں دیوں کہا جاسکتا ہے، اگر ایسے دقیق آلات موجود ہوں تو انسان کی آنکھ میں ایسی خیانت آمیز نظروں کی تعداد کو جو اُس نے کی ہیں، پڑھا جاسکتا ہے اور انسان کی زبان پر آئے ہوئے جھوٹ، تہمتوں، زبان کے زخموں اور غلط باتوں کی تعداد کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کی روح کے علاوہ اس کے بدن کا ہر عضو خود اپنے اندر اعداد و شمار بتلانے والے اور حساب کتاب ظاہر کرنے والے آلات رکھتا ہے کہ ایک ہی لمحہ میں اس کا سارا حساب و کتاب معلوم ہو جائے گا۔

اب اگر ہم کچھ روایات میں یہ پڑھتے ہیں کہ زیادہ فرائض رکھنے والے اور بہت زیادہ مال و دولت کے مالک افراد کا حساب اس دن بہت طولانی ہوگا تو وہ حقیقت میں اس بناء پر نہیں ہے کہ اُن کے اصل حساب تک رسائی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اس بنا پر ہے کہ ان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ ان سوالات کا جو اُن کے اعمال کی نسبت ہوں گے جواب دیں۔ یعنی جوابدہی کے بوجھ کی سنگینی اور جواب دینے کا لازمی و ضروری ہونا اور اتمام حجت ان کی پیشی کے وقت کو طولانی کر دے گا۔

یہ آیات بندگان خدا کے لیے مکمل تربیتی درس ہے، خدا کا اس جہان کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات سے آگاہ ہونا تمام چیزوں پر اس کا احاطہ علمی، بندوں کی نسبت اس کی قدرت و قہاریت اس کا تمام اعمال بشر سے مطلع ہونا، باریک بین لکھنے والوں کے ذریعہ حساب اعمال کی نگہداری و حفاظت، وقت مقرر پر اس کی جان کا لینا، قیامت کے دن اس کا اُٹھایا جانا اور پھر اس انسان کے تمام کاموں کی دقت نظر اور سرعت کے ساتھ جانچ پڑتال۔

کون ہے کہ جو ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتا ہو اور پھر اپنے اعمال پر نظر نہ رکھے؟ بے حساب ظلم و ستم کرے، بلاوجہ جھوٹ بولے اور دوسروں پر زیادتی کرے، کیا یہ اعمال مذکورہ اصول پر ایمان، اعتقاد اور توجہ کے ساتھ کبھی جمع ہو سکتے ہیں؟

---

[1] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۳۱۳۔

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ا و جلد ۲ صفحہ ۲۹۸۔

۶۳- قُلۡ مَنۡ یُّنَجِّیۡکُمۡ مِّنۡ ظُلُمٰتِ الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ تَدۡعُوۡنَہٗ تَضَرُّعًا وَّخُفۡیَۃً ۚ لَئِنۡ اَنۡجٰنَا مِنۡ ہٰذِہٖ لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیۡنَ ○

۶۴- قُلِ اللّٰہُ یُنَجِّیۡکُمۡ مِّنۡہَا وَمِنۡ کُلِّ کَرۡبٍ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تُشۡرِکُوۡنَ ○

ترجمہ

۶۳- کہہ دو کہ کون ہے وہ کہ جو تمہیں خشکی اور سمندروں کی تاریکیوں سے رہائی بخشتا ہے جب کہ تم اُسے آشکار اور پوشیدہ طور پر (دل ہی دل میں) پکارتے ہو (اور کہتے ہو کہ) اگر تو نے ہمیں ان (خطرات اور تاریکیوں) سے رہائی بخش دی، تو ہم شکرگزاروں میں سے ہو جائیں گے۔

۶۴- کہہ دو کہ خدا تمہیں ان چیزوں سے اور ہر مشکل و پریشانی سے نجات بخشتا ہے پھر بھی تم اس کے لیے شریک قرار دیتے ہو (اور کفر کی راہ پر چلتے ہو)۔

تفسیر

وہ نور جو تاریکی میں چمکتا ہے

دوبارہ قرآن مشرکین کا ہاتھ پکڑ کر ان کی فطرت کے اندر لے جاتا ہے، اور اس اسرار آمیز نہاں خانہ میں انہیں توحید کے نور اور یکتا پرستی کی نشاندہی کراتا ہے اور پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ وہ انہیں اس طرح کہیں: کون ہے وہ کہ جو تمہیں برو بحر کی تاریکیوں سے نجات دیتا ہے (قل من ینجیکم من ظلمات البر والبحر)۔

اس بات کی یاد دہانی کرا دینا بھی ضروری ہے کہ ظلمت و تاریکی کبھی تو جنبۂ حسی رکھتی ہے اور کبھی جنبۂ معنوی۔ ظلمت حسی یہ ہے کہ نور کلی طور پر منقطع ہو جائے یا اس قدر کمزور ہو جائے کہ انسان کسی جگہ کو نہ دیکھ سکے یا مشکل سے دیکھ سکے اور ظلمت معنوی مشکلات، مصیبتیں اور پریشانیاں ہیں کہ جن کا انجام تاریک و نامعلوم ہے۔ جہالت تاریکی ہے، اجتماعی و اقتصادی ہرج مرج اور فکری بے سروسامانیاں، انحرافات اور اخلاقی آلودگیاں کہ جن کے برے انجام پیش بینی کے قابل نہیں ہیں یا وہ چیز کہ جو بدبختی اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ہو، یہ سب کی سب ظلمت ہیں۔

ظلمت و تاریکی اپنی ذات سے ہولناک اور توہم انگیز ہے کیونکہ بہت سے خطرناک جانوروں، چوروں اور مجرموں کا حملہ رات کی تاریکی میں ہی ہوتا ہے اور ہر شخص کو اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی خطرہ درپیش رہتا ہے، لہٰذا تاریکی میں پھنس جانے کی

صورت میں اوہام و خیالات انسان کی جان لے لیتے ہیں۔ خیالات کے مختلف زاویوں سے مختلف صورتیں اور وحشت ناک شکلیں نکل نکل کر بھاگنے لگتی ہیں اور عام افراد کو خوف و ہراس میں پھنسا دیتی ہیں۔

ظلمت و تاریکی عدم کا ایک شعبہ ہے اور انسان ذاتی طور پر عدم سے بھاگتا ہے اور وحشت رکھتا ہے۔ اسی سبب سے وہ عام طور سے تاریکی سے ڈرتا ہے۔

اگر یہ تاریکی واقعی وحشت ناک حوادث سے مل جائے، مثلاً انسان ایک ایسے سمندری سفر میں پھنس جائے جس میں اندھیری رات ہو، موجوں کا خوف ہو اور طوفان آیا ہوا ہو، تو اس کی وحشت و پریشانی اُن مشکلات سے کئی درجے زیادہ ہوگی جو دن کے وقت ظاہر ہوں۔ کیونکہ عام طور سے ایسے حالات میں انسان کے لیے چھٹکارے کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح اگر اندھیری رات میں کسی جنگل بیابان میں انسان راستہ بھول جائے اور درندوں کی وحشت ناک آوازیں، جو رات کے وقت اپنے شکار کی تلاش میں ہوتے ہیں، دور اور نزدیک سے سنائی دے رہی ہوں، یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ جس میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے اور خود اپنے اور اُس تابناک نور کے سوا جو اُس کی روح کی گہرائی میں چمکتا ہے اور اُسے ایک مبداء کی طرف بلاتا ہے کہ صرف وہی ہے کہ جو اس قسم کی مشکلات کو حل کرسکتا ہے، باقی اُسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ اس قسم کے حالات جہانِ توحید و خدا شناسی کا دریچہ ہیں۔ اس لیے بعد کے جملے میں ارشاد ہوتا ہے: اس قسم کی حالت میں تم اس کے لامتناہی لطف و کرم سے مدد طلب کرتے ہو۔ بعض اوقات آشکار اور تضرع و خشوع کے ساتھ اور کبھی پوشیدہ طریقے سے دل ہی دل کے اندر اُسے پکارتے ہو (تدعونہ تضرعًا و خفیۃ)۔

اور ایسی حالت میں تم فوراً اس عظیم مبداء کے ساتھ عہد و پیمان باندھتے ہو کہ اگر ہمیں اس خطرے سے نجات دے دے تو ہم یقیناً اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں گے اور اُس کے سوا کسی اور سے دل نہیں لگائیں گے (لئن انجٰنا من ھٰذہ لنکونن من الشاکرین)۔

لیکن اے پیغمبر! تم اُن سے کہہ دو کہ خدا تمہیں ان تاریکیوں سے اور ہر قسم کے دوسرے غم و اندوہ سے نجات دیتا ہے (اور بارہا تمہیں نجات دی ہے) لیکن تم رہائی پانے کے بعد اسی شرک و کفر کے راستے پر چل پڑتے ہو (قل اللہ ینجیکم منہا و من کل کرب ثم انتم تشرکون)۔

چند اہم نکات

۱۔ "تضرع" کا ذکر جو دعائے آشکار کے معنی میں ہے اور "خفیۃ" کا تذکرہ جو کہ پنہانی دعا ہے شاید اس سبب سے ہو کہ مشکلات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بعض اوقات شدت کے مرحلہ تک نہ پہنچنے کی وجہ سے انسان کو پنہانی دعا کی دعوت دیتی ہیں اور بعض اوقات وہ شدید مرحلہ تک پہنچ جاتی ہیں تو علی الاعلان دستِ دعا بلند کرتا ہے اور بعض اوقات نالہ و فریاد کی نوبت آجاتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خدا تمہاری شدید مشکلات کو بھی حل کرتا ہے اور ضعیف مشکلات کو بھی۔

۲۔ بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ آیت میں انسان کی چار نفسیاتی حالتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جن میں سے ہر ایک مشکلات کے ظہور کے وقت ایک قسم کا عکس العمل ہے حالتِ دعا و نیاز، حالتِ تضرع و خضوع، حالت اخلاص اور مشکلات سے نجات

حاصل ہوتے وقت شکر گزاری کے التزام کی حالت ۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان افراد میں سے بہت سوں کے لیے یہ قیمتی حالات بجلی کی طرح جلدی سے گزر جانے والے اور شدائد و مشکلات کے مقابلے میں تقریباً اضطراری شکل میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن چونکہ اُن میں علم و آگاہی نہیں ہوتی لہٰذا شدائد و مشکلات کے برطرف ہوتے ہی خاموشی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

اس بناء پر یہ حالات اگرچہ زود گزر رہی ہوں پھر بھی دور افتادہ افراد کے لیے خدا شناسی کے سلسلے میں دلیل بن سکتے ہیں۔

۲۔ "کرب" (بروزن "حرب") دراصل زمین کو نیچے اُوپر کرنے اور کھودنے کے معنی میں ہے۔ نیز وہ محکم گرہ جو کنوئیں کے ڈول کی طناب میں لگائی جاتی ہے، کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس کے بعد وہ غم و اندوہ جو انسان کے دل کو زیر و زبر کرتے ہیں اور جو گرہ کی طرح انسان کے دل پر بیٹھ جاتے ہیں کے لیے بھی بولا جانے لگا۔

اس بنا پر اوپر والی آیت میں لفظ "کرب" جو ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور ہر قسم کی بڑی سے بڑی مشکلات پر محیط ہے یہ "بر و بحر کی تاریکیوں" کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو شدائد کے ایک خاص حصہ کو کہا جاتا ہے، ایک خاص مفہوم بیان کرنے کے بعد ایک عام مفہوم کے طور پر آیا ہے (غور کیجئے گا)۔

یہاں پر وہ حدیث بیان کرنا کہ جو اس آیت کے ذیل میں بعض اسلامی تفاسیر میں نقل ہوئی ہے نامناسب نہ ہوگا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

خیر الدعاء الخفی وخیر الرزق ما یکفی

بہترین دعا وہ ہے کہ جو پنہانی (اور انتہائی خلوص کے ساتھ) صورت پذیر ہو اور بہترین روزی وہ ہے کہ جو بقدر کفایت ہو (نہ کہ ایسی ثروت اندوزی کہ جو دوسروں کی محرومیت کا سبب بنے اور انسان کے کندھے پر ایک سنگین بوجھ ہو)۔

اور اسی حدیث کے ذیل میں ہے:

مر بقوم رفعوا اصواتھم بالدعا فقال انکم لا تدعون الاصم ولا غائبا وانما تدعون سمیعا قریبا۔[1]

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک گروہ کے قریب سے گزرے وہ لوگ بلند آواز سے دعا کر رہے تھے تو آپ نے فرمایا:

تم کسی بہرے کو تو نہیں پکار رہے اور نہ ہی کسی ایسے شخص کو پکار رہے ہو کہ جو تم سے پوشیدہ اور دور ہو بلکہ تم ایک ایسی ہستی کو پکار رہے ہو کہ جو سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دعا آہستہ آہستہ اور توجہ اور اخلاص کے ساتھ کی جائے تو بہتر ہے۔

۶۵۔ قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ

---

[1] تفسیر مجمع البیان و نور الثقلین مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔

اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○

ترجمہ

۶۵۔ تم کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اُوپر کی طرف سے تم پر نازل کر دے یا تمہارے پاؤں کے نیچے کی طرف سے بھیج دے۔ یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ بھڑا دے اور جنگ (و ناراحتی) کا ذائقہ تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ذریعے چکھا دے۔ دیکھو ہم طرح طرح کی آیات کو کس طرح اُن کے لیے واضح کرتے ہیں شاید وہ سمجھ لیں (اور پلٹ آئیں)۔

تفسیر

رنگ رنگ کے عذاب

گذشتہ آیات میں توحید فطری کے بیان کے ضمن میں درحقیقت بندوں کے ساتھ ایک قسم کی تشویق اور اظہارِ محبت ہوا تھا کہ خداوند تعالیٰ شدائد و مشکلات کے وقت انہیں کس طرح اپنی پناہ میں لے لیتا ہے اور ان کی خواہشات کو پورا کرتا ہے۔

اس آیت میں تربیت کے مختلف طرق کی تکمیل کے لیے خدائی عذاب اور سزا سے ڈرانے کے مسئلہ کا سہارا لیا گیا ہے یعنی جس طرح کہ خدا ارحم الراحمین اور بے سہارا لوگوں کو پناہ دینے والا ہے، اسی طرح طغیانگروں اور سرکشوں کے مقابلے میں قہار و منتقم بھی ہے۔ اس آیت میں پیغمبر کو حکم دیا جا رہا ہے کہ مجرموں کو تین قسم کی سزاؤں کی دھمکی دو، اُوپر کی طرف کے عذابوں کی، نیچے کے طرف کے عذابوں کی اور باہمی اختلاف کے ذریعے جنگ کی آگ کے بھڑک اُٹھنے اور خونریزی کی سزائیں، لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ: تم کہہ دو کہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اُوپر کی طرف سے تم پر نازل کرے یا تمہارے پاؤں کی طرف سے بھیج دے (قل هو القادر علی ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم)۔

یا تمہیں مختلف گروہوں کی صورت میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بھڑا دے اور جنگ و خونریزی کا ذائقہ تم میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ذریعہ چکھا دے (او یلبسکم شیعًا و یذیق بعضکم بأس بعض)۔

اور آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: دیکھو! ہم طرح طرح کی نشانیوں اور دلائل کو کس طرح اُن کے لیے بیان

کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں اور حق کی طرف لوٹ آئیں (انظر کیف نصرف الاٰیات لعلھم یفقھون)۔

چند اہم نکات

۱۔ اس بارے میں کہ "اُوپر" کی طرف سے "عذاب" اور "نیچے" کی طرف سے عذاب سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ (فوق وتحت) بہت ہی وسیع معنی رکھتے ہیں۔ ان میں حسی طور پر اُوپر اور نیچے کا مفہوم بھی شامل ہے یعنی ایسی سزائیں جو اُوپر کی طرف سے آتی ہیں مثلاً بجلیاں، خطرناک بارشیں اور طوفان اور ایسی سزائیں جو نیچے کی طرف سے آتی ہیں مثلاً زلزلے اور زمین کو ویران و برباد کرنے والے شگاف اور دریاؤں اور سمندروں کے طوفان، سب اس میں داخل ہیں۔

وہ دردناک عذاب بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے کہ جو حکام کے طبقہ اور معاشرے کے اُوپر والے حصّے کی طرف سے بعض قوموں کے سروں پر آتے ہیں اور وہ پریشانیاں اور سختیاں جو مزدوروں اور نافہم اور فرض ناشناس افراد کی طرف سے لوگوں کو دامنگیر ہو جاتی ہیں جو بعض اوقات پہلے گروہ کے عذاب سے کمتر نہیں ہوتیں، بھی اس کے معنی میں داخل ہیں۔

اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارے زمانے کے خوفناک جنگی ہتھیار کہ جو فضا اور زمین سے وحشت ناک صورت میں انسانی زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں اور تھوڑی سی دیر میں آباد ترین شہروں کو ہوائی بمباری اور زمینی حملوں سے میزائیلوں اور آبدوزوں سے خاکستری ٹیلوں میں بدل دیتے ہیں وہ بھی آیت کے وسیع مفہوم میں داخل ہیں۔

۲۔ "یلبسکم" "لبس" (بروزن حبس) مڈھ بھیڑ کرانے اور ایک دوسرے سے ٹکروانے کے معنی میں ہے ذکر مادہ "لبس" (بروزن قرمز) لباس پہننے کے معنی میں۔ اس بناء پر جملہ کا معنی یوں ہوگا کہ وہ تمہیں مختلف گروہوں اور دستوں کی شکل میں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی سکتا ہے[1]

اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اختلافِ کلمہ (تفرقہ بازی یا پھوٹ) اور جمعیت کی پراگندگی کا مسئلہ اس قدر خطرناک ہے کہ وہ آسمانی عذاب اور بجلیوں اور زلزلوں کا ہم پلہ اور ہم پایہ قرار پایا ہے، حقیقتاً ہے بھی ایسا ہی بلکہ بعض اوقات اختلاف و پراگندگی سے پیدا ہونے والی ویرانیاں اُن ویرانیوں سے کئی درجے زیادہ ہوتی ہیں جو بجلیوں اور زلزلوں سے آتی ہیں۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ آباد ملک نفاق اور تفرقہ بازی کے منحوس سائے میں مطلق تباہی کی نذر ہو جاتے ہیں اور یہ جملہ تمام مسلمانانِ عالم کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے ہوشیار باش ہے۔

یہ احتمال بھی اس جملہ کی تفسیر میں موجود ہے کہ خدا نے آسمانی اور زمینی عذاب کے مقابل میں دو دوسرے عذاب بیان کیے ہیں، ایک عقیدہ اور فکر و نظر کے اختلاف کا عذاب (جو حقیقت میں اُوپر کے عذابوں کی مانند ہے) اور دوسرے عمل اور اجتماعی طور طریقوں میں اختلاف کا عذاب جس کا نتیجہ جنگ اور خونریزی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ جو نیچے کی

---

[1] شیعًا جمع ہے شیعہ کی جس کا معنی گروہ ہے۔

طرف کے عذاب کے مشابہ ہے۔ اس بناپر آیت میں چار قسم کے طبیعی عذابوں اور دو قسم کے اجتماعی عذابوں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ اس بات کا اشتباہ نہ ہونے پائے کہ زیر بحث آیت کہتی ہے کہ خدا تمہارے درمیان تفرقہ ڈال دے گا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا بلا وجہ لوگوں کو نفاق و اختلاف میں گرفتار کر دے گا بلکہ یہ لوگوں کے بُرے اعمال، خودخواہیوں، خود پرستیوں اور شخصی نفع خوریوں کا نتیجہ ہے کہ جس کا اثر نفاق اور تفرقہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت اس سبب سے ہے کہ اس نے اس قسم کا اثر ان بُرے اعمال میں قرار دے دیا ہے۔

۴۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ان آیات میں روئے سخن مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ہے، ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک مشرک معاشرہ جو توحید اور یکتا پرستی کے راستہ سے منحرف ہو چکا ہے، وہ طبقات بالا کے ظلم و ستم میں بھی گرفتار ہوتا ہے اور نچلے طبقہ کی فرض ناشناسی کی مصیبت میں بھی گرفتار ہوتا ہے، اختلاف عقیدہ کی خرابیوں سے بھی دو چار ہوتا ہے اور اجتماعی خونیں کشمکشوں میں بھی گرفتار رہتا ہے۔ جیسا کہ آج کی مادی دنیا کے معاشرے، جو صرف منفعت و ثروت کے بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں ان تمام عظیم بلاؤں میں مبتلا ہیں اور ان کے درمیان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ہمیں ایسے مذاہب کا بھی علم ہے کہ جو توحید و خدا پرستی کا دم بھرتے ہیں لیکن عملی طور پر مشرک اور بت پرست ہیں۔ ایسے مذاہب و اقوام بھی انہی مشرکین کے سے انجام میں گرفتار ہوں گے اور یہ جو ہم بعض احادیث میں پڑھتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

كل هذا فى اهل القبلة

یہ سب سزائیں مسلمانوں میں بھی واقع ہوں گی۔

ممکن ہے کہ یہ اسی بات کی طرف اشارہ ہو کہ جب مسلمان توحید کے راستے سے منحرف ہو جائیں، خودخواہی اور خود پرستی اخوت اسلامی کی جگہ لے لے، شخصی مفاد عمومی مفاد پر مقدم سمجھا جانے لگے اور ہر شخص اپنی ہی فکر میں لگ جائے اور خدائی احکام بھلا دیے جائیں، تو وہ بھی ایسے انجام میں گرفتار ہو جائیں گے۔

۶۶۔ وَكَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ؕ ○

۶۷۔ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ؗ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۶۶۔ تیری قوم نے اس کی تکذیب اور انکار کیا حالانکہ وہ حق ہے (ان سے) کہہ دو کہ میں تمہارے بارے میں (قبول کرنے اور ایمان لانے کا) جوابدہ نہیں ہوں (میرا فریضہ صرف ابلاغ رسالت ہے نہ کہ تمہیں ایمان پر مجبور کرنا)۔

۶۷۔ ہر خبر (جو خدا نے تمہیں دی ہے آخر کار اس) کی ایک قرار گاہ ہے (اور وہ اپنی وعدہ گاہ میں انجام پائے گی) اور تم جلدی ہی جان لو گے۔

تفسیر

یہ دونوں آیات حقیقت میں اس بحث کی تکمیل ہیں جو خدا، معاد اور حقائق اسلام کی طرف دعوت دینے اور خدائی سزاؤں سے ڈرانے کے سلسلے میں گذشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ: تیری قوم وجمعیت یعنی قریش اور مکہ کے لوگوں نے تیری تعلیمات کی تکذیب کی حالانکہ وہ سب حق ہیں اور مختلف عقلی، فطری اور حسی دلائل اُن کی تائید کرتے ہیں (وکذب بہ قومک و ھو الحق)[۱]۔

اس بنا پر ان کی تکذیب اور انکار سے اِن حقائق کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آتی خواہ مخالفت کرنے والے اور منکرین کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ: ان سے کہہ دو کہ میری ذمہ داری تو صرف ابلاغِ رسالت ہے اور میں تمہارے قبول کرنے کا ضامن نہیں ہوں (قل لست علیکم بوکیل)۔

اُن متعدد آیات سے کہ جن میں یہی تعبیر اور اسی کے مانند تعبیر آئی ہے (مثلاً انعام ـ ۱۰۷، یونس ـ ۱۰۸، زمر ـ ۴۱ اور شوریٰ ـ ۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر "وکیل" سے مراد ایسا شخص ہے کہ جو ہدایت عملی کے لیے جوابدہ اور دوسروں کا ضامن ہو۔ اس طرح پیغمبر ان سے انہیں بتاتے ہیں کہ یہ صرف تم ہو کہ جو حقیقت قبول کرنے یا رد کرنے کے سلسلے میں پورا پورا اختیار رکھتے ہو اور ہدایت کو قبول کرتے ہو۔ میں تو صرف ابلاغ رسالت اور دعوت الٰہی پر مامور ہوں۔

بعد والی آیت میں ایک مختصر اور پُر معنی جملہ کے ساتھ انہیں تنبیہ کر رہا ہے اور صحیح راستہ انتخاب کرنے کے بارے میں دقتِ نظر اور باریک بینی کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے: ہر خبر جو خدا یا پیغمبر تمہیں دیتے ہیں بالآخر اس جہاں میں یا دوسرے جہاں میں اس کی کوئی نہ کوئی قرار گاہ ہے اور آخر کار وہ اپنی مقررہ میعاد پر انجام پائے گی اور تمہیں بہت جلد اس کی خبر ہو جائے گی (لکل نبأ مستقر وسوف تعلمون)[۲]۔

---

[۱] ضمیر "بہ" کو بعض نے قرآن کی طرف لوٹایا ہے اور بعض نے اُس خاص عذاب کی طرف جو اُس سے پہلی آیت میں بیان ہوا تھا لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ اُن تمام باتوں کی طرف اور پیغمبرؐ کی تمام تعلیمات کی طرف جن کی دشمنانِ پیغمبرؐ تکذیب وانکار کیا کرتے تھے لوٹتی ہے، اور آیت کا آخری جملہ بھی اس معنی پر گواہ ہے۔

[۲] ہو سکتا ہے "مستقر" مصدر میمی بمعنی استقرار ہو، یا یہ اسم زمان ومکان محل استقرار کے معنی میں ہو۔ پہلی صورت میں خدائی وعدوں کے اصل تحقق کی خبر دے رہا ہے اور دوسری صورت میں ان وعدوں کے زمان ومکان کی خبر ہے۔

۶۸- وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○

۶۹- وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○

ترجمہ

۶۸- جس وقت تم ان لوگوں کو دیکھو کہ جو ہماری آیات کا مذاق اُڑاتے ہیں تو اُن سے منہ پھیر لو۔ یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں اور اگر شیطان تمہیں بھلا دے تو جونہی (اس) ستم گر گروہ کی طرف تمہاری توجہ ہو جائے تو اُن کے پاس بیٹھنے سے کنارہ کشی کرو۔

۶۹- اور اگر صاحب تقویٰ افراد (انہیں ہدایت اور پند و نصیحت کرنے کے لیے ان کے پاس بیٹھ جائیں) تو ان کے حساب (و گناہ) میں سے کوئی چیز اُن کے اُوپر عائد نہیں ہو گی لیکن (یہ کام صرف انہیں) یاد دہانی کرانے کے لیے ہونا چاہیے شاید (وہ سنیں اور) پرہیزگاری اختیار کرلیں۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں امام باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ جب پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو کفار اور آیات الٰہی کا مذاق اڑانے والوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے منع کر دیا گیا، تو مسلمانوں کی ایک جماعت کہنے لگی کہ اگر ہم چاہیں کہ اس حکم پر ہر جگہ عمل کریں تو نہ ہمیں مسجد الحرام میں جانا چاہیے اور نہ ہی خانہ کعبہ کا طواف کرنا چاہیے (کیونکہ وہ مسجد کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور آیات الٰہی کے بارے میں باطل باتوں میں مشغول ہیں اور ہم مسجد الحرام کے کسی بھی گوشہ میں خواہ کتنا بھی مختصر توقف کریں اس میں ان کی باتیں ہمارے کانوں تک پہنچ سکتی ہیں)۔ اس موقع پر دوسری آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایسے مواقع پر انہیں نصیحت کریں اور جتنا ہو سکے ان کی ہدایت اور رہنمائی کریں۔

اس آیت کے لیے شانِ نزول کا ذکر جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں تمام سورۃ کے اکٹھا نازل ہونے کے منافی نہیں کیونکہ ممکن ہے مسلمانوں کی زندگی میں ایسے مختلف حوادث پیش آئیں، اس کے بعد ایک سورہ اکٹھی نازل ہو

اور اس کی کوئی آیت ان حوادث میں سے کسی حصّہ کو مد نظر رکھتے ہوئے آئی ہو۔

تفسیر

اہلِ باطل کی مجالس سے دوری

چونکہ اس سورہ کے زیادہ تر مباحث مشرکین اور بُت پرستوں کی کیفیت کے بارے میں ہیں لہٰذا ان دو آیات میں اُن سے مربوط ایک دوسرے مسئلہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ارشاد ہوتا ہے کہ: جس وقت تم ہٹ دھرم اور بے منطق مخالفین کو دیکھو کہ وہ آیات خدا کا استہزاء کر رہے ہیں تو اُن سے منہ پھیر لو جب تک وہ اس کام سے صرف نظر کر کے دوسری گفتگو کو شروع نہ کر لیں (و اذا رایت الذین یخوضون فی اٰیاتنا فاعرض عنھم حتّٰی یخوضوا فی حدیث غیرہ)[1]۔

اس جملے میں اگرچہ روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف ہے، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام مومنین کے لیے ہے۔ اس حکم کا فلسفہ بھی واضح ہے کہ اگر مسلمان ان کی مجالس میں شرکت کرتے تھے تو وہ انتقام لینے اور انہیں تکلیف پہنچانے کے لیے اپنی باطل اور ناروا باتوں کو جاری رکھتے تھے، لیکن جب وہ بے اعتنائی کے ساتھ اُن کے قریب سے گزر جائیں تو وہ فطرتاً خاموش ہو جائیں گے اور دوسرے مسائل شروع کر دیں گے، کیونکہ ان کا سارا مقصد تو پیغمبرؐ اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچانا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ یہ موضوع اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ " اگر شیطان تمہیں یہ بات بھلا دے اور اس قسم کے افراد کے ساتھ بھول کر ہم نشین ہو جاؤ تو جب بھی اس موضوع کی طرف توجہ ہو جائے فوراً اُس مجلس سے کھڑے ہو جاؤ اور اُن ظالموں کے پاس نہ بیٹھو" (واما ینسینک الشیطٰن فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظٰلمین)[2]۔

دو سوال اور ان کا جواب

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان پیغمبر پر تسلط پیدا کرے اور ان کے نسیان کا باعث بنے، دوسرے

---

[1] "خوض" جیسا کہ "راغب" کتاب "مفردات" میں کہتا ہے دراصل پانی میں وارد ہونے اور اُس میں چلنے (اور نہانے) کے معنی میں ہے لیکن بعد میں اور امور میں وارد ہونے کے معنی میں بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآن میں اس لفظ کا اطلاق زیادہ تر باطل اور بے بنیاد مطالب میں وارد ہونے کے معنی میں ہوا ہے۔

[2] شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ "لا تقعد" (ان کے پاس نہ بیٹھو) سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف ایسے افراد کے پاس بیٹھنا ممنوع ہے بلکہ مقصد تو ان کی جماعت میں شرکت کرنا ہے، چاہے بیٹھنے کی شکل میں ہو یا قیام کی صورت میں یا چلنے کی حالت میں۔

لفظوں میں کیا مقام عصمت اور خطا سے معصومیت کے باوجود حتیٰ کہ موضوعات میں یہ بات ممکن ہے کہ پیغمبر اشتباہ اور نسیان میں گرفتار ہو جائے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ روئے سخن آیت میں پیغمبر کی طرف ہے لیکن حقیقت میں ان کے پیروکار مراد ہیں کہ اگر وہ فراموش کاری میں گرفتار ہو جائیں اور کفار کے گناہ آمیز اجتماعات میں شریک ہو جائیں تو جس وقت بھی انہیں یاد آجائے فوراً وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوں اور باہر نکل جائیں، اور اس قسم کی بحث ہماری روزمرہ کی گفتگو میں اور مختلف زبانوں کے ادبیات میں عام نظر آتی ہے کہ انسان روئے سخن تو کسی اور کی طرف کرتا ہے مگر اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے سن لیں، عربوں کی مشہور ضرب المثل کی طرح، جس میں کہتے ہیں:

ایاك اعنی واسمعی یاجارة

میری مراد تو تم ہو اور اے پڑوسن تو سن لے۔

بعض مفسرین نے مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں اور ابو الفتوح نے اپنی مشہور تفسیر میں ایک دوسرا جواب دیا ہے کہ جس کا ماحصل یہ ہے کہ انبیاء کے لیے خدا کی طرف سے احکام کے پہنچانے اور مقام رسالت میں سہو و فراموشی اور بھول چوک کا ہونا تو جائز نہیں ہے لیکن موضوعات خارجی میں اگر لوگوں کی گمراہی کا سبب نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ جواب اُس اصول کے ساتھ جو ہمارے متکلمین کے درمیان مشہور ہے کہ انبیاء و ائمہ علیہم السلام احکام کے علاوہ عام موضوعات میں بھی غلطی سے معصوم و مصئون ہیں مناسبت نہیں رکھتا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض علمائے اہل سنت نے اس آیت کو رہبران دینی کے لیے تقیہ جائز نہ ہونے کی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے، دشمنوں کے سامنے تقیہ نہ کرو یہاں تک کہ اگر تم اُن کی مجلس میں بھی موجود ہو تو ان کی مجلس سے کھڑے ہو جاؤ۔

اس اعتراض کا جواب بھی بالکل واضح اور روشن ہے، کیونکہ شیعہ ہرگز یہ نہیں کہتے کہ ہر جگہ تقیہ ضروری ہے بلکہ تقیہ بعض مواقع پر تو قطعاً حرام ہے اور اس کا وجوب صرف ایسے مواقع کے لیے ہے کہ جہاں تقیہ کرنے اور اظہارِ حق نہ کرنے میں کچھ ایسے فوائد و منافع ہوں کہ جو اُس کے اظہار سے زیادہ ہوں یا یہ کہ تقیہ دفع ضرر اور خطر کلی کے دور ہونے کا موجب ہو۔

بعد والی آیت میں ایک موقع کو مستثنیٰ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اگر صاحب تقویٰ لوگ نہی از منکر کی غرض سے اُن کے جلسوں میں شرکت کریں اور پرہیزگاری کی اُمید اور اُن کے گناہ سے پلٹ آنے کی اُمید پر انہیں نصیحت کریں تو کوئی مانع نہیں ہے اور ہم اُن کے گناہ کو ایسے افراد کے حساب میں نہیں لکھیں گے، کیونکہ ہر حالت میں ان کا ارادہ تو خدمت اور اپنے فرض کی بجا آوری تھا (وما علی الذین یتقون من حسابهم من شیء ولکن ذکری لعلهم یتقون)۔

اس آیت کے لیے ایک دوسری تفسیر بھی بیان ہوئی ہے لیکن ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ظاہر آیت اور

اس کی شانِ نزول کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

ضمناً اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ صرف وہ افراد اس استثنا سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ جو آیت کی تعبیر کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری کے مقام کے حامل ہوں اور نہ صرف یہ کہ وہ خود اُن سے متاثر نہ ہوں، بلکہ وہ انہیں خود اپنے سے متاثر کر سکیں۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ کے ذیل میں بھی مذکورہ آیت کے مشابہ ایک مضمون آیا ہے اور وہاں پر دوسرے مطالب بیان ہوئے ہیں [1]

۷۰۔ وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ أَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ ۚ وَإِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۝

ترجمہ

۷۰۔ تم ایسے لوگوں کو کہ جنہوں نے اپنے فطری دین کو کھیل تماشا (اور استہزاء) بنا لیا ہے اور دنیاوی زندگی نے انہیں مغرور کر دیا ہے، چھوڑ دو اور انہیں نصیحت کرو تاکہ وہ اپنے اعمال کے (بُرے نتائج) میں گرفتار نہ ہوں۔ (اس دن) خدا کے سوا نہ ان کا کوئی یار و یاور ہوگا اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا اور (ایسے شخص سے) خواہ وہ کسی بھی قسم کا عوض کیوں نہ دے اس سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو اُن اعمال میں گرفتار ہوئے ہیں کہ جو انہوں نے انجام دیے ہیں۔ ان کے پینے کے لیے گرم پانی ہے اور دردناک عذاب ہے، یہ اس سبب سے ہوگا کیونکہ انہوں نے کفر اختیار کیا ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد چہارم صفحہ ۱۴۲

تفسیر

دینِ حق کو کھیل بنانے والے

یہ آیت اصل میں گذشتہ آیت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کو حکم دے رہی ہے کہ وہ "ایسے اشخاص سے کہ جنہوں نے اپنے دین و آئین کو مذاق بنالیا ہے اور لہو لعب کو دین قرار دے لیا ہے اور دنیا کی زندگی اور اس کے وسائل نے انہیں مغرور کردیا ہے، منہ پھیر لیں اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں" (وذرالذین اتخذوا دینهم لعبًا ولهوًا وغرتهم الحیٰوة الدنیا)۔

یہ بات واضح ہے کہ ایسے اشخاص کو چھوڑ دینے کا حکم مسئلہ جہاد کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتا، کیونکہ جہاد کی کچھ خاص شرائط ہیں اور کفار کے ساتھ بے اعتنائی برتنے کی شرائط دوسری ہیں۔ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر انجام پذیر ہونا چاہیے۔ بعض اوقات تو بے اعتنائی کے ذریعہ ہی مخالفین کو دبانا لازم ہوتا ہے اور کبھی مبارزہ و جہاد اور سلح جنگ کے ذریعہ مقابلہ ضروری ہوتا ہے اور بعض حضرات نے جو یہ تصور کرلیا ہے کہ آیات جہاد نے اوپر والی آیت کو منسوخ کردیا ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

حقیقت میں مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا دین اپنے مفاہیم کے لحاظ سے بیہودہ اور فضول ہے اور انہوں نے چند ایسے اعمال کا نام دین رکھ لیا ہے جو بچوں کے کاموں اور بوڑھوں کی لغویات سے زیادہ مشابہ ہیں۔ ایسے لوگ بحث و گفتگو کے قابل نہیں ہیں۔ لہٰذا حکم دیا گیا ہے کہ تم اُن سے رُخ موڑ لو اور ان کی اور ان کے کھوکھلے مذہب کی پرواہ نہ کرو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس سے معلوم ہوگیا کہ "دینهم" سے مراد وہی ان کا شرک و بت پرستی والا مذہب ہی ہے۔ یہ احتمال کہ اس سے مراد "دین حق" ہو اور ان کی طرف دین کی اضافت و نسبت دین کے فطری ہونے کی وجہ سے ہو، بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن کفار کی ایک جماعت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ وہ خود اپنے دین و مذہب کو ایک لہو و لعب ہی سمجھتے تھے، اور ہرگز اس میں ایک حقیقی مطلب کے طور پر غور نہیں کرتے تھے۔ یعنی وہ اپنی بے ایمانی میں بھی بے ایمان تھے اور اپنے بے بنیاد مذہب کے اصولوں سے بھی وفادار نہیں تھے۔

بہرحال آیت کفار کے ساتھ کوئی اختصاص نہیں رکھتی اور اُن تمام لوگوں کے حالات پر محیط ہے جو مقدساتِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کو اپنے شخصی اور مادی مقاصد کے حصول کا ایک کھیل قرار دیتے ہیں۔ دین کو دنیا کا آلہ اور خدا کے حکم کو اغراضِ شخصی کا کھلونا بنا لیتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ انہیں ان اعمال پر تنبیہ کریں کیونکہ ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہر شخص اپنے اعمال کے آگے سپر انداختہ ہوگا اور اس کے لیے اُس کے چنگل سے فرار کی راہ نہیں ہوگی (وذکر به ان تبسل نفس بما کسبت[1])۔

اور اُس دن خدا کے سوا نہ تو کوئی اس کا حامی و مددگار ہوگا اور نہ ہی کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا (لیس لها من دون الله ولی ولا شفیع)۔

ان کا معاملہ اُس دن اس قدر سخت اور دردناک ہوگا اور وہ اپنے اعمال کی زنجیر میں اس طرح گرفتار ہوں گے کہ "خواہ کتنا بھی تاوان اور جرمانہ (بالفرض اُن کے پاس ہو اور وہ) دیں کہ اپنے آپ کو سزاؤں سے نجات دلائیں تو وہ اُن سے قبول نہیں کیا جائے گا" (وان تعدل کل عدل لا یؤخذ منها)[2]

کیونکہ وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہو چکے ہیں، اس دن نہ تو تلافی کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی توبہ کا وقت باقی ہے لہٰذا ان کے لیے نجات کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی (اولئك الذین ابسلوا بما کسبوا)۔

اس کے بعد ان کی دردناک سزاؤں کے ایک پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، کیونکہ انہوں نے حق اور حقیقت کو ٹھکرا دیا ہے لہٰذا ان کے لیے دردناک عذاب کے ساتھ پینے کے لیے کھولتا ہوا گرم پانی ہوگا (لهم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون) وہ گرم گرم کھولتے ہوئے پانی کی وجہ سے اندر سے جل رہے ہوں گے اور باہر کی طرف سے آگ میں جل رہے ہوں گے۔

ایک نکتہ کہ جس کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے یہ ہے کہ (اولئك الذین ابسلوا بما کسبوا) "وہ اپنے اعمال میں گرفتار ہوں گے" حقیقت میں اُن سے تاوان قبول نہ ہونے اور ان کا ولی و شفیع نہ ہونے کی دلیل و علت کے طور پر ہے۔ یعنی ان کی سزا کسی خارجی عامل کی وجہ سے نہیں ہے کہ جسے کسی طرح سے دفع کیا جا سکے، بلکہ خود ان کی ذات و صفات اور اعمال کے اندر ہی اس کا سرچشمہ ہے، وہ اپنے بُرے اعمال کے قیدی ہیں اس لیے اُن کی رہائی ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اعمال اور ان کے آثار سے الگ ہونا خود اپنے آپ سے جدا ہونے کے مترادف ہے۔

لیکن اس بات پر بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ یہ شدت و سختی اور راہ بازگشت کا مسدود ہونا اور شفاعت کا عدم وجود ایسے

---

[1] "تبسل" اصل میں مادہ "بسل" (بر وزن نسل) کسی چیز سے قہر و غلبہ کے ذریعہ بچنے اور منع کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے کسی کو تسلیم و سپردگی کے لیے ابھارنے کو ابسال کہا جاتا ہے۔ نیز اسی مناسبت سے سزا دینے اور یرغمال بنانے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور "جیش باسل" لشکر شجاع کے معنی میں بھی اسی مناسبت سے ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو قہر و غلبہ سے جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اوپر والی آیت میں بھی کسی شخص کا تسلیم اور گرفتار ہونا اپنے بُرے اعمال کے چنگل میں کے معنی میں آیا ہے۔

[2] "عدل" یہاں معادل اور وہ چیز جو کسی غلط کام کی تلافی کے طور پر دی جائے کے معنی میں ہے تاکہ مد مقابل آزاد ہو جائے۔ حقیقت میں اس کا معنی غرامت، جرمانے اور فدیہ سے شباہت رکھتا ہے۔

لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ جو کفر پر اصرار کرتے رہے اور ہمیشہ اسی پر کار بند رہے، جیسا کہ (بما کانوا یکفرون) کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کیونکہ فعل مضارع کسی چیز کے استمرار کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔

۷۱۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ لَهٗٓ اَصْحٰبٌ يَّدْعُوْنَهٗٓ اِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۷۲۔ وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِىْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۱۔ تم کہہ دو کہ کیا ہم خدا کے سوا کسی اور چیز کو پکاریں کہ جو نہ ہمارے لیے کوئی فائدہ دینے والی ہے اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچانے والی اور (اس طرح سے) ہم پیچھے کی طرف پلٹ جائیں جب کہ خدا نے ہمیں ہدایت کر دی ہے، اس شخص کی مانند کہ جسے شیاطین کے وسوسوں نے گمراہ کر دیا ہو اور وہ زمین میں حیران ہو، حالانکہ اس کے ایسے یار و مددگار بھی ہیں کہ جو اُسے ہدایت کی طرف بلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) کہ ہماری طرف آؤ۔ تم کہہ دو کہ صرف خدا کی ہدایت ہی (اصل) ہدایت ہے، اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم عالمین کے پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔

۷۲۔ اور یہ کہ نماز قائم کرو اور اس سے ڈرو اور وہی ہے وہ ذات کہ جس کی طرف تم محشور ہو گے۔

تفسیر

یہ آیت اُس اصرار کے مقابلہ میں کہ جو مشرکین مسلمانوں کو کفر و بت پرستی کی دعوت کے لیے کرتے تھے، پیغمبر کو حکم دے رہی ہے کہ ایک دندان شکن دلیل کے ساتھ انہیں جواب دیں اور ایک استفہام انکاری کی صورت میں اُن سے پوچھیں کہ: کیا تم یہ کہتے ہو کہ ہم کسی ایسی چیز کو خدا کا شریک قرار دیں کہ جو نہ ہمارے لیے کوئی فائدہ رکھتی ہے کہ اس فائدہ کی خاطر ہم اس کی طرف جائیں اور نہ ہی کوئی ضرر رکھتی ہے کہ ہم اس کے نقصان سے ڈریں (قل اندعوا من دون اللہ ما لا ینفعنا ولا یضرنا)۔

یہ جملہ حقیقت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عام طور سے انسان کے تمام کام ان ہی دونوں سرچشموں میں سے کسی ایک سرچشمہ سے پیدا ہوتے ہیں، یا تو وہ نفع کے حصول کی خاطر ہوتے ہیں (خواہ وہ مادی نفع ہو یا معنوی) اور یا دفع ضرر کی خاطر ہوتے ہیں (ضرر بھی خواہ معنوی ہو یا مادی)۔

کوئی عاقل کیسے کوئی ایسا کام کرے گا کہ جس میں ان دونوں میں سے کوئی سا عامل بھی موجود نہ ہو؟

اس کے بعد مشرکین کے مقابلے میں ایک اور استدلال پیش کیا گیا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے: اگر ہم بت پرستی کی طرف پلٹ جائیں اور ہدایت الٰہی کے بعد شرک کی راہ میں گامزن ہو جائیں (تو اس طرح) تو ہم پیچھے کی طرف لوٹ جائیں گے اور یہ بات قانون ارتقا کے خلاف ہے کہ جو عالم حیات کا ایک عمومی قانون ہے (و نرد علی اعقابنا بعد اذ ھدانا اللّٰہ)[1]

اس کے بعد ایک مثال کے ذریعہ اس مطلب کو اور زیادہ واضح اور روشن کیا گیا ہے اور قرآن یوں کہتا ہے: (توحید سے شرک کی طرف بازگشت) مثل اس کے ہے کہ کوئی شخص شیطانی وسوسوں سے (یا غولہائے بیابانی سے کہ جو جاہلیت کے عربوں کے خیال کے مطابق راستوں میں گھات لگا کر بیٹھے ہوا کرتے تھے اور مسافروں کو ان کی راہ سے بے راہ کر دیا کرتے تھے) راہ مقصد گم کر دے اور بیابان میں حیران و سرگرداں رہ گیا ہو (کالذی استھوتہ الشیاطین فی الارض حیران)۔

حالانکہ اُس کے ایسے دوست بھی ہیں کہ جو اُسے ہدایت اور شاہراہ (حق) کی طرف بلاتے ہیں اور اُسے آوازیں دے رہے ہیں کہ ہماری طرف آؤ۔ لیکن وہ اس طرح سے حیران و سرگرداں ہے کہ جیسے وہ اُن کی باتوں کو سن ہی نہیں رہا ہے، یا وہ قوت ارادی نہیں رکھتا (لہ اصحاب یدعونہ الی الھدی ائتنا)[2]

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ تم صراحت کے ساتھ یہ کہہ دو کہ: "ہدایت صرف خدا کی ہدایت ہے اور ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم صرف عالمین کے پروردگار کے سامنے سر تسلیم خم کریں" (قل ان ھدی اللّٰہ ھو الھدی وامرنا لنسلم لرب العٰلمین)۔

یہ جملہ حقیقت میں مشرکین کے مذہب کی نفی پر ایک اور دلیل ہے کیونکہ صرف ایسی ذات کے سامنے ہی سر تسلیم خم

---

[1] "اعقاب" جمع "عقب" (بروزن خشن) ایڑی کے معنی میں ہے اور ایڑی پر پھرنے کو پیچھے کی طرف پھرنا کہتے ہیں اور یہ ہدف و مقصد سے انحراف اور پھرنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے آجکل ارتجاع (یعنی رجعت پسندی) سے تعبیر کرتے ہیں۔

[2] "استھوتہ" - "ھوی" کے مادہ سے ہے اور یہ لفظ کسی کو ہوا و ہوس کی پیروی پر آمادہ کرنے کے معنی میں ہے، "حیران" لغت میں آمد و رفت کے معنی میں ہے اور عام طور سے سرگردانی سے کنایہ ہے۔ کیونکہ لوگ سرگردانی سے کچھ راستہ چلتے ہیں پھر پلٹ آتے ہیں اس بنا پر یہ آیت ان افراد کو جو ایمان سے شرک کی طرف پلٹ جائیں سرگرداں ہوا پرستوں سے تشبیہ دیتی ہے جو اپنا اصل پروگرام شیطانی الہام کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔

کرنا چاہیے کہ جو مالک و خالق اور مربیٔ عالم ہستی ہو، نہ کہ بتوں کے سامنے کہ جو اس جہان کی ایجاد و تخلیق میں کوئی نقش و اثر نہیں رکھتے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت سے پہلے مشرکین کے مذہب کے پیرو تھے کہ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ:۔

نردعلی اعقابنا

کیا ہم سابقہ حالت کی طرف پلٹ جائیں۔

حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کبھی بھی بت کے سامنے سجدہ نہیں کیا اور کسی بھی تاریخ میں اس قسم کی کوئی چیز لکھی ہوئی نہیں ہے پھر اصولی طور پر مقام عصمت بھی ایسے کسی امر کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ لفظ حقیقت میں مسلمانوں کی ایک جماعت کی زبان سے ادا ہوا ہے نہ کہ ذات پیغمبر کی زبان سے اسی لیے جمع کے صیغہ اور ضمیروں کے ساتھ ادا ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں دعوت الٰہی کے بعد عائد ہونے والے فرائض کی یوں تشریح کی گئی ہے کہ ہم نے توحید کے علاوہ یہ حکم دیا ہے کہ "نماز قائم کرو اور تقویٰ اختیار کرو" (وان اقیموا الصلٰوۃ واتقوہ)۔

اور آخر میں مسئلہ معاد و قیامت کی طرف توجہ کرواتے ہوئے اور یہ کہ تمہارا حشر و نشر اور بازگشت خدا کی طرف ہے اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے (وھو الذی الیہ تحشرون)۔

حقیقت میں ان چند مختصر جملوں میں وہ پروگرام کہ جس کی طرف پیغمبر دعوت دیا کرتے تھے اور جس کا سرچشمہ عقل اور فرمان خدا تھا، چار اصولوں کے پروگرام کی صورت میں کہ جس کا آغاز توحید اور انجام معاد و قیامت تھا اور اس کے درمیانی مراحل خدائی رشتوں کو محکم کرنا اور ہر گناہ سے پرہیز کرنا تھا، پیش کیا گیا ہے۔

۷۳۔ وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ ؕ۬ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ ○

ترجمہ

۷۳۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، اور اس دن وہ کہے گا "ہو جا"

تو (جس بات کا ارادہ کیا ہے) وہ ہو جائے گا، اس کا قول حق ہے، اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا اُس دن تو حکومت اسی کے ساتھ مخصوص ہو گی۔ وہ (تمام) پوشیدہ اور ظاہر و آشکار (چیزوں) سے باخبر ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔

تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیت کے مطالب پر ایک دلیل ہے، اور پروردگار عالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور اس کی ہدایت کی پیروی کرنے کے لازم ہونے کی بھی ایک دلیل ہے۔ لہٰذا پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا ہی ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (و ھو الذی خلق السمٰوٰت و الارض بالحق)۔

صرف وہی ذات کہ جو مبداءِ عالم ہستی ہے، رہبری کے لیے شائستہ و لائق ہے اور صرف اسی کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے کیونکہ اس نے تمام چیزوں کو ایک صحیح مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔

اوپر والے جملے میں "حق" سے مراد وہی نتیجہ، مقصد، ہدف، مصالح اور حکمتیں ہیں۔ یعنی اس نے ہر چیز کو کسی مصلحت اور ہدف و نتیجہ کے لیے پیدا کیا ہے حقیقت میں یہ جملہ اس مطلب سے مشابہ ہے جو سورہ ص آیہ ۲۷ میں بیان ہوا ہے کہ جہاں پر ہے:

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَ الۡاَرۡضَ وَمَا بَیۡنَهُمَا بَاطِلًا ۔

ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے فضول اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: نہ صرف مبداءِ عالم ہستی وہی ہے بلکہ معاد و قیامت بھی اسی کے حکم سے صورت پذیر ہو گی" اور جس دن وہ حکم دے گا کہ قیامت بپا ہو جائے تو وہ فوراً بپا ہو جائے گی"[1] (و یوم یقول کن فیکون)

بعض نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس جملے سے مراد وہی آغاز آفرینش اور مبداءِ جہان ہستی ہے کہ تمام چیزیں اس کے فرمان سے ایجاد ہوئی ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "یقول" فعل مضارع ہے۔ اور یہ کہ اس جملے سے پہلے اصل آفرینش کی طرف اشارہ ہوا ہے اور اسی طرح بعد کے جملوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ جملہ قیامت اور اس کے بارے میں حکم خدا کے ساتھ ہی مربوط ہے۔

---

[1] اس بارے میں کہ "یوم" جو قواعد ادبی کے مطابق ظرف ہے کس سے متعلق ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض اسے "خلق" کے جملے سے بعض "اذکروا" کے جملے سے جو محذوف ہے متعلق سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ "یکون" سے متعلق ہو۔ اور پھر جملے کا معنی اس طرح ہو گا: "یکون القیامۃ یوم یقول اللہ لہ کن"

جیسا کہ ہم (تفسیر نمونہ کی) جلد اول (سورہ بقرہ کی آیہ ۱۱۷ کے ذیل) میں بیان کر چکے ہیں۔ "کن فیکون" سے مراد یہ نہیں ہے کہ خدا ایک لفظی فرمان "ہو جا" کی طرح صادر فرماتا ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے خلق کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کسی دوسرے عامل کی احتیاج کے بغیر اس کا ارادہ خود بخود جامۂ عمل پہن لیتا ہے، اگر اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ چیز دفعتاً اور ایک ہی مرتبہ موجود ہو جائے تو وہ ایک ہی دفعہ موجود ہو جاتی ہے اور اگر اس نے یہ ارادہ کیا ہے کہ وہ چیز تدریجاً وجود میں آئے تو اس کا تدریجی پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: خدا کی بات حق ہے۔ یعنی جس طرح آفرینش کی ابتداء ہدف و نتیجہ اور مصلحت کی بنیاد پر تھی، قیامت و معاد بھی اسی طرح ہو گی (قولہ الحق)۔

اور اس دن جب صور میں پھونکا جائے گا اور قیامت برپا ہو جائے گی، تو حکومت و مالکیت اسی کی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہوگی (و لہ الملک یوم ینفخ فی الصور)۔

یہ صحیح ہے کہ خدا کی مالکیت اور حکومت تمام عالم ہستی پر ابتداء جہان سے رہی ہے اور دنیا کے خاتمہ تک اور عالم قیامت میں بھی جاری رہے گی اور قیامت کے ساتھ کوئی اختصاص نہیں رکھتی لیکن چونکہ اس جہان میں اہداف و مقاصد کی تکمیل اور کاموں کے انجام دینے کے لیے عوامل و اسباب کا ایک سلسلہ اثر انداز ہوتا ہے لہٰذا بعض اوقات یہ عوامل و اسباب خدا سے جو مسبب الاسباب ہے غافل کر دیتے ہیں۔ مگر وہ دن کہ جس میں تمام اسباب بے کار ہو جائیں گے تو اس کی مالکیت و حکومت ہر زمانے سے زیادہ آشکار و واضح ہو جائے گی، ٹھیک ایک دوسری آیت کی طرح جو یہ کہتی ہے کہ:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔

حکومت اور مالکیت آج (قیامت کے دن) کس کی ہے؟ صرف خدائے یگانہ و قہار کے لیے ہے۔ (سورہ المؤمن۔ آیہ ۱۶)

اس بارے میں کہ صور۔ جس میں پھونکا جائے گا۔ سے مراد کیا ہے اور اسرافیل صور میں کس طرح پھونکے گا کہ اس سے تمام جہان والے مر جائیں گے اور دوبارہ صور میں پھونکے گا تو سب زندہ ہو جائیں گے اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ انشاءاللہ ہم سورۂ زمر کی آیہ ۶۸ کے ذیل میں شرح و بسط کے ساتھ بحث کریں گے کیونکہ یہ بحث اس آیت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

اور آیت کے آخر میں خدا کی صفات میں سے تین صفات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: خدا پنہاں و آشکار سے باخبر ہے (عالم الغیب و الشھادۃ)۔

اور اس کے تمام کام حکمت کی رو سے ہوتے ہیں اور وہ تمام چیزوں سے باخبر ہے (و ھو الحکیم الخبیر)۔

قیامت سے مربوط آیات میں اکثر خدا کی ان صفات کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ وہ آگاہ بھی ہے اور قادر و حکیم بھی یعنی اپنے علم و آگاہی کے اقتضا کے مطابق وہ ہر شخص کو مناسب جزا دیتا ہے۔

۷۴۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ لِاَبِیْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَ قَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○

ترجمہ

۷۴۔ (اور یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے مربی (چچا) آزر سے یہ کہا کہ کیا تم بتوں کو اپنا خدا بناتے ہو، میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو واضح گمراہی میں پاتا ہوں۔

تفسیر

چونکہ یہ سورہ شرک و بت پرستی سے مقابلے کا پہلو رکھتی ہے اور اس میں روئے سخن زیادہ تر بت پرستوں کی طرف ہے لہٰذا ان کو بیدار کرنے کے لیے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا گیا ہے، یہاں بہادر بت شکن ابراہیم کی سرگزشت کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور بت شکنی کے سلسلہ میں ان کی قوی منطق کو چند آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے بیانِ توحید اور بتوں سے مبارزہ کے سلسلہ میں بہت سے مباحث میں اسی سرگذشت کو ذکر کیا ہے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ تمام اقوام کے لیے خصوصاً مشرکین عرب کے لیے قابلِ احترام تھے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) کو تنبیہ کی اور اس سے کہا کہ: کیا تم نے ان بے قیمت اور بے جان بتوں کو اپنا خدا بنا رکھا ہے (واذ قال ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما الھۃ)۔

اس میں شک نہیں کہ میں تجھے اور تیرے پیروکار اور ہم مسلک گروہ کو واضح گمراہی میں دیکھتا ہوں، اس سے زیادہ گمراہی اور کیا ہوگی کہ انسان اپنی مخلوق کو اپنا معبود قرار دے اور بے جان و بے شعور موجود کو اپنی پناہ گاہ سمجھ لے اور اپنی مشکلات کا حل اُن سے طلب کرے (انی اراك و قومك فی ضلال مبین)۔

کیا آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ تھا

لفظ "اب" عربی زبان میں عام طور پر باپ کے لیے بولا جاتا ہے، اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بعض اوقات چچا، نانا، مربی و معلم اور اسی طرح وہ افراد کہ جو انسان کی تربیت میں کچھ نہ کچھ زحمت و مشقت اٹھاتے ہیں ان پر بھی بولا جاتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جب یہ لفظ بولا جائے اور کوئی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر معنی کے لیے پہلے باپ ہی ذہن میں آتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سچ مچ اوپر والی آیت یہ کہتی ہے کہ وہ بت پرست شخص (آزر) حضرت ابراہیمؑ کا

باپ تھا، توکیا ایک بت پرست اور بت ساز شخص ایک اولوالعزم پیغمبر کا باپ ہوسکتا ہے، اس صورت میں کیا انسان کی نفسیات و صفات کی وراثت اس کے بیٹے میں غیر مطلوب اثرات پیدا نہیں کردے گی۔

اہل سنت مفسرین کی ایک جماعت نے پہلے سوال کا مثبت جواب دیا ہے اور آزر کو حضرت ابراہیمؑ کا حقیقی باپ سمجھا ہے، جب کہ تمام مفسرین وعلماء شیعہ کا عقیدہ یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیمؑ کا باپ نہیں تھا بعض اُسے آپ کا نانا اور بہت سے حضرت ابراہیمؑ کا چچا سمجھتے ہیں۔

وہ قرائن جو شیعہ علماء کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ کسی تاریخی منبع و مصدر اور کتاب میں حضرت ابراہیمؑ کے والد کا نام آزر شمار نہیں کیا گیا بلکہ سب نے "تارخ" لکھا ہے۔ کتب عہدین میں بھی یہی نام آیا ہے، قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ جو لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا باپ آزر تھا، یہاں انہوں نے ایسی توجیہات کی ہیں جو کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ اور اس کا لقب آزر تھا۔ حالانکہ یہ لقب بھی منابع تاریخ میں ذکر نہیں ہوا۔ یا یہ کہ آزر ایک بت تھا کہ جس کی ابراہیمؑ کا باپ پوجا کرتا تھا، حالانکہ یہ احتمال اوپر والی آیت کے ظاہر کے ساتھ جو یہ کہتی ہے کہ آزر ان کا باپ تھا کسی طرح بھی مطابقت نہیں رکھتی، مگر یہ کہ کوئی جملہ یا لفظ مقدر مانیں جو کہ خلافِ ظاہر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ مسلمان یہ حق نہیں رکھتے کہ مشرکین کے لیے استغفار کریں اگرچہ وہ ان کے عزیز وقریب ہی ہوں۔ اس کے بعد اس غرض سے کہ کوئی آزر کے بارے میں ابراہیمؑ کے استغفار کو دستاویز قرار نہ دے اس طرح کہتا ہے:-

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ (سورۂ توبہ : ۱۱۴)

ابراہیمؑ کی اپنے باپ آزر کے لیے استغفار صرف اُس وعدہ کی بنا پر تھی جو انہوں نے اُس سے کیا تھا۔ چونکہ آپ نے یہ کہا تھا کہ:

سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۔ (مریم : ۴۷)

یعنی میں عنقریب تیرے لیے استغفار کروں گا۔

یہ اس اُمید پر تھا کہ شاید وہ اس وعدہ کی وجہ سے خوش ہوجائے اور بت پرستی سے باز آجائے لیکن جب اُسے بت پرستی کی راہ میں پختہ اور ہٹ دھرم پایا تو اس کے لیے استغفار کرنے سے دستبردار ہوگئے۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ ابراہیمؑ نے آزر سے مایوس ہوجانے کے بعد پھر کبھی اُس کے لیے طلب مغفرت نہیں کی۔ اور ایسا کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ تمام قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیمؑ کی جوانی کے زمانے کا ہے جب کہ آپ شہر بابل میں رہائش پذیر تھے اور بت پرستوں کے ساتھ مبارزہ اور مقابلہ کر رہے تھے۔

لیکن قرآن کی دوسری آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ ابراہیمؑ نے اپنی آخری عمر میں خانۂ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنے باپ کے لیے طلب مغفرت کی ہے (البتہ ان آیات میں جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ باپ سے "اب" کو تعبیر نہیں کیا بلکہ "والد" کے ساتھ تعبیر کیا ہے جو صراحت کے ساتھ باپ کے مفہوم کو ادا کرتا ہے)۔

جیسا کہ قرآن میں ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ .....

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۔

حمد و ثنا اس خدا کے لیے ہے کہ جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا کیے، میرا پروردگار دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے، اے پروردگار مجھے، میرے ماں باپ اور مومنین کو قیامت کے دن بخش دے[1]

اس آیت کو سورہ توبہ کی آیت کے ساتھ ملانے سے جو مسلمانوں کو مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کرتی ہے اور ابراہیمؑ کو بھی ایسے کام سے۔ سوائے ایک مدت محدود کے وہ بھی صرف ایک مقدس مقصد و ہدف کے لیے۔ روکتی ہے، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ زیر بحث آیت میں "اب" سے مراد باپ نہیں ہے بلکہ چچا یا نانا یا کوئی اور اسی قسم کا رشتہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں "والد" باپ کے معنی میں صریح ہے جب کہ "اب" میں صراحت نہیں پائی جاتی۔

قرآن کی آیات میں لفظ "اب" ایک مقام پر چچا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورہ بقرہ آیہ ۱۳۳:

قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۔

یعقوب کے بیٹوں نے اُس سے کہا ہم تیرے خدا اور تیرے آبا ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے خدائے یکتا کی پرستش کرتے ہیں۔

ہم یہ بات اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اسماعیلؑ یعقوبؑ کے چچا تھے باپ نہیں تھے۔

۳۔ مختلف اسلامی روایات سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث میں آنحضرتؐ سے منقول ہے:

لم يزل ينقلني الله من اصلاب الطاهرين الى ارحام المطهرات حتى اخرجني في عالمكم هذا لم يدنسني بدنس الجاهلية ۔

خداوند تعالیٰ مجھے ہمیشہ پاک آباؤ اجداد کے صلب سے پاک ماؤں کے رحم میں منتقل کرتا رہا اور اس نے مجھے کبھی زمانہ جاہلیت کی آلودگیوں اور گندگیوں میں آلودہ نہیں کیا[2]

---

[1] سورہ ابراہیم آیہ ۳۹۔ ۴۱۔

[2] اس روایت کو بہت سے شیعہ و سنی مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں نیشاپوری نے تفسیر غرائب القرآن میں فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت کی واضح ترین آلودگی شرک وبت پرستی ہے اور جنہوں نے اسے آلودگی زنا میں منحصر سمجھا ہے ان کے پاس اپنے قول پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ خصوصاً جبکہ قرآن کہتا ہے کہ:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ

مشرکین گندگی میں آلودہ اور ناپاک ہیں [1]

طبری جو علمائے اہل سنت میں سے ہے اپنی تفسیر جامع البیان میں مشہور مفسر مجاہد سے نقل کرتا ہے کہ وہ صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا [2]

اہل سنت کا ایک دوسرا مفسر آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں اسی آیت کے ذیل میں کہتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ کہ آزر ابراہیم کا باپ نہیں تھا شیعوں سے مخصوص ہے ان کی کم اطلاعی کی وجہ سے ہے کیونکہ بہت سے علماء (اہل سنت) بھی اسی بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ آزر ابراہیمؑ کا چچا تھا [3]

"سیوطی" مشہور سنی عالم کتاب مسالک الحنفاء میں فخرالدین رازی کی کتاب اسرار التنزیل سے نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے ماں باپ اور اجداد کبھی بھی مشرک نہیں تھے اور اس حدیث سے جو ہم اوپر پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرچکے ہیں استدلال کیا ہے۔ اس کے بعد سیوطی خود اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہم اس حقیقت کو دو طرح کی اسلامی روایات سے ثابت کرسکتے ہیں۔ پہلی قسم کی روایات تو وہ ہیں کہ جو یہ کہتی ہیں کہ پیغمبر کے آباؤ اجداد حضرت آدمؑ تک ہر ایک اپنے زمانہ کا بہترین فرد تھا (ان احادیث کو "صحیح بخاری" اور "دلائل النبوۃ" سے بیہقی وغیرہ نے نقل کیا ہے)۔

اور دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جو یہ کہتی ہیں کہ ہر زمانے میں موحد و خدا پرست افراد موجود رہے ہیں، ان دونوں قسم کی روایات کو باہم ملانے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ اجداد پیغمبرؐ کہ جن میں سے ایک ابراہیم کے باپ بھی ہیں یقیناً موحد تھے [4]

جو کچھ کہا جاچکا ہے اس طرف توجہ کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت کی مذکورہ بالا تفسیر ایک ایسی تفسیر ہے جو خود قرآن اور مختلف اسلامی روایات کے واضح قرائن کی بنیاد پر بیان ہوئی ہے نہ کہ تفسیر بالرائے ہے جیسا کہ بعض متعصب اہل سنت مثلاً مؤلف المنار نے کہا ہے۔

۷۵۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ

---

[1] سورۂ توبہ آیہ ۲۸۔

[2] جامع البیان جلد ۷، صفحہ ۱۵۸۔

[3] تفسیر روح المعانی جلد ۷، صفحہ ۱۶۹۔

[4] مسالک الحنفاء صفحہ ۱۷، مطابق نقل حاشیہ بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۵ صفحہ ۱۱۸ اور بعد۔

الْمُوقِنِیْنَ ○

۷۶۔ فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ الَّیْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ○

۷۷۔ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّیْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَهْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ ○

۷۸۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○

۷۹۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ۚ

ترجمہ

۷۵۔ اس طرح ہم نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت ابراہیم کو دکھائے تاکہ وہ اہل یقین میں سے ہو جائے۔

۷۶۔ جب رات (کی تاریکی) نے اُسے ڈھانپ لیا تو اُس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا۔ کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا کہ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

۷۷۔ اور جب اُس نے چاند کو دیکھا کہ وہ (سینۂ افق کو چیر کر) نکلا ہے تو اُس نے کہا کیا یہ میرا خدا ہے؟ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا کہ اگر میرا پروردگار میری رہنمائی نہ کرے تو میں یقینی طور پر گمراہ جماعت میں سے ہو جاؤں گا۔

۷۸۔ اور جب اُس نے سورج کو دیکھا کہ وہ (سینۂ افق کو چیر کر) نکل رہا ہے تو کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے؟ یہ تو (سب سے) بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو کہا اے قوم میں اُن شریکوں سے جنہیں تم (خدا کے لیے)

قرار دیتے ہو بیزار ہوں۔

۷۹۔ میں نے تو اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے۔ میں اپنے ایمان میں مخلص ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

تفسیر

آسمانوں میں توحید کی دلیلیں

اس سرزنش اور ملامت کے بعد جو ابراہیم بتوں کی کرتے تھے، اور اُس دعوت کے بعد جو آپ نے آزر کو بت پرستی کے ترک کرنے کے لیے کی تھی ان آیات میں خدا ابراہیم کے بت پرستوں کے مختلف گروہوں کے ساتھ منطقی مقابلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن کے واضح عقلی استدلالات کے طریق سے اصل توحید کو ثابت کرنے کی کیفیت بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: جس طرح ہم نے ابراہیم کو بت پرستی کے نقصانات سے آگاہ کیا اسی طرح ہم نے اس کے لیے تمام آسمانوں اور زمین پر پروردگار کی مالکیت مطلقہ اور تسلط کی نشاندہی کی (وکذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض)[1]۔

"ملکوت" اصل میں "ملک" (بروزن حکم) کے مادہ سے ہے جو حکومت و مالکیت کے معنی میں ہے اور "و" اور "ت" کا اضافہ تاکید و مبالغہ کے لیے ہے، اس بنا پر یہاں اس سے مراد تمام عالم ہستی پر خدا کی حکومت مطلقہ ہے۔

یہ آیت اصل میں اُس تفصیل کا ایک اجمال ہے کہ جو بعد کی آیات میں سورج، چاند اور ستاروں کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے بارے میں اور اُن کے غروب ہونے سے اُن کے مخلوق ہونے پر دلیل لانے کے سلسلہ میں بیان ہوئی ہے۔

یعنی قرآن نے پہلے ان مجموعی واقعات کا اجمالی بیان کیا ہے اس کے بعد ان کی تشریح شروع کی ہے اور اس طرح سے ابراہیم کو ملکوتِ آسمان و زمین دکھانے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

اور آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: ہمارا ہدف و مقصد یہ تھا کہ ابراہیم اہل یقین میں سے ہو جائے (ولیکون من الموقنین)۔

---

[1] اس بنا پر آیت میں ایک حذف اور تقدیر موجود ہے جو آیات قبل سے واضح ہوتی ہے اور حقیقت میں آیت کا مضمون اس طرح ہے: کما اریناابراھیم قبح ما کان علیہ قومہ من عبادۃ الاصنام کذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض۔ غور کیجئے گا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ ابراہیمؑ خدا کی یگانگت کا استدلالی وفطری یقین رکھتے تھے ، لیکن اسرار آفرینش کے مطالعہ سے یہ یقین درجہ کمال کو پہنچ گیا ، جیسا کہ وہ قیامت اور معاد کا یقین رکھتے تھے ، لیکن سربریدہ پرندوں کے زندہ ہونے کے مشاہدہ سے ان کا ایمان "عین الیقین" کے مرحلہ کو پہنچ گیا ۔

بعد والی آیات میں اس موضوع کو تفصیلی طور پر بیان کیا ہے جو ستاروں اور آفتاب کے طلوع وغروب سے ابراہیمؑ کے استدلال کو ان کے خدا نہ ہونے پر واضح کرتا ہے ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے : جب رات کے تاریک پردے نے سارے عالم کو چھپا لیا تو اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک ستارہ ظاہر ہوا ۔ ابراہیم نے پکار کر کہا کہ کیا یہ میرا خدا ہے ؛ لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو انہوں نے پورے یقین کے ساتھ کہا کہ میں ہرگز ہرگز غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں عبودیت وربوبیت کے لائق نہیں سمجھتا (فلما جن علیه الیل رأی کوکبا قال هٰذا ربی فلما افل قال لا احب الأفلین) ۔

انہوں نے دوبارہ اپنی آنکھیں صفحہ آسمان پر گاڑ دیں ۔ اس دفعہ چاند کی چاندی جیسی ٹکیہ وسیع اور دل پذیر روشنائی کے ساتھ صفحہ آسمان پر ظاہر ہوئی ۔ جب چاند کو دیکھا تو ابراہیمؑ نے پکار کر کہا کہ کیا یہ ہے میرا پروردگار ؛ لیکن آخر کار چاند کا انجام بھی اُس ستارے جیسا ہی ہوا اور اُس نے بھی اپنا چہرہ پردہ افق میں چھپا لیا تو حقیقت کے متلاشی ابراہیمؑ نے کہا کہ اگر میرا پروردگار مجھے اپنی طرف رہنمائی نہ کرے تو میں گمراہوں کی صف میں جا کھڑا ہوں گا (فلما رأی القمر بازغا قال هٰذا ربی فلما افل قال لئن لم یهدنی ربی لاکونن من القوم الضالین) ۔

اُس وقت رات آخر کو پہنچ چکی تھی اور اپنے تاریک پردوں کو سمیٹ کر آسمان کے منظر سے بھاگ رہی تھی ، آفتاب نے افق مشرق سے سر نکالا اور اپنے زیبا اور لطیف نور کو زر لفت کے ایک ٹکڑے کی طرح دشت وکوہ وبیابان پر پھیلا دیا ، جس وقت ابراہیمؑ کی حقیقت بین نظر اُس کے خیرہ کرنے والے نور پر پڑی تو پکار کر کہا : کیا میرا خدا یہ ہے ؟ جو سب سے بڑا ہے اور سب سے زیادہ روشن ہے ، لیکن سورج کے غروب ہو جانے اور آفتاب کی ٹکیہ کے ہیولائے شب کے منہ میں چلے جانے سے ابراہیمؑ نے اپنی آخری بات ادا کی ، اور کہا : اے گروہ (قوم) ، میں ان تمام بناوٹی معبودوں سے جنہیں تم نے خدا کا شریک قرار دے لیا ہے بری وبیزار ہوں (فلما رأی الشمس بازغة قال هٰذا ربی هٰذا اکبر فلما افلت قال یا قوم انی بریئ مما تشرکون) ۔

اب جب کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس متغیر ومحدود اور قوانین طبیعت کے جنگل میں اسیر مخلوقات کے ماوراء ایک ایسا خدا ہے کہ جو اس سارے نظام کائنات پر قادر وحاکم ہے تو میں تو اپنا رُخ ایسی ذات کی طرف کرتا ہوں کہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور اس عقیدے میں میں کم سے کم شرک کو بھی راہ نہیں دیتا ، میں تو موحد خالص ہوں اور مشرکین میں سے نہیں ہوں (انی وجهت وجهی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفاً وما انا من المشرکین) ۔

اس آیت کی تفسیر اور بعد والی آیات کی تفسیر میں اور یہ کہ ابراہیمؑ جیسے موحد یکتا پرست نے کس طرح آسمان کے ستارے کی طرف اشارہ کیا اور یہ کہا کہ یہ میرا خدا ہے مفسرین نے بہت بحث کی ہے ۔ ان تمام تفاسیر میں سے دو تفسیریں زیادہ

قابلِ ملاحظہ ہیں کہ جن میں سے ہر ایک کو بعض بزرگ مفسرین نے اختیار کیا ہے اور ان پر منابع حدیث میں بھی شواہد موجود ہیں۔
پہلی یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ذاتی طور پر یہ چاہتے تھے کہ خدا شناسی کے بارے میں غور و فکر کریں اور اُس معبود کو جسے وہ اپنی پاک فطرت کی بناء پر اپنی روح و جان کی گہرائیوں میں پاتے تھے تلاش کریں۔ وہ خدا کو نورِ فطرت اور عقلی اجمالی دلیل سے تو پہچان چکے تھے، اور ان کی تمام تعبیرات بتلاتی ہیں کہ انہیں اُس کے وجود میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں تھا لیکن وہ اس کے حقیقی مصداق کی تلاش میں تھے، بلکہ اُس کے حقیقی مصداق کو بھی جانتے تھے مگر چاہتے یہ تھے کہ زیادہ واضح عقلی استدلال کے ذریعہ "حق الیقین" کے مرحلہ تک پہنچ جائیں۔ اور یہ واقعہ دوران نبوت سے پہلے کا ہے اور احتمال یہ ہے کہ ابتداء بلوغ یا قبل از بلوغ کا ہے۔

کچھ روایات اور تواریخ میں ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ابراہیمؑ کی نظر آسمان کے ستاروں پر پڑی تھی اور وہ رات کے نیلگوں صفحہ آسمان کو اس کے روشن اور چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ آپ کی والدہ اُن کے بچپنے سے ہی نمرود جبار کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے خوف سے ایک غار کے اندر ان کی پرورش کر رہی تھیں۔

لیکن یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کہ کوئی انسان کئی سالوں تک غار کے اندر ہی زندگی گزارتا رہے یہاں تک کہ ایک تاریک رات میں بھی اس سے باہر قدم نہ رکھا ہو۔ شاید بعض کی نظر میں اس احتمال کی تقویت (رای کوکبا) کے جملے کے سبب سے ہو کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے اس وقت تک ستارہ نہیں دیکھا تھا۔

لیکن یہ تعبیر کسی لحاظ سے بھی یہ مفہوم اپنے اندر نہیں رکھتی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے اس وقت تک ستارے، چاند اور سورج کو دیکھا تو بہت دفعہ تھا لیکن ایک محقق توحید کے طور پر یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُن پر نظر ڈالی اور ان کے طلوع و غروب کو مقام خدائی کی نفی کے ساتھ مربوط ہونے پر غور کرنے لگے۔ درحقیقت ابراہیمؑ نے انہیں بارہا دیکھا تھا لیکن اس نظر سے نہیں۔

اس بناء پر جب ابراہیمؑ یہ کہتے ہیں کہ: ھذا ربی (یہ میرا خدا ہے) تو یہ ایک قطعی خبر کے عنوان سے نہیں ہے، بلکہ یہ ایک فرض اور احتمال کے طور پر ہے اور غور و فکر کے لیے ہے۔ اس کی صحیح مثال یہ ہے کہ جس طرح ہم جب کسی حادثہ کی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو تمام احتمالات اور فروض کو ایک ایک کرکے مطالعہ کے لیے فرض کرتے چلے جاتے ہیں اور ہر ایک کے لوازم کی تحقیق کرتے ہیں تاکہ حقیقی علت کو پاسکیں اور اس قسم کی بات نہ تو کفر ہے اور نہ ہی نفی ایمان پر دلالت کرتی ہے بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ تحقیق اور بہتر سے بہتر شناسائی کا ایک طریقہ ہے اور ایمان کے بلند مراتب تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔ جیسا کہ "معاد" کے سلسلہ میں بھی حضرت ابراہیمؑ مرحلہ شہود اور اُس سے پیدا ہونے والے اطمینان تک پہنچنے کے لیے بیشتر تحقیق کے درپے ہوئے تھے۔ تفسیر عیاشی میں محمد بن مسلم کے واسطے سے امام باقرؑ یا امام صادقؑ سے اس طرح منقول ہے:

انما کان ابراهیم طالبًا لربه ولم یبلغ کفرًا وانه من فکر من الناس فی مثل ذلك فانه بمنزلته۔

ابراہیمؑ نے یہ گفتگو تحقیق کے طور پر کی تھی اور ہرگز ان کی بات کفر نہیں تھی اور لوگوں میں سے جو شخص بھی تفکر و

تحقیق کے لیے یہ بات کہے تو وہ ابراہیمؑ کی طرح ہوگا۔[1]

اس سلسلے میں دو روایات اور بھی تفسیر نور الثقلین سے نقل ہوئی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ بات ستارہ پرستوں اور سورج پرست لوگوں سے گفتگو کرتے ہوئے کی اور احتمال یہ ہے کہ بابل میں بت پرستوں کے ساتھ سخت قسم کے مقابلے اور مبارزات کرنے اور اس زمین سے شام کی طرف نکلنے کے بعد جب ان اقوام سے ان کا آمنا سامنا ہوا تو اس وقت یہ گفتگو کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ بابل میں نادان قوموں کی ہٹ دھرمی کو ان کی غلط راہ و رسم میں آزما چکے تھے لہٰذا اس بنا پر کہ آفتاب و ماہتاب کے پجاریوں اور ستارہ پرستوں کو اپنی طرف متوجہ کریں، پہلے ان کے ہم صدا ہو گئے اور ستارہ پرستوں سے کہنے لگے کہ تم یہ کہتے ہو کہ یہ زہرہ ستارا میرا پروردگار ہے، بہت اچھا چلو اسے دیکھتے ہیں یہاں تک کہ اس عقیدے کا انجام تمہارے سامنے پیش کروں۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس ستارے کا چمکدار چہرہ افق کے تاریک پردے کے پیچھے چھپ گیا، یہ وہ مقام تھا کہ ابراہیمؑ کے ہاتھ میں ایک محکم ہتھیار آگیا اور وہ کہنے لگے میں تو کبھی ایسے معبود کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر "ھذا ربی" کا مفہوم یہ ہے کہ تمہارے عقیدے کے مطابق یہ میرا خدا ہے، یا یہ کہ آپ نے بطور استفہام فرمایا: کیا یہ میرا خدا ہے؟ اس سلسلے میں بھی ایک حدیث تفسیر نور الثقلین اور دیگر تفاسیر میں عیون اخبار الرضاؑ سے نقل ہوئی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا توحید پر استدلال

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کے غروب ہونے سے ان کی ربوبیت کی نفی پر کس طرح سے استدلال کیا؟

ممکن ہے کہ یہ استدلال تین طریقوں سے ہو۔

۱۔ موجودات کا پروردگار اور مربی (جیسا کہ لفظ "رب" سے معلوم ہوتا ہے) ایسا ہونا چاہیے کہ جس کا مخلوقات کے ساتھ ہمیشہ قریبی ربط ہو کہ ایک لحظہ کے لیے بھی اُن سے جدا نہ ہو، اس بنا پر وہ موجود جو غروب ہو جائے اور کئی ساعت تک اپنے نور و برکت کو ختم کیے رکھے اور بہت سے موجودات سے بالکل بیگانہ ہو جائے، ان کا پروردگار اور رب کس طرح ہو سکتا ہے؟

۲۔ وہ موجود جو غروب و طلوع کرنے والا ہے وہ قوانین کے چنگل کا اسیر ہے، وہ چیز جو خود ان قوانین کی محکوم ہے وہ ان پر حاکم اور ان کی مالک کس طرح ہو سکتی ہے۔ وہ خود ایک کمزور مخلوق ہے اور ان کے تابع فرمان ہے اور اُن سے انحراف اور تخلف کی کم سے کم توانائی بھی نہیں رکھتی۔

۳۔ جو موجود حرکت رکھتا ہے وہ یقیناً ایک حادث موجود ہے کیونکہ جیسا کہ فلسفہ میں تفصیل کے ساتھ ثابت

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۳۸۔

ہو چکا ہے کہ حرکت ہر مقام پر حدوث کی دلیل ہے کیونکہ حرکت خود ایک قسم کا وجود حادث ہے اور وہ چیز جو معرضِ حوادث میں ہے یعنی حرکت رکھتی ہے وہ ایک ازلی وابدی وجود نہیں ہو سکتی۔ (غور کیجئے)۔

چند اہم نکات

۱۔ زیرِ بحث آیت میں لفظ "کذالك" (اسی طرح سے) اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح سے ہم نے ابراہیمؑ کی عقل وخرد کے لیے بت پرستی کے مضرات ونقائص واضح کیے تھے اسی طرح سے آسمان وزمین پر خدا کی حکومت ومالکیت کی بھی ہم نے اُسے نشاندہی کرائی، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تجھے اپنی قدرت وحکومت کے آثار آسمانوں پر دکھائے اسی طرح ابراہیمؑ کو ہم نے دکھائے تھے تاکہ ان کے ذریعے وہ خدا سے زیادہ آشنا ہو جائے۔

۲۔ " جن " (مادہ "جن" بروزن "فن" سے) کسی چیز کو چھپانے کے معنی میں ہے اور زیرِ بحث آیت میں جملہ کا معنی یہ ہے کہ "جب رات نے ابراہیمؑ سے موجودات کا چہرہ چھپا دیا" اور یہ جو دیوانہ کو مجنون کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ گویا ایک پردہ اس کی عقل پر پڑ گیا ہے اور نظر نہ آنے والے موجود کو جو جن کہتے ہیں تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔ جنین بھی بچے کے شکمِ مادر میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے اور جنت کا اطلاق بہشت اور باغ پر بھی اسی بنا پر ہے کہ اس کی زمین درختوں کے نیچے چھپی ہوئی ہوتی ہے اور دل کو جنان (بروزن زمان) اسی لیے کہتے ہیں چونکہ وہ سینہ کے اندر پوشیدہ ہے، یا یہ کہ وہ انسان کے اسرار اور رازوں کو چھپائے رکھتا ہے۔

۳۔ یہ کہ "کوکبًا" (ایک ستارہ) سے کونسا ستارہ مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین نے زہرہ یا مشتری کا ذکر کیا ہے اور کچھ تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانوں میں ان دونوں ستاروں کی پرستش کی جایا کرتی تھی اور اٰلہۃ (خداؤں) کا حصہ شمار ہوتے تھے لیکن اس حدیث میں جو امام علیؑ بن موسیٰ رضا سے عیون الاخبار میں نقل ہوئی ہے یہ تصریح ہوئی ہے کہ یہ زہرہ ستارہ تھا، تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی امام صادقؑ سے یہی بات مروی ہے[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کلدہ اور بابل کے لوگوں نے وہاں بت پرستوں کے ساتھ مقابلے اور مبارزے شروع کر رکھے تھے اور وہ ہر ایک ستارے کو خالق یا کسی خاص موجودات کا رب النوع سمجھتے تھے، "مریخ" کو رب النوع جنگ اور مشتری کو رب النوع عدل وعلم اور عطارد کو رب النوع وزراء اور آفتاب کو سب کا بادشاہ سمجھتے تھے[2]

۴۔ "بازغ" "بزغ" کے مادہ سے (بروزن نذر) ہے۔ یہ اصل میں شگاف کرنے اور خون جاری کرنے کے معنی میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۳۵، وصفحہ ۷۳۰۔
[2] تفسیر ابوالفتوح جلد چہارم صفحہ ۴۴۶ (حاشیہ)۔

استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے حیوانات کی جراحی کو بزغ کہتے ہیں۔ اس لفظ کا آفتاب یا ماہتاب کے طلوع پر اطلاق حقیقت میں ایک قسم کی خوبصورت تشبیہ ہے کیونکہ آفتاب و ماہتاب اپنے طلوع کے وقت گویا تاریکی کے پردے کو پھاڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں افق کے کنارے پر ایک ہلکی سی سرخی جو خون کے رنگ سے ملتی جلتی ہوتی ہے اپنے اطراف میں ایجاد کر لیتے ہیں۔

۵ "فطر"۔ "فطور" کے مادہ سے شگاف کرنے اور پھاڑنے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ اسی سورہ کی آیہ ۱۴ کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس لفظ کا آسمان و زمین کی پیدائش پر اطلاق شاید اس سبب سے ہو کہ موجودہ زمانے کے علم کے مطابق ابتداء میں سارا عالم ایک ہی کرہ تھا اور بعد میں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے گئے اور آسمانی کرات یکے بعد دیگرے وجود میں آتے گئے (مزید توضیح کے لیے مذکورہ آیت کی تفسیر کی طرف رجوع کیا جائے)۔

۶ "حنیف" کا معنی خالص ہے جیسا کہ اس کی تفصیل سورہ آل عمران آیہ ۶۷ کے ذیل میں جلد دوم تفسیر نمونہ صفحہ ۳۲۹ (اردو ترجمہ) میں بیان ہو چکی ہے۔

۸۰۔ وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَاۤ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

۸۱۔ وَكَیْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ عَلَیْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

۸۲۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْۤا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ۧ

۸۳۔ وَتِلْكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَیْنٰهَاۤ اِبْرٰهِیْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ۝

ترجمہ

۸۰۔ اُس (ابراہیم) کی قوم نے اُس سے حجت بازی شروع کی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں

حجت بازی کیوں کرتے ہو۔ حالانکہ خدا نے مجھے (واضح دلائل کے ساتھ) ہدایت کی ہے اور جسے تم خدا کا شریک قرار دیتے ہو میں اُس سے نہیں ڈرتا۔ (اور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا) مگر یہ کہ میرا پروردگار کچھ چاہے۔ میرے پروردگار کی آگاہی اور علم اس قدر وسیع ہے کہ وہ تمام چیزوں پر حاوی ہے، کیا تم متذکر (اور بیدار) نہیں ہوتے۔

۸۱۔ میں تمہارے بتوں سے کس طرح ڈروں جب کہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے خدا کا ایسا شریک قرار دے لیا ہے کہ جس کے بارے میں اس نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں کی (سچ بتاؤ) ان دونوں گروہوں (بت پرستوں اور خدا پرستوں) میں سے کونسا گروہ (سزا سے) امن میں رہنے کے زیادہ لائق ہے۔ اگر تم جانتے ہو۔

۸۲۔ ہاں ہاں وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کیا، ان کا انجام امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

۸۳۔ یہ ہمارے دلائل تھے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلے میں دیئے تھے۔ ہم جس شخص کے درجات کو چاہتے ہیں (اور اُسے لائق دیکھتے ہیں) اُوپر لے جاتے ہیں۔ تیرا پروردگار حکیم اور دانا ہے۔

تفسیر

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے توحیدی استدلالات کے سلسلہ میں گزر چکی ہے، ان آیات میں اُسی بحث و گفتگو کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی بت پرست قوم و جمعیت سے ہوئی تھی۔ پہلے فرمایا گیا ہے: قوم ابراہیم ان کے ساتھ گفتگو اور کج بحثی کرنے لگی (وحاجه قومه)۔

ابراہیمؑ نے ان کے جواب میں کہا: تم مجھ سے خدائے یگانہ کے سلسلے میں بحث اور مخالفت کیوں کرتے ہو حالانکہ خدا نے مجھے منطقی اور واضح دلائل کے ساتھ راہ توحید کی ہدایت کی ہے (قال اتحاجونی فی الله وقد هدان)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے بت پرستوں کی جمعیت اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ جس قیمت پر بھی ممکن ہو سکے ابراہیمؑ کو اُن کے عقیدے سے پلٹا لیں اور بت پرستی کے آئین کی طرف کھینچ لیں۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ انتہائی شجاعت و شہامت کے ساتھ ان کے مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے اور منطقی دلائل کے ساتھ سب کی باتوں کے جواب دیئے۔

یہ بات کہ وہ (بت پرست) کس منطق سے حضرت ابراہیمؑ کا مقابلہ کرتے تھے ان آیات میں صراحت کے ساتھ کوئی چیز بیان نہیں ہوئی لیکن حضرت ابراہیمؑ کے جواب سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کو اپنے خداؤں اور بتوں کے غیض و غضب اور سزا کی دھمکی دی اور ان کی مخالفت سے ڈرایا تھا، کیونکہ آیت کے آخر میں ہم حضرت ابراہیمؑ کی زبانی اس طرح پڑھتے ہیں: میں ہرگز تمہارے بتوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ ان میں یہ قدرت ہی نہیں ہے کہ کسی کو نقصان و ضرر پہنچا سکیں (ولا اخاف ما تشرکون بہٖ) نہ کوئی شخص اور کوئی چیز مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی مگر یہ کہ خدا چاہے (الا ان یشاء ربی شیئًا)[1]

گویا ابراہیمؑ اس جملے کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ ایک احتمالی پیش بندی کر لیں اور کہیں کہ اگر اس کشمکش کے دوران بالفرض مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے، تو اس کا بتوں کے ساتھ کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہوگا بلکہ اس کا تعلق مشیت الٰہی کے ساتھ ہوگا کیونکہ بے شعور و بے جان بت تو اپنے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں وہ کسی دوسرے کے نفع و نقصان کے کیا مالک ہوں گے؟

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: میرے پروردگار کا علم و دانش اس طرح ہمہ گیر و وسیع ہے کہ ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے (وسع ربی کل شیء علما)۔

یہ جملہ حقیقت میں سابقہ جملے کی ایک دلیل ہے اور وہ یہ ہے کہ بت ہرگز کوئی نفع یا نقصان پہنچا ہی نہیں سکتے، کیونکہ وہ کسی قسم کا علم و آگاہی نہیں رکھتے، اور نفع اور نقصان پہنچانے کی پہلی شرط علم و شعور اور آگاہی ہے۔ صرف وہ خدا کہ جس کے علم و دانش نے تمام چیزوں کا احاطہ کیا ہوا ہے وہی سود و زیاں بھی پہنچا سکتا ہے، تو پھر میں اس کے غیر کے غیض و غضب سے کیوں ڈروں۔

آخر میں اُن کے فکر و فہم کو بیدار کرنے کے لیے، انہیں مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: کیا ان تمام باتوں کے باوجود بھی تم متذکر اور بیدار نہیں ہوتے (افلا تتذکرون)۔

بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک اور منطق و استدلال کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ بت پرست گروہ سے کہتے ہیں: "یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں بتوں سے ڈروں اور تمہاری دھمکیوں کے مقابلہ میں اپنے اندر وحشت اور خوف پیدا کروں حالانکہ مجھے تو ان بتوں میں عقل و شعور اور قدرت کی کسی قسم کی کوئی نشانی دکھائی نہیں دیتی، لیکن تم باوجود اس کے کہ خدا کے وجود پر ایمان رکھتے ہو اور اس کی قدرت اور علم کو بھی جانتے ہو اور اس نے کسی قسم کا کوئی حکم بتوں کی پرستش کے بارے میں تمہاری طرف نازل نہیں کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود تم تو اس سے نہیں ڈرتے، تو میں

---

[1] حقیقت میں اُوپر والا استثناء، استثناء منقطع سے شباہت رکھتا ہے، کیونکہ بتوں سے نفع و نقصان کی قدرت کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے اور خدا کے لیے ثابت ہے۔ اگرچہ اس جملے کے معنی میں اور مفسرین نے اور احتمال بھی ذکر کیے ہیں، لیکن جو کچھ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

بتوں کے غضب سے کس طرح ڈروں (وکیف اخاف ما اشرکتم ولا تخافون انکم اشرکتم باللہ مالم ینزل بہ علیکم سلطانا)[1] کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بت پرست ایسے خدا کے منکر نہ تھے جو آسمان اور زمین کا خالق ہے۔ وہ تو صرف بتوں کو عبادت میں شریک کرتے تھے اور انہیں درگاہِ خداوندی میں شفیع خیال کرتے تھے۔

اب تم ہی انصاف کرو کہ میں امن و امان کا زیادہ حقدار ہوں یا تم (فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون)۔

حقیقت میں اس مقام پر ابراہیمؑ کی منطق ایک عقلی منطق ہے جو اس واقعیت کی بنیاد پر قائم ہے کہ تم مجھے بتوں کے غضب ناک ہونے کی دھمکی دے رہے ہو۔ حالانکہ ان کے وجود کی تاثیر موہوم ہے۔ لیکن تم اس عظیم خدا سے بالکل نہیں ڈرتے جسے تم اور میں دونوں قبول کرتے ہیں اور ہمیں اُس کے حکم کا پیرو ہونا چاہیئے اور اس کی طرف سے بتوں کی پرستش کا کوئی حکم نہیں پہنچا۔ تم نے ایک قطعی ویقینی امر کو تو چھوڑ رکھا ہے اور ایک موہوم چیز کے ساتھ چمٹے ہوئے ہو۔

بعد والی آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی زبانی اُس سوال کا جواب نقل ہوا ہے جو خود اُنہوں نے قبل کی آیت میں پیش کیا تھا (اور علمی استدلالات میں یہ ایک عمدہ طریقہ ہے کہ بعض اوقات استدلال کنندہ شخص مدمقابل کی طرف سے سوال کرکے پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطلب اتنا واضح ہے کہ جس کا جواب ہر شخص کو معلوم ہونا چاہیے)۔

ارشاد ہوتا ہے : وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم وستم کے ساتھ مخلوط نہیں کیا ، امن و امان بھی انہی کے لیے ہے اور ہدایت بھی انہی کے ساتھ مخصوص ہے (الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئک لھم الامن وھم مھتدون)۔

اُس روایت میں بھی جو امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے ، اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ یہ گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی بت پرستوں کے ساتھ گفتگو کا ضمیمہ ہے[2]

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ خدا کا بیان ہوگا نہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی گفتگو۔ لیکن پہلا احتمال علاوہ اس کے کہ یہ روایت میں وارد ہوا ہے ، آیات کی وضع و ترتیب کے ساتھ بھی زیادہ بہتر مطابقت رکھتا ہے لیکن یہ احتمال کہ یہ جملہ بت پرستوں کی گفتگو ہو جو حضرت ابراہیمؑ کی باتیں سننے کے بعد بیدار ہوئے ہوں بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

یہاں ظلم سے کیا مراد ہے ؟

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ یہاں "ظلم" شرک کے معنی میں ہے۔ سورۂ لقمان (کی آیہ ۱۳) میں جو یہ وارد

---

[1] سلطان کا معنی برتری و کامیابی ہے اور چونکہ دلیل و برہان کامیابی کا سبب ہوتی ہے لہٰذا بعض اوقات اُسے بھی سلطان کہتے ہیں اور اُوپر والی آیت اسی معنی میں ہے۔ یعنی بتوں کی پرستش کی اجازت کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور حقیقت میں یہ ایسا مطلب ہے جس کا کوئی بت پرست انکار نہیں کرسکتا کیونکہ اس قسم کا حکم عقل یا وحی و نبوت کے ذریعہ سے ہی معلوم ہوسکتا ہے اور ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی دلیل موجود نہیں ہے

[2] تفسیر مجمع البیان ذیل آیہ زیر بحث۔

ہوا ہے کہ "ان الشرك لظلم عظیم" (شرک ظلم عظیم ہے) کو اس معنی کا شاہد قرار دیا ہے۔

ایک روایت میں بھی ابن مسعود سے یہ نقل ہوا ہے کہ جس وقت یہ (زیر بحث) آیہ نازل ہوئی، تو یہ بات لوگوں کو بہت گراں معلوم ہوئی۔ عرض کیا اے اللہ کے رسول ایسا کون ہے کہ جس نے اپنے اوپر تھوڑا بہت ظلم نہ کیا ہو (لہٰذا یہ آیت تو سبھی کو شامل کر لیتی ہے) رسول اللہؐ نے فرمایا:

جو تم نے خیال کیا ہے اس سے وہ مراد نہیں ہے۔ کیا تم نے خدا کے صالح بندے (لقمان کا) قول نہیں سنا (جو اپنے بیٹے سے) کہتا ہے "میرے بیٹے خدا کا شریک قرار نہ دے کہ شرک ظلم عظیم ہے"[1]

لیکن چونکہ قرآن کی آیات بہت سے مواقع پر دو یا دو سے زیادہ معانی کی حامل ہوتی ہیں لہٰذا ممکن ہے کہ ان میں سے ایک معنی دوسرے معنی سے زیادہ وسیع اور عمومی ہو تو آیہ میں یہ احتمال بھی ہے کہ "امنیت" سے مراد عام امنیت ہے خواہ خدا کے عذاب سے امن و امان ہو یا اجتماعی دردناک حوادث سے امن و امان ہو۔

یعنی جنگیں ایک دوسرے پر زیادتیاں، مفاسد اور جرائم سے امان، یہاں تک کہ روحانی سکون و اطمینان صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے جب کہ انسانی معاشرے میں دو اصولوں کی حکمرانی ہو، اوّل ایمان اور دوسرے عدالت اجتماعی، اگر خدا پر ایمان کی بنیادیں ہل جائیں اور پروردگار کے سامنے جوابدہی کا احساس ختم ہو جائے اور عدالت اجتماعی کی جگہ ظلم و ستم کا دور دورہ ہو، تو ایسے معاشرے میں امن و امان ختم ہو جائے گا اور یہی سبب ہے کہ دنیا کے بہت سے مفکرین کی طرف سے دنیا میں بدامنی کی مختلف صورتوں کو ختم کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود دنیا کے لوگوں کا واقعی امن و امان سے دن بدن فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، اس کیفیت کا سبب وہی ہے کہ جس کی طرف زیر نظر آیت میں اشارہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ ایمان کی بنیادیں ہل رہی ہیں اور عدالت کی جگہ ظلم کا دور دورہ ہے۔

خاص طور پر روحانی امن و سکون میں ایمان کی تاثیر سے تو کسی کے لیے بھی تردید کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسا کہ ارتکاب ظلم سے وجدان کی پریشانی اور روحانی امن و سکون کا چھن جانا کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

بعض روایات میں بھی حضرت صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ زیر بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ:

وہ لوگ کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے مطابق اُمت اسلامی کی ولایت و رہبری کے سلسلے میں آپ کے بعد ایمان لے آئیں اور اسے دوسرے لوگوں کی ولایت و رہبری کے ساتھ مخلوط نہ کریں تو وہ امن و امان میں ہیں[2]

یہ تفسیر حقیقت میں آیہ شریفہ میں موجود مطلب کی روح اور نچوڑ پر نظر رکھتے ہوئے بیان ہوئی ہے کیونکہ اس آیت میں خدا کی ولایت و رہبری کے متعلق گفتگو ہے اور اُسے اُس کے غیر کی رہبری کے ساتھ خلط ملط نہ کرنے کے سلسلے

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۴۰۔

میں ہے اور چونکہ حضرت علی علیہ السلام کی رہبری آیہ "انما ولیکم اللہ و رسولہ" کے اقتضا کے مطابق خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رہبری کا پرتو ہے اور خدا کی طرف سے معین نہ ہونے والی رہبریاں ایسی نہیں ہیں لہٰذا اُوپر والی آیت ایک وسیع نظر سے ان سب پر محیط ہوگی، اس بناء پر اس حدیث سے مراد یہ نہیں ہے کہ آیت کا مفہوم اسی معنی میں منحصر ہے، بلکہ یہ تفسیر آیت کے اصلی مفہوم کا پرتو ہے۔

اسی لیے ہم حضرت امام صادق علیہ السلام کی ایک دوسری حدیث میں پڑھتے ہیں کہ یہ آیت خوارج جو ولیٔ خدا کی ولایت سے نکل گئے تھے اور شیطان کی ولایت و رہبری میں چلے گئے تھے، کے بارے میں بھی ہے[1]

بعد والی آیت اُن تمام بحثوں کی طرف۔ ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے توحید کے بیان اور شرک کے خلاف مبارزہ و مقابلہ کے سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ ہمارے وہ دلائل تھے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم و جمعیت کے مقابلہ میں دیئے تھے (وتلک حجتنا اٰتیناھا ابراھیم علی قومہ)۔

یہ صحیح ہے کہ اس استدلال میں منطقی پہلو بھی تھا اور ابراہیمؑ عقلی قوت اور فطری الہام کی بنا پر اُن تک پہنچے تھے لیکن چونکہ یہ قوتِ عقل اور وہ الہام فطرت سب خدا کی ہی طرف سے تھے، لہٰذا خدا ان تمام استدلالات کو اپنی نعمات میں سے شمار کر رہا ہے کہ جو ابراہیمؑ کے دل جیسے آمادہ دلوں میں منعکس ہوتے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "تلک" عربی زبان میں بعید کے لیے اسم اشارہ ہے۔ لیکن بعض اوقات موضوع کی اہمیت، اور اس کا بلند پایہ ہونا اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ ایک نزدیک کا موضوع بھی اسم اشارہ بعید سے ذکر ہو، جس کی مثال سورہ بقرہ کی ابتداء میں ہے:

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔

یہ عظیم کتاب وہ ہے کہ جس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

پھر اس بحث کی تکمیل کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم جس کے درجات کو چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں (نرفع درجات من نشاء)۔

لیکن اس غرض سے کہ کوئی اشتباہ واقع نہ ہو۔ کہ لوگ یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ خدا اس درجے کے بلند کرنے میں کسی تبعیض سے کام لیتا ہے، قرآن فرماتا ہے: تیرا پروردگار حکیم اور عالم ہے اور وہ جو درجات عطا فرماتا ہے وہ ان کی لیاقت و قابلیت سے آگاہی اور میزان حکمت کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جب تک کوئی شخص لائق اور قابل نہ ہو اُس سے بہرہ مند نہیں ہوگا (ان ربک حکیم علیم)۔

---

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۳۸۔

[2] "درجہ" کے بارے میں اور اس کے اور "درک" کے درمیان فرق کے بارے میں ہم سورۂ نساء آیہ ۱۴۵ جلد چہارم صفحہ ۱۴۹ میں بحث کر چکے ہیں۔

۸۴۔ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۙ۝

۸۵۔ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۙ۝

۸۶۔ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۙ۝

۸۷۔ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

ترجمہ

۸۴۔ اور ہم نے اُسے (ابراہیمؑ کو) اسحاق ویعقوب عطا کیے اور ہم نے ہر ایک کو ہدایت کی، اور نوح کو (بھی) ہم نے (ان سے) پہلے ہدایت کی تھی، اور اس کی ذریت واولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسٰی اور ہارون کو (ہم نے ہدایت کی) اور ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے جزا دیتے ہیں۔

۸۵۔ اور (اسی طرح) زکریا، یحیٰی، عیسٰی اور الیاس سب کے سب صالحین میں سے تھے۔

۸۶۔ اور اسماعیل، الیسع، یونس اور ہر ایک کو ہم نے عالمین پر فضیلت دی۔

۸۷۔ اور ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے کچھ افراد کو ہم نے برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست کی ہدایت کی۔

تفسیر

ان آیات میں اُن نعمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو عطا کی تھیں، اور وہ نعمت ہے صالح اولاد اور آبرومند اور لائق نسل جو نعمات الٰہی میں سے ایک عظیم ترین نعمت ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاق اور یعقوب (فرزند اسحاق) عطا کیے (وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ)

اور اگر یہاں ابراہیمؑ کے دوسرے فرزند اسماعیل کی طرف اشارہ نہیں ہوا بلکہ بحث کے دوران کہیں ذکر آیا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اسحاق کا سارہ جیسی بانجھ ماں سے پیدا ہونا، وہ بھی بڑھاپے کی عمر میں، بہت عجیب و غریب امر اور ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔

پھر اس چیز کو بیان کرنے کے لیے کہ ان دونوں کا افتخار صرف پیغمبر زادہ ہونے کے پہلو سے نہیں تھا، بلکہ وہ ذاتی طور پر بھی فکر صحیح اور عمل صالح کے سائے میں نور ہدایت کو اپنے دل میں جاگزیں کیے ہوئے تھے، قرآن کہتا ہے: ان میں سے ہر ایک کو ہم نے ہدایت کی (کلًا ھدینا)۔

اس کے بعد یہ بتانے کے لیے کہ کہیں یہ تصور نہ ہو کہ ابراہیمؑ سے قبل کے دور میں کوئی علم بردارِ توحید نہیں تھا اور یہ کام بس انہی کے زمانے سے شروع ہوا ہے مزید کہتا ہے: اس سے پہلے ہم نے نوحؑ کی بھی ہدایت و رہبری کی تھی (و نوحا ھدینا من قبل)۔

اور ہم جانتے ہیں کہ نوحؑ پہلے اولوالعزم پیغمبر ہیں جو آئین و شریعت کے حامل تھے اور وہ پیغمبران اولوالعزم کے سلسلے کی پہلی کڑی تھے۔

حقیقت میں حضرت نوحؑ کی حیثیت اور ان کے مقام کی طرف اشارہ کرکے کہ جو حضرت ابراہیمؑ کے اجداد میں سے ہیں، اور اسی طرح پیغمبروں کے اس گروہ کے مقام کا تذکرہ کرکے کہ جو ابراہیمؑ کی اولاد اور ذریت میں سے تھے، حضرت ابراہیمؑ کی ممتاز حیثیت کو وراثت، اصل اور ثمرہ کے حوالے سے مشخص کیا گیا ہے۔

اور اس کے بعد بہت سے انبیاء کے نام گنوائے ہیں جو ذریت ابراہیمؑ میں سے تھے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: ابراہیمؑ کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون تھے (و من ذریتہ داؤد و سلیمان و ایوب و یوسف و موسٰی و ھارون) اور اس جملے کے ساتھ کہ: "اس قسم کے نیکوکاروں کو ہم جزا دیں گے" واضح کرتا ہے کہ ان کا مقام و حیثیت ان کے اعمال و کردار کی بنا پر تھا (وکذلک نجزی المحسنین)۔

اس سلسلے میں کہ "من ذریتہ" (اس کی اولاد میں سے) کی ضمیر کس کی طرف لوٹتی ہے، ابراہیمؑ کی طرف یا نوحؑ کی طرف، مفسرین کے درمیان بہت اختلاف ہے لیکن زیادہ تر مفسرین ابراہیمؑ کی طرف لوٹاتے ہیں اور ظاہراً اس بات کی تردید نہیں کرنا چاہیے کہ مرجع ضمیر ابراہیمؑ ہیں کیونکہ آیت کی بحث ان خدائی نعمات کے بارے میں ہے جو ابراہیمؑ کی نسبت سے ہوئی تھیں نہ کہ حضرت نوحؑ کے بارے میں۔ علاوہ ازیں اُن متعدد روایات سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے، جنہیں ہم بعد میں نقل کریں گے۔

صرف ایک مطلب اس بات کا سبب بنا ہے کہ بعض مفسرین نے ضمیر کو نوحؑ کی طرف لوٹایا ہے اور وہ ہے بعد کی آیات میں حضرت یونسؑ اور حضرت لوطؑ کا نام، کیونکہ تواریخ میں مشہور یہ ہے کہ یونسؑ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے نہیں تھے اور لوطؑ بھی حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔

لیکن یونسؑ کے بارے میں تمام مورخین میں اتفاق نہیں ہے، بعض انہیں بھی اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے

ہی سمجھتے ہیں [1] اور بعض انہیں انبیاء بنی اسرائیل میں سے شمار کرتے ہیں [2]

علاوہ ازیں عام طور پر مورخین نسب کی باپ کی طرف سے حفاظت کرتے ہیں لیکن اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ حضرت یونس کا بھی حضرت عیسیٰ کی طرح کہ جن کا نام مدرج بالا آیات میں ہے کا سلسلہ نسب ماں کی طرف سے حضرت ابراہیم تک پہنچتا ہو۔

باقی رہے لوط تو وہ اگرچہ ابراہیم کے فرزند نہیں تھے لیکن ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں سے تھے، تو جس طرح عربی زبان میں بعض اوقات "چچا" کو "اب" (باپ) کہا جاتا ہے اسی طرح بھتیجے اور بھانجے پر بھی ذریت اور فرزند کا اطلاق ہوتا ہے، اس طرح سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ظاہر آیات سے دست بردار ہو جائیں جو کہ ابراہیم کے بارے میں ہیں اور ضمیر کو نوح کی طرف پلٹا دیں جو یہاں موضوع سخن بھی نہیں ہیں۔

بعد کی آیت میں زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کا نام لیا گیا ہے اور مزید کہا گیا ہے کہ یہ سب صالحین میں سے تھے۔ یعنی ان کا مقام و منزلت تشریفاتی اور اجباری پہلو نہیں رکھتا تھا بلکہ انہوں نے عمل صالح کے ذریعہ بارگاہ خداوندی میں عظمت و بزرگی حاصل کی تھی (وزکریا و یحیٰی وعیسٰی و الیاس کل من الصّٰلحین)۔

بعد والی آیت میں بھی چار اور پیغمبروں اور خدائی رہنماؤں کے نام آئے ہیں اور فرمایا گیا ہے: اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط بھی، اور سب کو ہم نے عالمین پر فضیلت عطا کی (واسمٰعیل والیسع ویونس ولوطًا وکلا فضلنا علی العٰلمین)۔ اس بارے میں کہ الیسع کس قسم کا نام ہے اور پیغمبروں میں سے کون سے پیغمبر کی طرف اشارہ ہے مفسرین اور ادباء عرب کے درمیان اختلاف ہے بعض اسے ایک عبرانی نام سمجھتے ہیں جو اصل میں یوشع تھا اس کے بعد اس پر الف لام داخل ہوئے اور شین، سین سے تبدیل ہو گئی اور بعض کا نظریہ ہے کہ یہ ایک عربی نام ہے اور "یسع" سے لیا گیا ہے (جو وسعت کا فعل مضارع ہے)۔ یہ احتمال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ اسی صورت میں گذشتہ انبیاء میں سے کسی نبی کا نام تھا بہر حال وہ جناب بھی نسل ابراہیم میں سے ایک پیغمبر ہیں۔

اور آخری آیت میں مذکورہ انبیاء کے صالح آباؤ اجداد، اولاد اور بھائیوں کی طرف کہ جن کے نام یہاں پر تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیے گئے ایک کلی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے آباؤ اجداد، ان کی اولاد اور ان کے بھائیوں میں سے کچھ افراد کو ہم نے فضیلت دی، انہیں برگزیدہ کیا اور راہ راست کی ہدایت کی (ومن اٰبائهم وذریاتهم واخوانهم واجتبیناهم وهدیناهم الی صراط مستقیم)۔

چند قابل توجہ امور

۱۔ فرزندان پیغمبر۔ اوپر والی آیات میں حضرت عیسیٰ کو فرزندان ابراہیم (اور ایک احتمال کی بنا پر فرزندان نوح)

---

[1] تفسیر آلوسی جلد، صفحہ ۱۸۴۔

[2] دائرۃ المعارف فرید وجدی جلد دہم صفحہ ۱۰۵۵ (ذیل مادہ یونس)۔

میں سے شمار کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ جناب صرف ماں کی طرف سے ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔
یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ سلسلہ نسب باپ اور ماں دونوں کی طرف سے یکساں طور پر آگے بڑھتا ہے اور اسی دلیل سے پوتے اور نواسے دونوں ہی انسان کی ذریت اور فرزند شمار ہوتے ہیں۔
اسی سبب سے آئمہ اہل بیتؑ کو جو سب کے سب بیٹی کی طرف سے پیغمبر اکرمؐ تک پہنچتے ہیں ابناء رسول اللہ (فرزندان رسولؐ) کہا جاتا ہے۔
اگرچہ زمانۂ جاہلیت میں جب کہ عورت کی کوئی اہمیت نہیں تھی نسب کو صرف باپ کی طرف سے سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اس جاہلانہ فکر پر قلم بطلان پھیر دیا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لکھنے والوں میں سے بعض قلم نگار جو آئمہ اہل بیتؑ کے ساتھ صحیح لگاؤ نہیں رکھتے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس امر کا انکار کریں اور ابن رسول اللہ کہنے سے اجتناب کریں اور سنن جاہلیت کو زندہ کریں۔
اتفاق سے یہ موضوع خود آئمہ علیہم السلام کے زمانہ میں پیدا ہو چکا تھا اور انہوں نے اسی آیت کے ساتھ کہ جو ایک دندان شکن دلیل ہے، انہیں جواب دیا۔
منجملہ ان کے کتاب کافی اور تفسیر عیاشی میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:
خداوند عالم نے قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کا نسب جو کہ ماں کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتے تھے ذریت (اولاد کی اولاد) کے عنوان سے بیان کیا ہے۔
پھر آپؑ نے آیہ (ومن ذریته داؤد وسلیمان) کو آخر تک اور بعد کی آیت کو لفظ عیسیٰؑ تک تلاوت فرمایا۔
تفسیر عیاشی میں بھی ابو الاسود سے مروی ہے وہ کہتا ہے:
ایک دن حجاج نے کسی کو یحییٰ بن معمر کے پاس بھیجا جو خاندان رسالت سے محبت رکھتا تھا (اور اس سے پوچھا) کہ میں نے سنا ہے کہ تو حسنؑ اور حسینؑ کو فرزندان رسولؐ سمجھتا ہے اور اس سلسلے میں آیات قرآن سے استدلال کرتا ہے، حالانکہ میں نے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھا ہے مجھے تو کوئی ایسی آیت نہیں ملی۔ یحییٰ بن معمر نے اس کے جواب میں کہا کہ کیا تو نے سورہ انعام کی وہ آیت بھی پڑھی ہے کہ جو یہ کہتی ہے کہ "ومن ذریته داؤد وسلیمان ۔۔۔۔ ویحیی وعیسیٰ"۔ اس نے کہا کہ ہاں میں نے پڑھی ہے تو اس نے کہا کہ کیا ان آیات میں حضرت عیسیٰؑ کو ذریت ابراہیمؑ میں شمار نہیں کیا گیا ہے حالانکہ وہ باپ کی طرف سے تو ان تک نہیں پہنچتے تھے۔
عیون الاخبار میں ایک طویل حدیث ہے جس میں امام موسیٰ بن جعفرؑ کی ہارون الرشید اور موسیٰ بن مہدی سے گفتگو منقول ہے جس میں ہے:
اس (ہارون) نے امام کاظم علیہ السلام سے کہا کہ تم لوگ کس طرح کہتے ہو کہ ہم ذریت پیغمبرؐ ہیں حالانکہ پیغمبر کا کوئی بیٹا تو نہیں تھا اور نسل بیٹے سے چلتی ہے نہ کہ بیٹی سے اور تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو، امام علیہ السلام

نے جواب میں اُس سے کہا کہ اس سوال کو رہنے دے لیکن ہارون نے اصرار کیا اور کہا کہ میں کسی طرح بھی اس سوال سے صرفِ نظر نہیں کروں گا کیونکہ تم لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ سب کچھ قرآن مجید میں موجود ہے لہٰذا اس بارے میں قرآن کی کوئی آیت دکھایئے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا:

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و من ذریتہ داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسٰی وھارون وکذلک نجزی المحسنین و زکریا ویحیٰی وعیسٰی۔

اس کے بعد آپ نے سوال کیا اے ہارون عیسیٰؑ کا باپ کون تھا اس نے کہا عیسیٰؑ کا تو کوئی باپ نہیں تھا۔ فرمایا۔ تو اس بناء پر اگر وہ انبیاء کی ذریت سے ملحق ہیں تو مریم کی طرف سے ہیں۔ ہم بھی رسولِ خدا کی ذریت میں اپنی ماں فاطمہؑ کے ذریعہ سے ملحق ہیں[1]

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ بعض متعصب سنی مفسرین نے بھی یہ موضوع اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک فخرالدین رازی ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر کبیر میں لکھا ہے:

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حسنؑ و حسینؑ ذریت پیغمبرؐ ہیں کیونکہ خدا نے عیسیٰؑ کو ذریت ابراہیمؑ میں شمار کیا ہے حالانکہ وہ صرف ماں کی طرف سے ان (حضرت ابراہیمؑ) سے تعلق رکھتے ہیں[2]

تفسیر "المنار"، کا مؤلف بھی جو بعض مخصوص مذہبی مباحث میں فخر رازی سے کم متعصب نہیں ہے، فخر رازی کی اس گفتگو کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے:

اس باب میں ایک حدیث حضرت ابوبکر سے بھی صحیح بخاری میں پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے کہ آپؐ نے امام حسنؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:

ان ابنی ھٰذا سید۔

میرا یہ بیٹا سید و سردار ہے۔

یعنی آپ نے "میرا بیٹا" کے لفظ کا امام پر اطلاق فرمایا حالانکہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے نزدیک لفظ ابن (بیٹا) کا بیٹی کی اولاد پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ اسی بنا پر لوگ اولاد فاطمہؑ کو اولادِ رسولؐ اور عترت و اہل بیت رسولؐ جانتے تھے۔

بہرحال اس میں شک نہیں ہے کہ اولاد کی اولاد بیٹی کی ہو یا بیٹے کی انسان کی اولاد شمار ہوتی ہے اور اس سلسلے میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی یہ تفریق ہمارے پیغمبرؐ کے خصوصیات میں سے ہے اور اس مسئلہ کی مخالفت کا سرچشمہ سوائے تعصب یا زمانہ جاہلیت کے افکار کے اور کچھ نہیں ہے۔ اسی لیے تمام احکام اسلام میں جواز ازدواج،

---

[1] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۴۴۔

[2] تفسیر فخر رازی جلد ۱۳ صفحہ ۶۶۔

ارث وغیرہ کے قبیل سے ہیں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ مسئلہ خمس ہے جو سیادت کے ساتھ مخصوص ہے، اور ایک خاص جہت سے جو فقہ کی کتاب خمس میں بیان ہوئی ہے اس موضوع کا استثناء ہوا ہے۔

۲۔ ان پیغمبروں کے نام تین حصوں میں کیوں بیان ہوئے: بعض مفسرین نے یہ احتمال بیان کیا ہے کہ پہلا گروہ یعنی داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون، یہ چھ افراد ان پیغمبروں میں سے تھے جو مقام نبوت و رسالت کے علاوہ حکومت و سلطنت بھی رکھتے تھے، اور شاید جملہ کذلک نجزی المحسنین جو ان کے ناموں کے ذکر کے بعد آیا ہے ان فراواں نیکیوں کی وجہ سے تھا جو انہوں نے اپنی اپنی حکومت کے زمانہ میں لوگوں پر کی تھیں۔

لیکن دوسرا گروہ یعنی زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس ان انبیاء میں سے ہیں کہ جو مقام نبوت و رسالت کے علاوہ زہد و تقویٰ میں اعلیٰ نمونہ تھے۔ "کل من الصالحین" کا جملہ ان کے اسمائے گرامی کے بعد ہو سکتا ہے کہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔

اور تیسرے گروہ (کے انبیاء) یعنی اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط یہ امتیاز رکھتے تھے کہ انہوں نے بڑی بڑی ہجرتیں کیں اور دین خدا کو محکم کرنے کے لیے ہجرت کے پروگرام کو عملی شکل دی اور جملہ "کلا فضلنا علی العٰلمین" کا ذکر بھی (اس قول کی بنا پر کہ اس جملہ میں انہی چار افراد کی طرف اشارہ ہے نہ کہ ان تمام پیغمبروں کی طرف کہ جن کا ذکر ان تین آیات میں آیا ہے) ہو سکتا ہے کہ ان کے مختلف قوموں اور دنیا جہاں کے لوگوں کے درمیان سیر کی طرف اشارہ ہو۔

۳۔ انسان کی شخصیت کے تعارف میں صالح اور نیک اولاد کی اہمیت: ایک دوسرا موضوع جو زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے یہی مسئلہ ہے کیونکہ خدا شجاع و بت شکن ابراہیم کے مقام والا کے تعارف کے لیے عالم انسانیت کی عظیم شخصیتوں کا جو آپ کی اولاد میں سے مختلف زمانوں میں عالم وجود میں آئی تھیں شرح و بسط اور تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے، اس طور پر کہ ان ۲۵ انبیاء میں سے کہ جن کے نام سالم قرآن میں بیان ہوئے ہیں ان آیات میں ۱۶ نام ابراہیم کے فرزندوں اور وابستگان کے ہیں اور ایک نام ان کے اجداد میں سے آیا ہے اور یہ حقیقت میں عام مسلمانوں کے لیے ایک عظیم درس ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ ان کی اولاد اور عزیزوں کی شخصیت ان کی شخصیت کا جزء شمار ہوتی ہے لہٰذا ان سے مربوط تربیتی اور انسانی مسائل بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

۴۔ ایک اعتراض کا جواب: ممکن ہے کہ کچھ لوگ آخری آیت سے، جو یہ کہتی ہے کہ ہم نے ان کے بعض آباؤ اجداد اور اولاد اور بھائیوں کو برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست کی ہدایت کی، یہ سمجھا کریں کہ انبیاء کے آباؤ اجداد سب کے سب باایمان افراد نہیں تھے اور ان میں غیر موحد بھی ہیں۔ جیسا کہ بعض مفسرین اہل سنت نے اس آیت کے ذیل میں کہا ہے لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "اجتبیناھم و ھدیناھم" سے مراد اس تعبیر کے قرینہ سے کہ جو اسی سلسلہ آیات میں موجود ہے، مقام نبوت و رسالت ہے، یہ مشکل حل ہو جاتی ہے یعنی آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ ہم نے ان میں سے بعض کو مقام نبوت کے لیے برگزیدہ کیا، اور یہ باقی دوسروں کے موحد و

خدا پرست ہونے کی نفی نہیں ہے۔ اس سورہ کی آیہ ۹۰ میں بھی (جو اس آیت سے چند آیات بعد کی آیت ہے) ہدایت کا اطلاق مقامِ نبوت پر ہوا ہے۔[1]

۸۸۔ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

۸۹۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝

۹۰۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۸۔ یہ خدا کی ہدایت ہے کہ جو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کی ہدایت کرتا ہے اور اگر وہ مشرک ہو جائیں تو انہوں نے جو کچھ عمل کیا تھا وہ سب کا سب (ضائع اور) نابود ہو جائے گا۔

۸۹۔ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکم و نبوت عطا کی ہے اور اگر وہ اس کا انکار کریں اور کافر ہو جائیں تو (کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ) ہم نے ایسے لوگوں کو اس کا نگہبان بنایا ہے کہ جو اس کا کفر و انکار کرنے والے نہیں ہیں۔

۹۰۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہیں خدا نے ہدایت کی ہے پس تم ان کی ہدایت کی اقتدا (و پیروی) کرو (اور) یہ کہو کہ میں اس (رسالت و تبلیغ) کے بدلے میں تم سے کوئی اجر اور بدلہ نہیں مانگتا یہ رسالت تو عالمین کے لیے

---

[1] ترکیب کے لحاظ سے "من اٰبائھم" "جار مجرور" ہے کہ جس کا متعلق یا تو لفظ "فضلنا" ہے جو قبل کی آیت میں ذکر ہوا ہے، یا محذوف ہے اور بعد کا حصہ اس محذوف پر دلالت کرتا ہے اور اصل میں اس طرح تھا "اجتبیناھم من اٰبائھم" ضمناً توجہ رکھنا چاہیے کہ اوپر والی آیت میں "من" تبعیضیہ ہے۔

ایک یاد دہانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

تین اہم امتیاز

گذشتہ آیات میں خداوند تعالیٰ پیغمبروں کے مختلف گروہوں کے ناموں کے ذکر کے بعد یہاں ان کی زندگی کے کلی اور اصلی خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: یہ خدا کی ہدایت ہے کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے ہدایت ورہبری کرتا ہے (ذلک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء من عبادہ) یعنی اگرچہ وہ صالح اور نیک لوگ تھے اور عقل وفکر کی قوت اور اپنے تمام وجود کے ساتھ ہدایت کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے لیکن پھر بھی اگر توفیق الٰہی ان کے شامل حال نہ ہوتی اور اس کی مہربانی کا ہاتھ ان کی دستگیری کرتے ہوئے انہیں سہارا نہ دیتا تو اُن سب کے بارے میں بھی اور ہر شخص کے لیے لغزش کا امکان موجود تھا اور موجود ہے۔ پھر اس بنا پر کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ انہوں نے اس راہ میں مجبوراً قدم اٹھایا ہے اور اسی طرح کوئی یہ تصور بھی نہ کرے کہ خداوند تعالیٰ ان کے بارے میں ایک استثنائی اور بغیر کسی دلیل اور وجہ کے کوئی خاص نظر رکھتا تھا فرماتا ہے: اگر فرض کریں کہ پیغمبر اس مقام وحیثیت کے باوجود جو وہ رکھتے تھے مشرک ہوجاتے تو ان کے تمام اعمال حبط ہوجاتے (ولو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون)۔

یعنی اُن کے لیے بھی وہی قوانین الٰہی جاری ہیں جو دوسروں کے بارے میں جاری ہوتے ہیں اور کوئی استثناء کسی کے لیے نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں تین اہم امتیازات وخصوصیات کی طرف جو انبیاء کے تمام امتیازات کی بنیاد ہیں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ ایسے لوگ تھے کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب عطا کی اور مقام حکم بھی اور نبوت بھی (اولئک الذین اٰتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ)۔

البتہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ سب صاحبِ کتاب تھے بلکہ چونکہ گفتگو ان سب کے متعلق ہو رہی ہے لہٰذا اجتماعی طور پر سب کی طرف کتاب کی نسبت دی گئی اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں کتاب میں علماء اور ان کی کتب کا تعارف کرایا گیا ہے، یعنی ان کی کتب کہ جنہوں نے کوئی کتاب لکھی ہے۔

ضمنی طور پر اس بارے میں کہ "حکم" سے کیا مراد ہے تین احتمال پائے جاتے ہیں:

۱۔ حکم کا مفہوم: یہ لفظ یہاں عقل وفہم وادراک کے معنی میں ہے یعنی اس کے علاوہ کہ ہم نے انہیں آسمانی کتاب دی ہے اس کو سمجھنے کی قدرت بھی انہیں بخشی ہے کیونکہ کتاب کا وجود قوی و کامل ادراک وفہم کے بغیر کوئی اثر نہیں رکھتا۔

۲۔ منصب قضاوت: یعنی وہ اُن آسمانی قوانین کے سائے میں جو کتاب الہٰی میں تھے، لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکتے تھے اور اُن سب میں ایک قاضی اور دادرس عادل کی تمام شرائط کامل طور پر موجود تھیں۔

۳۔ حکومت وسلطنت: کیونکہ وہ مقام نبوت ورسالت کے علاوہ مقام حکومت کے بھی حامل تھے۔

اُوپر والے تمام معانی کا شاہد۔ اس کے علاوہ کہ حکم کا لغوی معنی ان تمام معانی پر منطبق ہوتا ہے۔ یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں بھی حکم ان تمام معانی میں استعمال ہوا ہے[1]

اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ اوپر والی آیت میں لفظ حکم ایک جامع معنی میں کہ جس میں تینوں اُوپر والے مفہوم موجود ہوں، استعمال ہوا ہو کیونکہ حُکم اصل میں جیسا کہ راغب "مفردات" میں کہتا ہے منع کرنے اور روکنے کے معنی میں ہے اور چونکہ عقل اشتباہات اور غلط کاریوں سے روکتی ہے، اسی طرح صحیح قضاوت وفیصلہ کرنا ظلم وستم کرنے سے منع کرتا ہے اور عادل حکومت دوسروں کی ناروا وناجائز حکومتوں کو روک دیتی ہے (لہٰذا لفظ حکم) ان تینوں (معانی) میں سے ہر ایک معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ تمام انبیاء ان تمام مقامات کے حامل نہیں تھے لیکن جب ایک گروہ کی طرف کچھ احکام کی نسبت دی جائے، تو یہ بات ضروری نہیں ہے کہ اس جماعت کے تمام افراد اُن تمام احکام کے حامل ہوں بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض ان احکام میں سے فقط بعض احکام کے ہی حامل ہوں۔ لہٰذا کتاب آسمانی کا موضوع جو صرف مذکورہ معدودے چند انبیاء کے بارے میں تھا، مندرجہ بالا آیت کے سمجھنے میں ہمارے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر یہ گروہ یعنی مشرکین، اہلِ مکہ اور ان جیسے لوگ ان حقائق کو قبول نہ کریں تو تیری دعوت جواب کے بغیر نہیں رہے گی کیونکہ ہم نے ایک گروہ کو اس امر پر مامور کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اُسے قبول کریں بلکہ اس کی حفاظت ونگہبانی بھی کریں۔ وہ ایسا گروہ ہے کہ جو (ایمان لانے کے بعد) کفر کے راستے پر گامزن نہ ہوں گے اور حق کے سامنے سر تسلیم خم رکھیں گے (فان یکفر بھا ھٰؤلاء فقد وکلنا بھا قوما لیسوا بھا بکافرین)۔

تفسیر "المنار" اور تفسیر روح المعانی" میں بعض مفسرین سے نقل ہوا ہے کہ اس جماعت سے مراد ایرانی ہیں (کہ جنہوں نے بہت جلدی اسلام قبول کیا اور اس کی پیش رفت میں اپنی ساری توانائیوں کے ساتھ کوشاں رہے اور ان کے علماء اور دانشمندوں نے مختلف اسلامی فنون میں بہت زیادہ کتابیں لکھی ہیں)[2]

---

[1] سورۂ لقمان کی آیہ ۱۲ میں علم وفہم کے معنی میں، سورہ ص کی آیہ ۲۲ میں قضاوت کے معنی میں اور سورہ کہف کی آیہ ۲۶ میں حکومت کے معنی میں آیا ہے۔

[2] آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ "ھٰؤلاء" سے مراد خود انبیاء ہوں یعنی بفرض محال اگر یہ بزرگ انبیائے خدا ادائے رسالت

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

آخری آیت میں ان بزرگ پیغمبروں کے پروگرام (اور کارناموں) کو ہدایت کے ایک اعلیٰ نمونے کے طور پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعارف کراتے ہوئے قرآن کہتا ہے: یہ ایسے لوگ ہیں کہ ہدایت الٰہی جن کے شامل حال تھی لہٰذا تم بھی ان کی ہدایت کی اقتداء کرو (اولئك الذین هدی الله فبهداهم اقتده)[1]۔

یہ آیت دوبارہ تاکید کرتی ہے کہ تمام پیغمبروں کا اصولِ دعوت ایک ہی ہے۔ اگرچہ خصوصیات کے لحاظ سے مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات کے تناسب سے احکام فرق رکھتے تھے اور بعد کے دین و آئین قبل کے ادیان سے کامل تر ہوتے رہے اور علمی و تربیتی کلاسیں اپنے انتہائی درجے تک کہ جو آخری کورس تھا یعنی اسلام تک پہنچی ہیں۔

اس بارے میں کہ اس ہدایت سے کونسی ہدایت مراد ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کے لیے نمونہ قرار پائی ہے۔ بعض مفسرین نے تو یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد مشکلات کے مقابلہ میں صبر و پائیداری ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مقصود توحید اور تبلیغ رسالت ہے لیکن ظاہراً ہدایت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو توحید کو بھی اور دوسرے اصول اعتقادی کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور صبر و استقامت اور باقی اخلاق، تعلیم اور تربیت کے اصول بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ زیر نظر آیت اس بات کے منافی نہیں کہ اسلام تمام گذشتہ ادیان و شرائع کا ناسخ ہے کیونکہ نسخ تو صرف احکام کے ایک حصہ کے لیے ہوتا ہے نہ کہ آن کی دعوت کے کلی اصول منسوخ ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ لوگوں سے یہ کہہ دیں کہ: میں تم سے اپنی رسالت کے بدلے میں کسی قسم کا کوئی اجر اور بدلے کا مطالبہ نہیں کرتا۔ جیسا کہ گذشتہ انبیاءؑ نے بھی کوئی ایسی درخواست نہیں کی تھی میں بھی انبیاءؑ کی ہمیشہ کی اس سنت کی پیروی کرتے ہوئے ان کی اقتدا کرتا ہوں (قل لا اسئلکم علیه اجرًا)۔

نہ صرف یہ کہ انبیاءؑ اور ان کی سنتِ جاوید کی اقتداء کا تقاضا یہ ہے کہ میں کسی قسم کی اجرت کا مطالبہ نہ کروں بلکہ اس سبب سے بھی کہ یہ پاک دین جو میں تمہارے لیے لایا ہوں ایک خدائی امانت ہے جو میں تمہیں سپرد کر رہا ہوں

حاشیہ بر صفحہ سابقہ: ...سے سرتابی کر لیتے، تو پھر بھی خدائی پیغام زمین پر نہ پڑا رہتا، اور ایک دوسری جماعت اسے عالمین تک پہنچانے پر مامور ہو جاتی۔ قرآن میں ایسی تعبیرات کی نظیر بھی پائی جاتی ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر ہم پڑھتے ہیں:

لئن اشرکت لیحبطن عملك. (زمر: ۶۵)؛

[1] اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ "اقتده" میں "ہ" ضمیر نہیں ہے بلکہ "ھاء سکت" ہے جو وقف کے وقت کلام میں حرف متحرک سے ملحق ہوتی ہے جیسا کہ ہمزۂ وصل استعمال ہوتا ہے کہ جو شروع کے حرف کو ساکن کے ساتھ شروع نہ کرنے کی بنا پر آغاز کلام میں لایا جاتا ہے تو جس طرح ہمزۂ وصل اتصال کلام کے وقت ساقط ہو جاتا ہے اسی طرح "ہائے سکت" بھی ساقط ہو جانی چاہیے، لیکن چونکہ یہ "ھاء" قرآن

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

تو خدائی امانت تم تک پہنچانے کا اجر اور جزاء (مانگتے) کا کوئی مفہوم ہی نہیں ہے۔

علاوہ ازیں یہ قرآن، رسالت اور ہدایت تمام عالمین کے لیے ایک صدائے بیدار باش اور یاد آوری ہے (ان ھو الا ذکری للعالمین)۔

اور اس قسم کی عمومی نعمت جو سب کے لیے ہے، نورِ آفتاب، امواج ہوا اور بارش برسنے کے مانند ہے کہ جو عمومی اور جہانی پہلو رکھتی ہے اور کبھی بھی اس کی خرید و فروخت نہیں ہوتی اور کوئی اس کے بدلے میں اجر و جزا نہیں لیتا۔ یہ ہدایت و رسالت بھی کوئی خصوصی اور اختصاصی پہلو نہیں رکھتی کہ جس کے لیے کسی بدلے کا قائل ہوا جا سکے۔

(اس جملہ کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان کا ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ اور قبل کی آیات کے ساتھ تعلق کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے)۔

ضمنی طور پر آخری جملے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ دینِ اسلام کوئی علاقائی اور قومی پہلو نہیں رکھتا بلکہ یہ ایک عالمی اور انسانی دین ہے جو ہر جگہ اور ہر شخص کے لیے ہے۔

۹۱۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِیْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِیْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِیْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِیْ خَوْضِهِمْ یَلْعَبُوْنَ ○

ترجمہ

۹۱۔ انہوں نے خدا کو جیسا کہ پہچاننا چاہیے تھا نہیں پہچانا جب کہ انہوں نے یہ کہا کہ اس نے کسی انسان پر کوئی چیز نازل نہیں کی، تم یہ کہہ دو کہ وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے، کس نے نازل کی تھی۔ وہ کتاب جو لوگوں کے لیے نور اور ہدایت تھی۔ (لیکن تم لوگوں نے) اُسے پراگندہ کر دیا ہے۔ تم اس کے کچھ حصے کو تو آشکار کرتے

حاشیہ بر صفحہ سابقہ:۔ کے رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے، البتہ رسم الخط کے ظاہر کی رعایت کرتے ہوئے، احتیاط کو اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ یہاں وقف ہو تاکہ "ھا" ظاہر ہو سکے۔

ہو اور کچھ کو پوشیدہ رکھتے ہو اور تمہیں ایسے مطالب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جن سے تم اور تمہارے آباؤ اجداد باخبر نہیں تھے۔ کہہ دو کہ خدا نے ..... اور پھر انہیں ان کی ہٹ دھرمی میں چھوڑ دو تاکہ وہ کھیل کود میں پڑے رہیں۔

شان نزول

خدا ناشناس

ابن عباس سے منقول ہے:

یہودیوں کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! کیا واقعاً خدا نے تم پر کتاب نازل کی ہے؟

پیغمبر نے فرمایا: ہاں،

وہ کہنے لگے: خدا کی قسم خدا نے کوئی کتاب بھی آسمان سے نازل نہیں کی[1]

اس آیت کی شان نزول میں کچھ اور روایات بھی نقل ہوئی ہیں اور جیسا کہ بعد میں معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وہ سب سے بہتر ہے اور زیادہ مناسب ہے۔

تفسیر

اس بارے میں کہ یہ آیت یہودیوں کے متعلق ہے یا مشرکین کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ پیغمبر اکرمؐ کی مکہ میں یہود سے گفتگو اور ملاقات نہیں تھی اور جو کچھ اُن کے ساتھ معاملہ زیادہ مدینہ میں تھا اور دوسری طرف یہ کہ سورہ انعام کہ یہ آیت جس کا جزء ہے مکی ہے، بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت استثنائی طور پر مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ کے حکم سے کسی خاص مناسبت کی وجہ سے اس مکی سورہ کے وسط میں رکھی گئی ہے اور قرآن میں اس امر کے کئی نمونے موجود ہیں۔

حقیقت مطلب واضح ہونے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ آیت کی اجمالی تفسیر کو سمجھ لیں اور اس کے بعد اس بارے میں کہ آیت کن لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اور اس کا ہدف و مقصد کیا ہے بحث کریں۔

آیت پہلے یہ کہتی ہے کہ: انہوں نے خدا کو جس طرح چاہیے اس طرح نہیں پہچانا، کیونکہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ خدا نے کوئی کتاب کسی انسان پر نازل نہیں کی (وما قدروا اللہ حق قدرہ اذ قالوا ما انزل اللہ علی بشر من شیء)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ابوالفتوح رازی اور المنار زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ تم ان کے جواب میں یہ کہو کہ وہ کتاب جو موسیٰ لائے تھے اور جو لوگوں کے لیے نور و ہدایت تھی وہ کس نے نازل کی تھی (قل من انزل الکتاب الذی جاء به موسیٰ نوراً و هدی للناس)۔

وہی کتاب کہ جسے تم نے پراگندہ صفحات میں تبدیل کر دیا ہے، اس کا کچھ حصہ جو تمہارے مفاد میں ہے (لوگوں پر) ظاہر کرتے ہو اور اس کا بہت سا حصہ جسے تم اپنے لیے مضر سمجھتے ہو (لوگوں سے) چھپاتے ہو (تجعلونه قراطیس تبدونها و تخفون کثیراً)۔

"اور اس آسمانی کتاب میں تمہیں ایسے مطالب کی تعلیم دی گئی ہے کہ جنہیں تم اور تمہارے آباؤ اجداد جانتے نہیں تھے اور خدائی تعلیم کے بغیر اُسے جان بھی نہیں سکتے تھے" (وعلمتم مالم تعلموا انتم ولا اٰباؤکم)۔

آیت کے آخر میں پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے کہ: تم صرف خدا کو یاد کرو اور انہیں ان کی باطل باتوں، ہٹ دھرمی اور کھیل کود میں چھوڑ دو کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنہوں نے کتاب الٰہی اور اس کی آیات کو کھیل بنا رکھا ہے (قل اللّٰه ثم ذرهم فی خوضهم یلعبون)۔

اب اگر یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہو اور روئے سخن یہودیوں کی طرف ہو تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ یہودیوں کی ایک جماعت تمام انبیاء پر آسمانی کتاب کے نزول کی منکر تھی تو کیا یہ ممکن ہے کہ یہودی اور تورات کی پیروی کرنے والے کتاب آسمانی کے نزول کا انکار کریں۔ جی ہاں! اگر آپ تعجب نہ کریں تو ایک خاص مطلب کی طرف توجہ کرنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم کتب عہد جدید (اناجیل) اور کتب عہد قدیم (تورات اور اس کے ساتھ وابستہ کتب) کا دقت نظر سے مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کتب میں سے کوئی بھی آسمانی لب و لہجہ نہیں رکھتی۔ یعنی خدا کے انسان سے گفتگو کرنے کا پہلو ان میں نہیں ہے، بلکہ ان سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتابیں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں اور غیر شاگرد پیروکاروں کی زبان سے تاریخ اور سیرت کی صورت میں لکھی گئی ہیں۔ اور ظاہراً موجودہ وقت کے یہودی اور عیسائی بھی اس مطلب کا انکار نہیں کرتے کیونکہ ان کتابوں میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی وفات کی داستان اور بہت سے ایسے واقعات جو ان کے بعد کے زمانے سے مربوط ہیں لکھے ہوئے ہیں یہ (واقعات) پیش گوئی کے طور پر نہیں بلکہ گزرے ہوئے زمانے کی ایک خبر کے طور پر ہیں۔ کیا یہ بات ممکن ہے کہ ایسی کتاب حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی ہو؟

زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتابیں چونکہ ایسے انسانوں کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہیں جو وحی آسمانی سے باخبر تھے لہٰذا یہ کتب مقدس، قابل اعتماد اور اشتباہ سے پاک ہیں۔

تو اس نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کے لب و لہجہ سے کہ جو خدا کے پیغمبر سے اور بندوں سے خطاب کی شکل میں ہے کیوں تعجب کرتے تھے؟ اور اوپر والی شانِ نزول میں بھی ہم نے پڑھا ہے کہ انہوں نے تعجب کے ساتھ آپ سے پوچھا کہ کیا خدا نے آسمانی کتاب نازل کی ہے، اور پھر انہوں نے اس امر کا کلی طور پر انکار کیا ہے کہ کوئی کتاب خدا کی طرف سے کسی انسان پر حتیٰ کہ موسیٰؑ پر بھی نازل ہوئی ہے۔

لیکن خدا ان کے جواب میں اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تم خود یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ الواح اور کچھ مطالب موسیٰ پر نازل ہوئے تھے۔ یعنی جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اگر وہ کتاب آسمانی نہیں ہے تو کم از کم یہ تو تم قبول کرتے ہو کہ اس قسم کی کوئی چیز خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھی کہ جس کے کچھ حصّہ تو تم آشکار کرتے ہو اور زیادہ تر حصّہ چھپاتے ہو۔

اس طرح سے اس بارے میں کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا کہ یہ کہا جائے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہودی کتاب آسمانی کے نزول کے منکر ہوں۔

اور اگر یہ آیت اس سورہ کی باقی آیات کی طرح مشرکین کے بارے میں ہو تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ ہر قسم کی آسمانی کتاب کے نزول کے منکر ہو گئے تھے تاکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کا انکار کر سکیں، لیکن خدا ان کے لیے یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ وہ اس قسم کا دعویٰ کریں حالانکہ خدا نے تورات موسیٰ پر نازل کی، اور مشرکین اگرچہ دینِ یہود قبول نہیں کرتے تھے لیکن وہ گذشتہ انبیاء کو اور حضرت ابراہیم کو یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کو احتمالاً ایک خاص علاقے اور زمانے کے پیغمبر کے طور پر قبول کرتے تھے اور خود کو دینِ ابراہیم کا پیروکار سمجھتے تھے۔ اسی لیے جب پیغمبر اسلام نے ظہور کیا تو وہ ان کی علامات کی جستجو کے لیے اہلِ کتاب کے پاس گئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی کتب کا مطالعہ کریں اور تحقیق کریں کہ کیا وہ اس قسم کے پیغمبر کی خبر دیتی ہیں، تو اگر وہ ان کتب کو بالکل قبول نہ کرتے ہوتے تو کس طرح ممکن تھا کہ وہ اس قسم کی درخواست کریں لہٰذا وہ یہود سے سوال کرنے کے بعد جو کچھ اُن کے فائدے میں تھا اُسے ظاہر کرتے اور جو اُن کے لیے مضر تھا اُسے مخفی رکھتے (مثل پیغمبر کی اُن نشانیوں کے جو گذشتہ کتب میں آئی تھیں) لیکن پہلی تفسیر آیہ کے لب ولہجہ، شان نزول اور اُن ضمائر کے ساتھ جو آیت میں ہیں زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ قراطیس: یہ جمع ہے "قرطاس" کی اور اس کی اصل جیسا کہ بعض نے کہا ہے یونانی زبان سے لی گئی ہے۔ اس کا معنی جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں کہا ہے "ہر وہ چیز ہے کہ جس کے اُوپر لکھا جائے": اس بنا پر یہ لفظ عام کاغذ، جانوروں کے چمڑے، درختوں کی چھال اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے لیے بھی کہ جن پر قدیم ایام میں خط اور کتابیں لکھتے تھے، استعمال ہوتا ہے۔

۲۔ کاغذ پر لکھنے کی مذمت: ممکن ہے کہ یہ سوال ہو کہ آیت میں یہودیوں کی مذمت کیوں کی گئی ہے کہ انہوں نے وحی آسمانی کو کاغذ وغیرہ پر لکھا تھا، یہ تو کوئی مذمت کی بات نہیں ہے۔

ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ مذمت اس لحاظ سے نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے ہے کہ وہ مطالبِ تورات کو پراگندہ کاغذات اور اسی کی مانند دوسری چیزوں کے اُوپر لکھتے تھے، پھر جو کچھ اُن کے فائدہ میں ہوتا تھا اُس کو تو وہ دوسرے لوگوں کو دکھاتے تھے اور جو ان کے نقصان میں ہوتا تھا اُسے مخفی رکھتے تھے۔

۳۔ "وما قدروا اللہ حق قدرہ" (خدا کو جس طرح چاہیے انہوں نے نہیں پہچانا اور اس کے اوصاف کو سمجھا نہیں) حقیقت میں اس نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ جو شخص خدا کو صحیح طریقے سے پہچان لے وہ یہ انکار نہیں کرسکتا کہ اس کی طرف سے رہبر و رہنما کتب آسمانی کے ساتھ نوع بشر کے لیے بھیجے گئے کیونکہ حکمت خدا کا تقاضا یہ ہے کہ:

اوّل تو اس نے انسان کو جس ہدف و مقصد کے لیے پیدا کیا ہے یعنی ہدف ارتقا، اس کے لیے جو پُرپیچ و خم راستہ اُس کے سامنے ہے اُس میں اس کی مدد کرے ورنہ بصورت دیگر اس نے غرض تخلیق کا تقاضا پورا نہیں کیا اور یہ ہدف و مقصد وحی بھیجنے، کتاب آسمانی نازل کرنے اور ہر قسم کی خطا و اشتباہ سے خالی پاک اور صحیح تعلیمات کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسرے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ خدا کی رحمت عامہ و خاصہ کا مقام اس بات کی اجازت دے دے کہ وہ انسان کو راہِ سعادت میں جہاں پر وہ ہزار ہا رکاوٹوں سے دوچار ہے اور بہت سی پھسلنے کی جگہیں اس کی راہ میں موجود ہیں، اکیلا چھوڑ دے اور اس کی دستگیری اور رہنمائی کے لیے جامع تعلیمات کے ساتھ رہبر و رہنما نہ بھیجے (اس بنا پر اس کی حکمت بھی اور اس کی رحمت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ کتب آسمانی بھیجے)۔

اس میں تو شک نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ کی کنہ ذات اور کنہ صفات کی معرفت تو کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے اور زیر بحث آیت میں ایسا کوئی نظریہ نہیں ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ خدا کی ذات اور صفات کی جتنی مقدار انسان کے لیے ممکن ہے اگر وہ حاصل ہو جائے تو اُس بات میں کوئی تردّد باقی نہیں رہے گا کہ اس قسم کا خدا اپنے بندوں کو بغیر سرپرست اور بغیر کتاب آسمانی کے نہیں چھوڑے گا۔

۹۲۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ○

ترجمہ

۹۲۔ اور یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے، یہ ایک ایسی بابرکت کتاب ہے کہ جو کتب اس سے پہلے آئی ہیں اُن سب کی تصدیق کرتی ہے (اسے ہم نے اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم لوگوں کو خدائی جزا اور ثواب کی بشارت دو) اور اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم ام القری (مکہ) اور اس کے گرد اگرد کے لوگوں کو ڈراؤ۔ جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس پر بھی ایمان لے آتے ہیں اور اپنی نمازوں کی حفاظت و

نگرانی کرتے ہیں۔

تفسیر

اُس بحث کے بعد جو گذشتہ آیت میں یہودیوں کی آسمانی کتاب کے بارے میں تھی، یہاں قرآن کی طرف جو ایک دوسری آسمانی کتاب ہے اشارہ ہوتا ہے اور حقیقت میں تورات کا ذکر قرآن کے ذکر کے لیے ایک مقدمہ کے طور پر ہے، تاکہ ایک بشر پر کتابِ آسمانی کے نزول پر تعجب نہ کریں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے (وھذا کتاب انزلناہ)۔

یہ ایک بہت ہی بابرکت کتاب ہے کیونکہ یہ طرح طرح کی خوبیوں، نیکیوں اور کامیابیوں کا سرچشمہ ہے (مبارک)۔

اس کے علاوہ ان کتابوں کی جو اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں تصدیق کرتی ہے (مصدق الذی بین یدیہ)۔

اس سے مراد کہ قرآن گذشتہ مقدس کتابوں کی تصدیق کرتا ہے یہ ہے کہ وہ تمام علامات (اور نشانیاں) جو اُن میں آئی ہیں وہ اس سے مطابقت رکھتی ہیں اور اس طرح گذشتہ دو جملوں میں قرآن کی حقانیت کی دو نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک ان نشانیوں کا موجود ہونا کہ جن کی گذشتہ کتب میں خبر دی گئی تھی اور دوسرے قرآن کریم کے خود اپنے مضامین عالیہ کہ جن میں ہر قسم کی خیر و برکت اور وسیلۂ سعادت موجود ہے۔ اس بنا پر اس کے مضامین عالیہ کے لحاظ سے بھی اور اسناد و تاریخی مدارک کی نظر سے بھی اس میں حقانیت کی واضح نشانیاں موجود ہیں۔

اس کے بعد نزول قرآن کے ہدف و مقصد کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے: ہم نے اسے اس لیے بھیجا ہے تاکہ تم ام القریٰ (مکہ) اور ان تمام لوگوں کو جو اس کے اطراف و جوانب میں رہتے ہیں، ڈراؤ اور ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے انہیں آگاہ کرو (ولتنذر ام القریٰ ومن حولھا)۔[1]

اور چونکہ "انذار" یعنی ذمہ داریوں اور فرائض کی طرف متوجہ کرنا اور ان کے ترک کرنے سے ڈرانا خصوصاً ایسے اشخاص کو جو سرکش و طغیانگر ہوں قرآن کریم کا اہم ترین پروگرام ہے، لہٰذا صرف اسی حصّے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ: وہ لوگ جو قیامت کے دن پر، حساب و کتاب پر اور اعمال کی جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر بھی ایمان لے آئیں گے اور اپنی نمازوں کی حفاظت بھی

---

[1] اس بارے میں کہ "لتنذر" کا عطف کس پر ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن زیادہ ترجوبات نظر آتی ہے یہ ہے کہ یہ ایک محذوف لفظ مثلاً "لتبشر" وغیرہ پر عطف ہو۔

کریں گے (والذین یؤمنون بالاٰخرۃ یؤمنون بہ وھم علی صلاتھم یحافظون)۔

چند قابلِ توجہ مطالب

۱۔ اسلام ایک عالمی دین ہے: قرآن کریم کی مختلف آیات اچھی طرح سے گواہی دیتی ہیں کہ اسلام ایک عالمی دین ہے۔ وہ تعبیرات جیسے:

لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ

میرا ہدف یہ ہے کہ میں تم سب کو اور اُن تمام لوگوں کو جن تک میری بات پہنچے قرآن کے ذریعے ڈراؤں (انعام - ۱۹)۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْعَالَمِينَ

یہ قرآن عالمین کے لیے تذکر و یاددہانی ہے (انعام - ۹۰)

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا

کہہ دو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ (اعراف - ۱۵۸) اور ایسی بہت سی دوسری آیات کہ جو قرآن میں بکثرت موجود ہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں اور خاص طور پر قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، یعنی اس موقع پر جب کہ اسلام ابھی اس شہر کے حدود اربعہ سے باہر نہیں نکلا تھا۔

لیکن زیرِ بحث آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبرؐ کی بعثت کا ہدف مکہ اور اس کے گرداگرد کے لوگوں کو ڈرانا اور انہیں ہدایت کرنا کیسے بیان کیا گیا ہے؟ کیا یہ اسلام کے عالمی دین ہونے کے منافی نہیں؟

اتفاق سے یہ اعتراض بعض یہودیوں اور بعض دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے نقل ہوا ہے اور انہوں نے اپنے گمان میں اسلام کے عالمی دین ہونے کے مقابلہ میں اس کو ایک محکم ہتھیار پایا ہے جو اسے ایک خاص علاقہ میں محدود کر دیتا ہے (یعنی مکہ اور اطراف مکہ)۔[۱]

جواب

دو نکات کی طرف توجہ کرنے سے یہ امر کامل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت نہ صرف یہ کہ اسلام کے عالمی ہونے کے منافی نہیں بلکہ کہا جا سکتا ہے یہ اسلام کے عالمی ہونے کی ایک دلیل ہے۔

---

[۱] تفسیر المنار جلد ۷، صفحہ ۶۲۱۔ تفسیر فی ظلال جلد ۳ صفحہ ۳۰۵ میں کچھ مستشرقین کی طرف سے یہ اعتراض نقل ہوا ہے۔

۱۔ قریہ، قرآن کی زبان میں ہر قسم کی آبادی کے معنی میں ہے چاہے وہ بڑا شہر ہو یا چھوٹا یا کوئی گاؤں، مثلاً ہم سورۂ یوسف میں یوسف کے بھائیوں کی زبان سے ان کے باپ کے سامنے ان کا بیان پڑھتے ہیں کہ:

وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا

ہم جس قریہ میں تھے اس قریہ سے پوچھ لیجئے۔ (یوسف۔ ۸۲)

اور ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ گفتگو انہوں نے مصر کے پایۂ تخت سے واپس لوٹنے اور عزیز مصر کی حکومت کی طرف سے ان کے بھائی "بنیامین" کو مصر میں روک لینے کے واقعہ کے بعد کی تھی۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اگر وہ تمام لوگ جو روئے زمین کی آبادیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم آسمان سے اور زمین سے ان پر (اپنی) برکتوں (کے دروازوں) کو کھول دیں گے (اعراف ۹۶)

یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں صرف بستیاں (گاؤں) مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے تمام دنیا کے رہائشی اور آباد علاقے مراد ہیں۔

دوسری طرف متعدد روایات میں ہے کہ زمین کی خشکی کے علاقے خانہ کعبہ کے نیچے سے بچھائے گئے تھے اور اسی وجہ سے دحو الارض (زمین کا بچھانا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ابتداء میں سیلابی بارشوں کے زیر اثر تمام کرہ زمین پانی سے ڈھکا ہوا تھا، پانی رفتہ رفتہ نیچے چلا گیا، اور زمین کے پست علاقوں میں ٹھہر گیا اور خشکیاں تدریجاً پانی کے نیچے سے سر نکالنے لگیں۔ اسلامی روایات کے مطابق زمین کا پہلا ٹکڑا جس نے پانی سے سر نکالا وہ سرزمین مکہ تھی۔

اور اگر اس زمین کی بلندی موجودہ وقت میں تمام دنیا کی زمینوں کی بلندیوں سے بلند ترین نہیں ہے تو یہ امر ہماری اس گفتگو کے منافی نہیں کیونکہ اس دن سے کئی لاکھ سال گزر چکے ہیں اور اب روئے زمین کے نقاط کی کیفیت بالکل بدل چکی ہے۔ بعض پہاڑ سمندروں کی تہوں میں چلے گئے ہیں اور بعض مقامات سمندروں کی تہوں سے نکل کر پہاڑوں کی چوٹیاں بن چکے ہیں اور یہ امر علم زمین شناسی (GEOLOGY) کے مسلمات میں سے ہے۔

۲۔ لفظ "ام" جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں ہر چیز کی اصل و اساس اور ابتداء و آغاز کے معنی میں ہے۔

اب تک جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ یہ روئے زمین کی تمام خشکیوں کے پیدا ہونے کی اصل و اساس اور ابتداء و آغاز ہے۔ تو اس بنا پر "ومن حولها" (جو اس کے گرداگرد ہیں) تمام روئے زمین کے لوگوں کے لیے ہوگا۔

گذشتہ آیات بھی اسلام کے عالمی ہونے کے بارے میں اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں۔ اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کے ایسے بہت سے خطوط جو انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں مثلاً کسریٰ و قیصر کے نام لکھے تھے جن کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد دوم صفحہ ۳۶۰ (اردو ترجمہ) پر گزر چکی ہے، اس امر کا ایک اور گواہ ہیں۔

۲ ۔ قرآن پر ایمان اور آخرت پر ایمان میں ربط: مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر بھی ایمان لے آئیں گے، یعنی وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ جہاں دوسرے جہاں کے لیے ایک مقدمہ ہے اور کھیتی یا یونیورسٹی یا تجارت خانہ کی مانند ہے۔ بہرصورت ایک سلسلۂ قوانین، لائحۂ عمل، اور آئین اور دستور اس کے لیے ناگزیر ہے اور انبیاءؑ کے آئے بغیر یہ ممکن نہیں کہ اس ہدف عالی تک پہنچ سکیں اور اس دن (آخرت) کے لیے تیاری کر سکیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ بات مدنظر رکھتے ہوئے، کہ خدا نے انسان کو اس دنیا میں تکامل و ارتقا کے لیے بھیجا ہے، اور اس کی اصلی منزل دوسرا جہان ہے اگر وہ انبیاء اور آسمانی کتب اس کے لیے نہ بھیجے تو اس نے مقصد کو ضائع کر دیا ہے اور اس طرح سے خدا و معاد پر ایمان سے نبوت انبیاء اور کتب آسمانی پر ایمان کا نتیجہ نکالا جاتا ہے (غور کیجئے)۔

۳ ۔ نماز کی اہمیت: مندرجہ بالا آیت میں تمام دینی احکام میں سے صرف نماز کی طرف اشارہ ہوا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نماز خدا سے رشتہ جوڑنے اور اس کے ساتھ ربط کا مظہر ہے اور اسی سبب سے تمام عبادات سے برتر و بالاتر ہے۔ بعض کے عقیدہ کے مطابق ان آیات کے نزول کے وقت اسلامی فریضہ فقط نماز ہی تھا[1]

۹۳۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ○

ترجمہ

۹۳۔ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ باندھے، یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی نازل کی گئی ہے حالانکہ اس پر وحی نازل نہ ہوئی ہو اور وہ شخص کہ جو یہ کہے کہ میں بھی ایسا ہی (کلام) جیسا کہ اللہ نے نازل کیا ہے نازل کروں گا اور اگر تم ان ظالموں کو اس وقت دیکھو جب کہ یہ موت کے شدائد میں گھرے ہوں گے

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷، صفحہ ۶۲۲۔

اور فرشتے ہاتھ پھیلائے انہیں کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جان (اور روح) کو باہر نکالو۔ آج تم اُن دروغ گوئیوں کے بدلے جو تم نے خدا پر باندھی تھیں اور اس کی آیات کے سامنے جو تکبر تم کیا کرتے تھے اس کے بدلے ذلیل کرنے والے عذاب دیکھو گے (اور اس دن ان کی حالت پر تمہیں افسوس ہوگا)۔

شانِ نزول

اس آیت کی شان نزول کے سلسلہ میں منابع حدیث اور کتب تفاسیر میں متعدد روایات نقل ہوئی ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن سعد نامی ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جو کاتبِ وحی تھا، پھر اس نے خیانت کی تو پیغمبرؐ نے اُسے دھتکار دیا (اور اپنے پاس سے نکال دیا) اُس کے بعد اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں بھی قرآنی آیات جیسی آیات لا سکتا ہوں۔ مفسّرین کی ایک جماعت نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت یا اس کا کچھ حصّہ مسیلمہ کذاب کے بارے میں نازل ہوا ہے کہ جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں میں سے تھا۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مسیلمہ کا قصّہ پیغمبر اکرمؐ کی عمر کے آخری زمانے کا ہے اور یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے، اس شان نزول کے طرفدار یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ یہ آیت اس سورہ کی چند دوسری آیات کی طرح مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اس سورہ کی آیات کے درمیان قرار دے دی گئی ہے۔

لیکن ہر صورت میں قرآن کی دوسری تمام آیات کی مانند کہ جو خاص حالات میں نازل ہوئی ہیں اور ان کا مضمون و مطلب کلی اور عمومی ہے اس آیت کا مضمون و مطلب بھی کلی و عمومی ہے، اور ایسے تمام مدعیان نبوت اور ان جیسے تمام لوگوں پر محیط ہے۔

تفسیر

گذشتہ آیات کے بعد کہ جن میں کسی بھی شخص پر کتب آسمانی کے نزول کی نفی کے بارے میں یہود کی گفتگو کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس آیت میں دوسرے ایسے گنہگاروں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے جو ان کے نقطۂ مقابل میں ہیں اور اپنے اوپر وحی آسمانی کے نزول کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ بالکل جھوٹ بولتے ہیں۔

حقیقت میں زیر بحث آیت میں اس قسم کے افراد کے تین گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن پہلے کہتا ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا کہ جو خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں کسی آیت کی تحریف کرتے ہیں، اور خدا کے کلاموں میں سے کسی کو بدل دیتے ہیں (ومن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبًا)۔

دوسرا گروہ ان کا ہے جو نبوت اور وحی کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ نہ وہ پیغمبر ہیں اور نہ ہی اُن پر وحی نازل

ہوتی ہے، (او قال اوحی الی ولم یوح الیہ شیٔ)۔
تیسرا گروہ ان کا ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے انکار کے طور پر یا تمسخر اور استہزا سے کہتے ہیں کہ: "ہم بھی اس قسم کی آیات نازل کر سکتے ہیں حالانکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور وہ اس کام کی کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتے (ومن قال سانزل مثل ما انزل اللہ)۔

ہاں یہ سب کے سب ستم گر ہیں اور ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہے کیونکہ وہ خدا کے بندوں پر راہ حق کو بند کر دیتے ہیں اور انہیں راستے سے ہٹا کر سرگرداں کر دیتے ہیں، اور سچے رہبروں کی ہدایت کی مخالفت کرتے ہیں، وہ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہی کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو گا کہ ایسے افراد جو رہبری کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتے وہ رہبری کا دعویٰ کریں۔ وہ بھی خدائی اور آسمانی رہبری کا۔

اگرچہ آیت مدعیان نبوت و وحی سے ربط رکھتی ہے، لیکن اس کی روح ان تمام افراد پر محیط ہے جو جھوٹ طریقہ سے کسی ایسے مقام کا دعویٰ کریں کہ جس کے وہ اہل نہیں ہیں۔

اس کے بعد اس قسم کے افراد کی دردناک سزایوں بیان کی گئی ہے: اے پیغمبر! اگر تم ان ظالموں کو اس وقت میں دیکھو جب کہ یہ موت اور جان کنی کے شدائد میں غرق ہوں گے[1] اور روح قبض کرنے والے فرشتے ہاتھ پھیلائے ہوئے ان سے کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جان کو باہر نکالو، تو تم دیکھو گے کہ ان کی حالت بہت ہی دردناک اور افسوس ناک ہے (ولو تریٰ اذ الظٰلمون فی غمرات الموت والملائکۃ باسطوا ایدیھم اخرجوا انفسکم)۔

اس حالت میں عذاب کے فرشتے ان سے کہتے ہیں: آج تم دو کاموں کی وجہ سے ذلیل و خوار کرنے والے عذاب میں گرفتار ہو گے، پہلا یہ کہ تم خدا پر جھوٹ باندھتے تھے اور دوسرا یہ کہ اس کی آیات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے (الیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تقولون علی اللہ غیر الحق وکنتم عن اٰیاتہ تستکبرون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ نبوت کے جھوٹے دعویداروں اور بناوٹی رہنماؤں اور رہبروں کا جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں آیت میں بدترین ظالم کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا ہے اور حقیقت میں اس سے بڑھ کر اور کوئی ظلم نہیں ہے کہ کسی کی فکر کو چرایا جائے اور اس کے عقیدے کو خراب کر دیا جائے اور راہ سعادت اس پر بند کر دی جائے اور اسے اپنی فکری نوآبادی بنا لیا جائے۔

۲۔ باسطوا ایدیھم کا جملہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ قبض روح کرنے والے فرشتے ہاتھ پھیلاتے ہی ان کی روح

---

[1] "غمرات" جمع ہے "غمرہ" (بروزن "ضربہ") کی جو اصل میں کسی چیز کے آثار کو ختم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد اس کثیر پانی کو جو کسی چیز کے تمام چہرہ کو چھپا دے، نیز ان شدائد، مشکلات اور مصائب کو بھی غمرہ کہا جانے لگا جو انسان کو اپنے حلق کی طرف کھینچیں۔

کو قبض کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں سزا دینے کی ابتدا کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانے کے معنی میں ہو۔

۳۔ اخرجوا انفسکم (اپنی جان اور روح کو باہر نکالو) حقیقت میں یہ قبض روح کرنے والے فرشتوں کی طرف سے اس قسم کے ظالموں کے لیے ایک قسم کی تحقیر و تذلیل ہے۔ ورنہ روح و جان کا دینا خود ظالموں کا اپنا کام نہیں ہے، بلکہ یہ ان فرشتوں ہی کا کام ہے، جیسا کہ کسی قاتل کو موت کے گھاٹ اتارتے وقت کہتے ہیں کہ اب موت کا مزہ چکھ۔ بہرحال ان کی یہ تحقیر و تذلیل اس تحقیر کے مقابلہ میں ہے کہ جو انہوں نے آیات خدا، انبیاء اور بندگان خدا کے بارے میں کی تھی۔

ضمنی طور پر یہ آیت روح کے استقلال اور جسموں سے ایک جدا گانہ شے ہونے پر ایک اور گواہ بھی ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس قسم کے گنہگاروں کی سزا جان دینے اور موت کے وقت سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔

۹۴۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ؕ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۠

ترجمہ

۹۴۔ تم سب ہماری بارگاہ میں اکیلے لوٹ کر آئے ہو اسی طرح جیسا کہ پہلے دن ہم نے تمہیں خلق کیا تھا اور جو کچھ ہم نے (دنیا میں) تمہیں عطا کیا تھا اسے (وہیں دنیا میں ہی) اپنے پس پشت ڈال آئے ہو اور وہ شفاعت کرنے والے کہ جنہیں تم اپنی شفاعت میں شریک سمجھتے تھے انہیں ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھتے۔ تمہارے پیوند اور رشتے قطع ہو گئے ہیں اور وہ تمام چیزیں کہ جنہیں تم اپنا سہارا خیال کرتے تھے وہ تم سے دور اور گم ہو گئی ہیں۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان، تفسیر طبرسی اور تفسیر آلوسی میں منقول ہے کہ مشرکین میں سے نضر بن حارث نامی ایک شخص نے

کہا کہ لات اور عزیٰ (عربوں کے دو مشہور بت) قیامت کے دن میری شفاعت کریں گے، تو اُوپر والی آیت نازل ہوئی اور اُسے اور اُس جیسے لوگوں کو جواب دیا گیا۔

تفسیر

گمشدہ لوگ

گذشتہ آیت میں موت کے آستانے پر ظالموں کے کچھ حالات کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ اس آیت میں وہ گفتگو جو خدا موت کے وقت یا میدانِ قیامت میں ورود کے وقت اُن سے کرے گا منعکس کی گئی ہے۔

ابتداء میں ارشاد ہوتا ہے: آج سب اکیلے ہی اسی طرح جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلے دن پیدا کیا تھا ہماری طرف لوٹ رہے ہو (ولقد جئتمونا فرادٰی کما خلقناکم اول مرة)۔

"اور جو مال ہم نے تمہیں (دنیا میں) بخشا تھا اور وہ زندگی میں تمہارا سہارا تھا، سب کا سب پس پشت ڈال کر خالی ہاتھ آئے ہو" (وترکتم ما خولناکم وراء ظهورکم)[1]

اسی طرح "وہ بت کہ جنہیں تم اپنے شفیع خیال کرتے تھے، اور انہیں اپنی سرنوشت میں شریک سمجھتے تھے ان میں سے کسی کو ہم تمہارے ساتھ نہیں دیکھ رہے" (وما نرٰی معکم شفعاءکم الذین زعمتم انهم فیکم شرکاء)۔

حقیقت میں تمہارا اجتماع پراگندگی سے دوچار ہو گیا اور تمام رشتے تم سے ٹوٹ گئے (لقد تقطع بینکم) اور وہ تمام سہارے جن پر تم بھروسہ کیے ہوئے تھے نابود ہو گئے اور کھو گئے (وضل عنکم ما کنتم تزعمون)۔

عرب کے مشرک اور بت پرست تین چیزوں پر تکیہ کرتے تھے۔

۱۔ وہ قبیلہ و عشیرہ کہ جس کے ساتھ وہ وابستہ ہوتے تھے۔

۲۔ وہ مال و دولت کہ جو انہوں نے اپنے لیے اکٹھا کر رکھا تھا اور

۳۔ وہ بت کہ جنہیں وہ انسان کی سرنوشت کے تعین میں خدا کا شریک اور خدا کی بارگاہ میں شفیع سمجھتے تھے۔ آیت کے تینوں جملوں میں سے ہر ایک میں ان تینوں میں سے ایک ایک بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ وہ سب موت کے وقت کس طرح انسان سے الوداع ہوتے ہیں اور اُسے تن تنہا چھوڑ جاتے ہیں۔

دو اہم نکات

۱۔ اِس آیت کا اُس آیت کے بعد کہ جس میں موت کے وقت روح قبض کرنے والے فرشتوں کی گفتگو بیان کی گئی

---

[1] خولناکم "خول" (بروزن "عمل") کے مادہ سے اصل میں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو سرپرستی، تدبیر اور ادارت کی محتاج ہو اور عام طور پر اموال اور ایسی مختلف نعمتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو خدا انسان کو بخشتا ہے۔

تھی قرار پانا اور اسی طرح "تم نے اپنے اموال پس پشت ڈال دیئے" کے جملہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب بھی موت کے وقت ان سے ہوگا لیکن یہ خطاب خدا کی طرف سے ہوگا۔ البتہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب میدان قیامت میں وارد ہونے کے بعد ہوگا۔ تاہم (اس سے) آیت کے مقصد اور ہدف اصلی میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

۲۔ یہ آیت اگرچہ مشرکین عرب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن حقیقت میں یہ ان کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتی۔

اس دن تمام رشتے، مادی تعلقات، تمام خیالی اور بناوٹی معبود، تمام سہارے جو انسان اس جہان میں اپنے لیے بنائے ہوئے تھا اور انہیں اپنی بدبختی کے دن کے لیے دوست اور مددگار خیال کرتا تھا کلی طور پر اس سے جدا ہو جائیں گے، وہ خود رہ جائیں گے اور اس کے اعمال، وہ ہوگا اور اس کا خدا، اور باقی سب درمیان سے چلے جائیں گے اور قرآن کی تعبیر کے مطابق وہ سب کے سب گم ہو جائیں گے۔ یعنی وہ اس طرح سے حقیر و پست اور ناشناس ہو جائیں گے کہ نگاہ میں ہی نہیں آئیں گے۔

۹۵۔ اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○

۹۶۔ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ○

ترجمہ

۹۵۔ خدا دانے اور گٹھلی کو چیرنے والا ہے اور زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے، یہ ہے تمہارا خدا، پس تم حق سے کیسے منحرف ہوتے ہو۔

۹۶۔ وہ صبح کو شگافتہ کرنے والا ہے، اور اس نے رات کو سکون کا باعث اور آفتاب و ماہتاب کو حساب کا ذریعہ قرار دیا ہے، یہ دانا و توانا خدا کی تقدیر ہے۔

تفسیر

طلوعِ صبح کرنے والا

دوبارہ روئے سخن مشرکین کی طرف کرتے ہوئے قرآن توحید کے دلائل کو اسرار کائنات، نظام آفرینش اور خلقت کی تعجب خیزیوں کے زندہ نمونوں اور پرکشش عبارتوں کے ساتھ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

پہلی آیت میں زمین کے تین قسم کے عجیب و غریب شاہکاروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں آسمان میں ظاہر ہونے والی تین قسموں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے کہتا ہے: خدا دانے اور گٹھلی کا چیرنے والا ہے (ان اللہ فالق الحب والنوی) "فالق" "فلق" کے مادہ سے (بروزن "فرق") کسی چیز کو شگافتہ کرنے اور اس کے ایک حصے کو دوسرے سے جدا کرنے کے معنی میں ہے[1]

"حب" "و حبۃ" غذائی دانوں کے معنی میں ہے، مثلاً گندم، جو اور وہ چیزیں جو کاٹنے کے قابل ہیں[2] البتہ بعض اوقات دوسرے گھاس پھوس کے دانوں کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

"نوی" گٹھلی کے معنی میں ہے اور یہ جو بعض کہتے ہیں کہ یہ کھجور کی گٹھلی کے ساتھ مخصوص ہے، شاید اس بنا پر ہو کہ عرب اپنے ماحول کے مخصوص حالات کی بنا پر جب یہ کلمہ استعمال کرتے تھے تو ان کی توجہ کھجور کی گٹھلی کی طرف ہوتی تھی۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعبیر میں کونسا نکتہ پوشیدہ ہے۔

اس بات پر خاص طور سے توجہ رکھنا چاہیے کہ ایک کسی پودے کی زندگی میں اہم ترین لحظہ وہی ہے جب دانہ اور گٹھلی شگافتہ ہو رہی ہو کہ جو ایک بچہ کی پیدائش کی طرح ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہونے کا زمانہ شمار ہوتا ہے اور اس لیے اس کی زندگی میں ایک اہم ترین انقلاب رونما ہوتا ہے۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ہری گھاس اور نباتات کے دانے اور گٹھلیاں اکثر بہت ہی زیادہ محکم اور مضبوط ہوتی ہیں۔

اگر کھجور کی گٹھلی اور دوسرے پھلوں مثلاً آڑو اور بعض حبوبات کی گٹھلیوں پر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ نطفہ حیاتی کہ جو حقیقت میں ایک پودا اور ایک چھوٹا سا درخت ہے بہت ہی محکم قلعہ میں محصور ہے۔ لیکن کارخانۂ آفرینش اس ناقابلِ نفوذ قلعہ کو تسلیم و رضا کی ایسی خاصیت عطا کرتا ہے اور اس نرم و نازک کونپل کو جو گٹھلی اور دانے کے اندر پرورش پاتی ہے ایسی قدرت و طاقت بخشتا ہے کہ وہ اس کی دیواروں

---

[1] و [2] مفردات راغب صفحہ ۲۸۵ اور ۱۰۵۔

کو چیر کر اس کے اندر سے سر باہر نکال کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ واقعاً یہ عالم نباتات میں ایک عجیب و غریب قسم کا حادثہ ہے کہ قرآن جس کی طرف توحید کی ایک نشانی کے طور پر اشارہ کر رہا ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ زندہ موجودات کو وہ مردہ سے باہر لاتا ہے اور مردہ موجودات کو زندہ سے (یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی)۔

حقیقت میں یہ جملہ کہ جس کی نظیر قرآن میں بارہا نظر سے گزری ہے، موت و حیات کے نظام اور ان کے ایک سے دوسرے میں تبدیل ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بعض اوقات سمندروں کی تہ میں اور جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں کی گہرائیوں میں بے جان خشک مواد سے زندگی کے طرح طرح کے چہرے تیار کر کے باہر بھیجتا ہے۔ ایسا ایسے مواد کو جن میں سے ہر ایک زہر قاتل کا کام کرتا ہے ترکیب دے کر حیات بخش مواد تیار کر لیتا ہے اور بعض اوقات اس کے برعکس طاقتور زندہ موجودات کو معمولی سی تبدیلی کے ساتھ ایک بے جان موجود میں تبدیل کر دیتا ہے۔ زندہ موجودات کی زندگی کا مسئلہ خواہ وہ موجودات نباتات سے ہوں یا حیوانات میں سے، پیچیدہ ترین مسائل میں سے ہے۔ ابھی تک انسانی علم و دانش اس کے اسرار سے پردہ نہیں اٹھا سکے اور نہ ہی اس کے پوشیدہ رازوں کو معلوم کر سکے کہ کس طرح سے طبیعی عناصر اور خشک مواد ایک عظیم حرکت کے ساتھ زندہ موجود میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ کسی دن انسان جیسے کہ ایک مشین کے پرزوں کو جوڑ کر جو پہلے سے بنے ہوئے ہوتے ہیں مشین بنا لیتا ہے اسی طرح سے مختلف طبیعی تراکیب سے استفادہ کرتے ہوئے بہت ہی پیچیدہ طریقوں کے ساتھ کوئی زندہ موجود بنا ڈالے لیکن نہ تو آج بشر کا عجز و ناتوانی اور نہ ہی آئندہ زمانے میں اس کام پر قادر ہونے کا احتمال، زندگی اور اس کے پیچیدہ نظام کے ایک عالم و قادر مبداء کی طرف سے ہونے کی بات کی اہمیت کو کم کر سکتی ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن وجود خدا کے اثبات کے لیے بارہا اسی مسئلہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ جیسے عظیم و بزرگ پیغمبر بھی نمرود اور فرعون جیسے سرکشوں کے مقابلے میں زندگی کے ظہور اور اس کی حکایت کے ذریعہ قادر و حکیم مبداء عالم کے وجود پر استدلال کرتے تھے۔

ابراہیمؑ نمرود سے کہتے ہیں:

رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۔

میرا خدا وہ ہے کہ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ (بقرہ - ۲۵۸)

حضرت موسیٰؑ فرعون کے مقابلہ میں کہتے ہیں:

وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى

میرا پروردگار وہ ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور نباتات کے طرح طرح کے جوڑے وجود میں لایا۔ (طٰہٰ - ۵۳)

البتہ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ صرف بے جان مواد سے زندہ موجودات کی پیدائش روئے زمین پر

زندگی کی پیدائش کے آغاز میں نہیں تھی۔ بلکہ اب بھی پانی اور دیگر مواد کو زندہ موجودات کے خلیوں کے ساتھ جذب کر کے حقیقت میں ان بے جان موجودات کے جسم پر لباس حیات پہنایا جاتا ہے۔ اس بناء پر وہ قانون جو آج کے علوم طبیعی کی رو سے مسلم ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ زمین کے موجودہ حالات وکوائف میں کوئی بے جان موجود جاندار موجود میں تبدیل نہیں ہو سکتا، اور جہاں کہیں بھی کوئی زندہ موجود پیدا ہوگا وہ حتماً اور یقیناً کسی دوسرے زندہ موجود کے تخم سے ہوگا، یہ نظریہ اُس سے جو کچھ ہم نے کہا ہے کوئی اختلاف نہیں رکھتا۔ (غور کیجیے گا)

ان روایات سے جو اس آیت کی تفسیر میں یا اس کی مشابہ دوسری آیات کی تفسیر میں آئمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف مادی حیات و موت ہی نہیں ہے بلکہ یہ معنوی موت و حیات کو بھی اپنے دامنِ مفہوم میں لیے ہوئے ہے[1]

ہم صاحبِ ایمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ بے ایمان آباؤ اجداد سے وجود میں آتے ہیں، اور شریر، آلودہ گناہ اور بے ایمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ وہ پاک افراد کی نسل میں سے ہیں اور وہ قانون وراثت کو اپنے ارادہ و اختیار سے توڑ رہے ہیں، جو کہ خالق کائنات کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے کہ اس نے اس قسم کی قدرت و ارادہ انسان کو بخشا ہے۔

ایک اور نکتہ کہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ "یخرج"، جو کہ فعل مضارع ہے "مخرج" کی طرح جو کہ اسم فاعل ہے استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی مردہ موجودات سے حیات کی پیدائش اور زندہ موجودات سے مُردوں کا پیدا ہونا جہانِ آفرینش کا ایک دائمی اور عمومی نظام ہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر اور مطلب کو محکم بنانے کے لیے کہا گیا ہے: یہ ہے تمہارا خدا، اور یہ ہیں اس کی لامتناہی علم و قدرت کے آثار، تو ان حالات میں تم حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہو اور وہ تمہیں باطل کی راہ کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں (ذالکم اللہ فانی تؤفکون)۔

دوسری آیت میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں تین جوی و آسمانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، پہلے کہا گیا ہے: خدا صبح کا شگافتہ کرنے والا اور طلوعِ صبح کرنے والا ہے (فالق الاصباح)۔

"فلق" (بروزن خلق) اصل میں شگاف ڈالنے کے معنی میں ہے اور یہ جو صبح کو فلق کہتے ہیں تو یہ بھی اسی مناسبت سے ہے، "اصباح" و "صبح" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔

مندرجہ بالا تعبیر بہت ہی موزوں اور خوبصورت تعبیر ہے جو یہاں استعمال ہوئی ہے۔ کیونکہ رات کی تاریکی کو ایک موٹے پردے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس کو سفید دم کی طرح کی روشنی چاک کر کے علیحدہ کر دیتی ہے اور یہ صورت صبح صادق پر بھی منطبق ہوتی ہے اور صبح کاذب پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ صبح کاذب

[1] اصولِ کافی جلد دوم باب طینۃ المؤمن والکافر، تفسیر برہان جلد اوّل صفحہ ۵۴۳۔

کم رنگ روشنی کو کہا جاتا ہے جو رات کے آخری حصہ میں ایک عمود کی شکل میں مشرق کی جانب آسمان پر پھیل جاتی ہے۔ اور وہ ایک شگاف سا ہوتا ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف رات کے تاریک و سیاہ پردے میں ظاہر ہوتا ہے اور صبح صادق کہ جو اس کے بعد طلوع کرتی ہے ایک سفید و درخشاں اور خوبصورت جھالر کی شکل میں ہوتی ہے جو ابتدا میں اُفقِ مشرق کے عرض میں آشکار ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رات کی سیاہ چادر کو نیچے کی طرف سے شمالاً جنوباً پھاڑتی ہوئی دور تک بڑھتی چلی جارہی ہے اور اُوپر کی طرف تدریجاً بڑھتے ہوئے سارے آسمان پر پھیل جاتی ہے۔

قرآن نے علاوہ اس کے کہ بارہا نعمتِ نُور و ظلمت اور نعمت شب و روز کا ذکر کیا ہے یہاں طلوعِ صبح کے مسئلہ کا حوالہ دیا ہے کہ جو خداوند تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ آسمان میں ظاہر ہونے والی روشنی زمین کی فضا کے وجود کا نتیجہ ہے (یعنی ہوا کی وہ ضخیم و دبیز تہ کہ جس نے اس کرۂ ارض کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے) کیونکہ اگر کرۂ زمین کے اطراف میں کرۂ ماہ کی طرح یہ فضا موجود نہ ہوتی تو نہ بین الطلوعین و فلق کا وجود ہوتا اور نہ ہی آغازِ شب کی سفیدی اور شفق ہوتی، بلکہ آفتاب ایک ناخواندہ مہمان کی طرح بغیر کسی اطلاع اور تمہید کے افقِ مشرق سے سر نکالتا اور اپنا خیرہ کرنے والا نور اُن آنکھوں میں جو تاریکیٔ شب کی عادی ہو چکی ہوتیں فوراً اور ایک دم چھڑک دیتا اور غروب کے وقت ایک فراری مجرم کی طرح اچانک نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا اور ایک ہی لمحہ میں تاریکی اور وحشت ناک ظلمت تمام جگہوں کو گھیر لیتی۔ لیکن فضائے زمین کا وجود اور وہ فاصلہ جو رات کی تاریکی اور دن کی روشنی کے درمیان طلوع و غروبِ آفتاب کے وقت ہوتا ہے انسان کو تدریجاً ان دو متضاد ظاہر ہونے والی چیزوں میں سے ہر ایک کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور نور سے ظلمت میں تبدیلی اور ظلمت سے نور میں تبدیلی تدریجاً اور آہستہ آہستہ بالکل پسندیدہ اور قابل برداشت صورت میں انجام پاتی ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ رات کے وقت ایک روشن اور پر نور کمرے میں جب اچانک بلب بجھ جاتا ہے تو سب کے لیے کیسی تکلیف دہ حالت ہوتی ہے۔ پھر گھنٹہ بھر بجلی نہ آئے اور پھر بغیر کسی تمہید کے بلب روشن ہو جائے تو پھر بھی ایک نئی قسم کی تکلیف سب کو لاحق ہو جاتی ہے۔ بلب کی خیرہ کرنے والی روشنی آنکھوں کو تکلیف دیتی ہے اور ہم اطراف کی چیزوں کو دیکھنے کے لیے زحمت سے دوچار ہو جاتے ہیں اور اگر ایسا ہی بار بار ہوتا رہے تو یقیناً آنکھوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ طلوع صبح کرنے والے نے اس مشکل کو نوع بشر کے لیے بہت ہی بہترین طریقے سے حل کر دیا ہے۔[1]

لیکن اس بنا پر کہیں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ طلوعِ صبح اس بات کی دلیل ہے کہ تاریکی و ظلمت ایک نامطلوب چیز ہے اور یا یہ سزا اور سلبِ نعمت ہے لہٰذا بلا فاصلہ قرآن فرماتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے "رات کو سکون و آرام کا باعث قرار دیا ہے" (وجعل اللیل سکناً)۔

---

[1] علماء ہیئت کہتے ہیں کہ طلوعِ صبح اس وقت شروع ہوتا ہے جب آفتاب مشرق کی طرف ۱۸ درجہ فاصلہ پر افق پر پہنچ جائے اور رات کی تاریکی اُس وقت تمام جگہوں کو گھیر لیتی ہے اور شفق گم ہو جاتی ہے جب سورج مغرب کی طرف ۱۸ درجہ افق میں نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ انسان نور اور روشنی میں جستجو اور کوشش کی طرف مائل ہوتا ہے، خون سطح بدن کی طرف رواں دواں ہوتا ہے اور تمام خلیے آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ روشنی میں نیند اتنی آرام دہ نہیں ہوتی لیکن ماحول جتنا تاریک ہوگا نیند اتنی ہی گہری اور آرام دہ ہوگی۔ کیونکہ تاریکی میں خون بدن کے اندر کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور خلیے ایک طرح کے آرام و استراحت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اسی سبب سے دنیائے طبیعت میں نہ صرف حیوانات بلکہ نباتات بھی رات کی تاریکی میں سو جاتے ہیں اور صبح کی پہلی شعاع کے ظاہر ہوتے ہی جنبش اور فعالیت شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مشینی دنیا کے لوگ آدھی رات کے بعد تک بیدار رہتے ہیں اور دن کو طلوعِ آفتاب کے بہت دیر بعد تک سوئے رہتے ہیں اور بدن کی صحت و سلامتی کو ضائع کر دیتے ہیں۔

اُن احادیث میں جو اہلِ بیت علیہم السلام کے طریقوں سے وارد ہوئی ہیں، ہم ایسے دستورالعمل پڑھتے ہیں جو سب کے سب یہی مفہوم لیے ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپؑ نے اپنے ایک موالی کو حکم دیا کہ رات کے ابتدائی حصّہ میں اپنا سفر جاری نہ رکھ کیونکہ خدا نے رات کو سکون و آرام کے لیے قرار دیا ہے۔ اور اسے قیام کا وقت قرار دیا ہے نہ کہ کوچ کرنے کا۔ رات کے وقت اپنے بدن کو آرام پہنچاؤ اور استراحت کرو[1]

ایک حدیث میں جو کتاب کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے آپؑ نے فرمایا:

تزوج باللیل فانه جعل اللیل سکنًا

مراسم ازدواج کو رات کے وقت قرار دے کیونکہ رات باعث سکون و آرام ہے[2]

(جیسا کہ ازدواج اور صحیح طور پر جنسی آمیزش بھی آرام بخش ہے)۔

اور کتاب کافی ہی میں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ امام علی بن الحسین علیہ السلام اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ رات کے وقت اور طلوعِ فجر سے پہلے کبھی بھی جانوروں کو ذبح نہ کریں اور فرماتے تھے:

ان الله جعل اللیل سکنا لکل شیء

خدا نے رات کو ہر چیز کے لیے راحت و آرام کا سبب قرار دیا ہے[3]

اس کے بعد خداوند تعالیٰ نے اپنی تیسری نعمت اور اپنی عظمت کی نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ: آفتاب و ماہتاب کو تمہاری زندگی میں حساب و کتاب کا ذریعہ قرار دیا ہے (والشمس و القمر حسبانًا)۔

"حسبان" (بروزن "لقمان") مصدر ہے مادہ "حساب" سے اور حساب کرنے کے معنی میں ہے۔ یہاں ممکن ہے یہ مراد ہو کہ ان دو آسمانی کرّوں کی منظم گردش اور سیر مرتب (البتہ ان کی حرکت سے مراد وہ حرکت ہے جو ہمیں نظر آتی ہے جو زمین کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے) اس بات کا سبب بنتی ہے کہ تم اپنی زندگی کے مختلف پروگراموں کو نظام و حساب کے ماتحت کر لو۔ جیسا کہ ہم اوپر والی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] و [2] و [3] تفسیر صافی ذیل آیہ۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ شاید اس جملے سے یہ مراد ہو کہ خود یہ دونوں آسمانی کرے ایک نظام کے ماتحت اور ایک حساب سے رواں دواں ہیں۔

اس بنا پر پہلی صورت میں خداوند تعالیٰ کی ایک نعمت کی طرف اشارہ ہے جو اس نے انسانوں کو دی ہے اور دوسری صورت میں توحید کی ایک نشانی اور وجودِ خدا کے اثبات کی ایک دلیل کی طرف اشارہ ہے اور ممکن ہے کہ دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو۔

بہرصورت یہ بات بہت ہی جاذبِ توجہ ہے کہ لاکھوں سال سے کرۂ زمین آفتاب کے گرد اور ماہتاب زمین کے گرد گردش کر رہا ہے اور اس کے زیر اثر ہم اہلِ زمین کی نظر میں آفتاب کی ٹکیہ فلک کے بارہ برجوں کے سامنے گردش کر رہی ہے، اور چاند کی ٹکیا اپنے منظم ہلال کے ساتھ اور تدریجی تغیر پذیری کے ساتھ اور ہر دفعہ ایک ترتیب سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ گردش اس قدر حساب شدہ ہے کہ ایک لمحہ بھر کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہم سورج کے گرد گردشِ زمین کی مسافت پر غور کریں جو ایک بیضوی شکل کے مدار میں گردش کرتی ہے جس کی شعاع متوسط ۱۵۰ لاکھ کیلو میٹر ہے، حالانکہ آفتاب کی عظیم قوتِ جاذبہ اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور اسی طرح کرۂ ماہ کہ جو خود اپنے دائرے جتنی مسافت کو شعاع متوسط کے ۳۸۴ ہزار کلو میٹر کے ساتھ طے کرتا ہے، جب کہ زمین کی عظیم قوتِ جاذبہ اسے ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ تو اس وقت ہم اس بات کی طرف متوجہ ہوں گے کہ ایک طرف سے ان کرات کی قوتِ جاذبہ ہیں اور دوسری طرف سے ان کرات کے درمیان مرکز سے گریز کی قوت میں کس قدر دقیق تعادل اور برابری برقرار ہے کہ جس سے ان کی سیر منظم میں ایک لحظہ کا وقفہ یا کوئی کمی زیادتی پیدا نہیں ہوتی اور ایسا ایک لامتناہی علم قدرت کے بغیر ممکن نہیں کہ جو اس کی نقشہ کشی بھی کرے اور اسے باریک بینی کے ساتھ جاری بھی کرے۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: یہ خدا کی اندازہ گیری ہے جو توانا بھی ہے اور دانا بھی ہے (ذالک تقدیر العزیز العلیم)۔

۹۷۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۹۷۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے قرار دیئے تاکہ تم خشکی اور دریا کی تاریکی میں اُن کے ذریعہ ہدایت حاصل کرو۔ ہم نے ان لوگوں کے لیے کہ جو جانتے ہیں (اور جو اہل فکر و نظر ہیں) اپنی نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔

تفسیر

گذشتہ آیت کے بعد کہ جس میں آفتاب و ماہتاب کی گردش کی طرف اشارہ ہوا تھا، یہاں پروردگار عالم کی ایک اور نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہارے لیے ستارے قرار دیئے ہیں تاکہ تم ان کے ذریعے صحرا اور دریا کی تاریکی میں اپنے راستوں کو اندھیری راتوں میں پالو:
(وھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمات البر والبحر)۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیاں اور دلائل اہل فکر و نظر اور اہل فہم و فراست کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں (قد فصلنا الاٰیٰة لقوم یعلمون)۔

انسان ہزار ہا سال سے آسمان کے ستاروں اور ان کے نظام سے آشنا ہے۔ اگرچہ جس قدر انسانی علم و دانش بڑھتا جا رہا ہے اسی قدر وہ اس نظام کی گہرائی میں زیادہ داخل ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ ہر زمانے میں اس کی وضع و کیفیت سے کم و بیش آشنا تھا۔ لہٰذا دریائی اور خشکی کے سفروں میں سمت کے تعین کا بہترین ذریعہ یہی ستارے تھے۔

خصوصاً وسیع و عریض سمندروں میں جہاں راستے اور منزل کے تعین کی کوئی نشانی اس کے پاس نہ ہوتی تھی، قطب نما بھی اُس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا، آسمانی ستاروں کے سوا اور کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ بھی موجود نہیں تھا یہی ستارے تھے جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کو گمراہی اور غرقاب سے نجات دیتے تھے اور انہیں منزل مقصود تک پہنچاتے تھے۔

صفحۂ آسمان پر چند رات پے در پے متواتر نگاہ کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ستاروں کی حالت و کیفیت ہر مقام پر ایک ہی جیسی ہے گویا کہ ستارے موتیوں کے دانوں کی طرح ہیں کہ جو ایک سیاہ کپڑے کے اُوپر ٹکے ہوئے ہیں اور آغاز شب سے ہی اس کپڑے کو مشرق کی طرف سے مغرب کی طرف کھینچ دیا جاتا ہے اور وہ سب کے سب اس کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور زمین کے محور کے گرد گھوم رہے ہیں۔ جب کہ ان کے درمیانی فاصلوں میں بھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ صرف ایک استثناء جو اس قانون کلی میں دکھائی دیتا ہے یہ ہے کہ کچھ ایسے ستارے بھی ہیں کہ جنہیں سیارہ کہتے ہیں اور ان کی اپنی مستقل اور مخصوص حرکات ہیں ان کی تعداد ۸ سے زیادہ نہیں ہے۔ ان میں سے ۵ آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں (عطارد، زہرہ، زحل، مریخ اور مشتری) لیکن باقی تین سیاروں (اورانوس، نپٹون اور پلوٹون) کو صرف دوربین کے ساتھ ہی دیکھا جا سکتا ہے (البتہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ زمین بھی ایک سیارہ ہی ہے جو آفتاب کے گرد گردش کرتی ہے تو ان کی مجموعی تعداد ۹ تک پہنچ جاتی ہے)۔

شاید قبل از تاریخ کے انسان بھی "ثوابت" اور "سیارات" کی وضع سے آشنا تھے کیونکہ انسان کے لیے

تاریک اور ستاروں بھری رات میں آسمان سے زیادہ دل کو بھانے والا اور جاذب نظر کوئی منظر نہیں ہے۔ اسی بنا پر بعید نہیں کہ وہ بھی اپنے راستوں کو معلوم کرنے کے لیے ستاروں سے استفادہ کرتے ہوں۔

بعض روایات سے جو اہلِ بیت علیہم السلام کے طریق سے وارد ہوئی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ستاروں سے مراد خدائی رہبر اور ہادیانِ راہ سعادت یعنی آئمہ معصومین علیہم السلام ہیں کہ جن کے وسیلے سے لوگ زندگی کی تاریکیوں میں گمراہی سے نجات پاتے ہیں اور جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی معنوی تفسیر آیت کی ظاہری اور جسمانی تفسیر کے منافی نہیں اور ہوسکتا ہے کہ آیت کی نظر دونوں ہی باتوں کی طرف ہو۔[1]

۹۸۔ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○

۹۹۔ وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۹۸۔ اور وہی ہے وہ ذات کہ جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا حالانکہ بعض انسان پائیدار ہیں (ایمان یا خلقت کامل کے لحاظ سے) اور بعض ناپائیدار، ہم نے اپنی آیات اُن لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں بیان کردی ہیں۔

۹۹۔ اور وہی وہ ذات ہے کہ جس نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے طرح طرح کے نباتات

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اوّل صفحہ ۷۵۰۔

اُگائے۔ اُن سے سبز تنے اور شاخیں نکالیں اور اُن سے ترتیب کے ساتھ چنے ہوئے دانے اور کھجور کے گچھوں سے باریک دھاگوں کے ساتھ جڑے ہوئے خوشے باہر نکالے اور طرح طرح کے انگور، زیتون، اور انار کے باغ (پیدا کیے) جو ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں اور (بعض) غیر مشابہ (ہیں) جب اُن میں پھل آتا ہے تو تم اُس میں پھل لگنے اور اُس کے پکنے کی طرف نگاہ کرو کہ اس میں صاحبانِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں۔

تفسیر

ان آیات میں بھی توحید اور خداشناسی کے دلائل ہی بیان ہوئے ہیں۔ کیونکہ قرآن انسان کو اس ہدف کے لیے کبھی آفاق اور دور دراز کے جہانوں کی سیر کراتا ہے اور کبھی اُسے اپنے وجود کے اندر سیر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اسی کے جسم و جان میں موجود خدا کی نشانیوں کی وضاحت کرتا ہے۔ تاکہ وہ خدا کو ہر جگہ اور ہر چیز میں دیکھ لے۔

پہلے کہتا ہے: وہی وہ ذات ہے کہ جس نے تمہیں ایک انسان سے پیدا کیا ہے (وھو الذی انشاکم من نفس واحدۃ)۔

یعنی تم ان گوناگوں چہروں، مختلف ذوق و افکار اور تمام جنبہ ہائے وجودی میں وسیع تنوع کے باوجود ایک ہی فرد سے پیدا ہوتے ہو۔ اور اس سے خالق و آفریدگار کی انتہائی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے ایک ہی مبدا سے یہ مختلف چہرے کس طرح پیدا کیے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس جملہ میں خلقت انسان کو "انشاء" سے تعبیر کیا ہے اور یہ لفظ جیسا کہ متونِ لغت سے معلوم ہوتا ہے ایسے ایجاد و ابداع کے معنی میں ہے کہ جس میں ترتیب و پرورش کی آمیزش ہو۔ یعنی نہ صرف یہ کہ خداوند تعالیٰ نے تمہیں بغیر کسی سابقہ تجربے کے پیدا کیا ہے بلکہ اُس نے تمہاری تربیت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھائی ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ اگر کوئی پیدا کرنے والا کسی چیز کو پیدا کرکے پھر اُسے (بے سہارا) چھوڑ دے تو اُس نے کوئی زیادہ قدرت نمائی نہیں کی۔ لیکن اگر وہ ہمیشہ کے لیے اُسے اپنی حمایت میں لے لے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی پرورش و تربیت سے غافل نہ ہو تو اس نے اپنی عظمت و رحمت کی مکمل نشاندہی کی ہے۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا جملے سے یہ تو ہم پیدا نہیں ہونا چاہیے، کہ جناب حوا ہماری پہلی ماں (بھی) آدم سے پیدا ہوئی ہیں (جیسا کہ تورات کی فصل دوم سفر تکوین میں آیا ہے) لیکن چونکہ آدم و حوا روایات اسلامی کے مطابق ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور دونوں ایک ہی جنس اور ایک ہی نوع ہیں لہٰذا نفس واحدۃ کے الفاظ اُن پر بولے گئے ہیں (ہم سورۂ نساء کی ابتدا میں بھی اس بارے میں بحث کر چکے ہیں)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: افرادِ بشر کی ایک جماعت مستقر ہے اور ایک جماعت مستودع (فمستقر و مستودع)۔

"مستقر"، مادہ "قر" (بروزن "حر") سے سردی کے معنی میں ہے اور چونکہ ایسی سردی کہ جس کی ہوا تیز اور سخت ہو وہ انسان اور دوسرے موجودات کو خانہ نشین کر دیتی ہے۔ تو یہ لفظ سکون و توقف اور کسی جگہ قرار پانے کے معنی میں آیا ہے اور "مستقر" ثابت اور پائیدار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"مستودع"، "ودع" (بروزن "منع") کے مادہ سے ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ اس بنا پر کہ ناپائیدار امور بہت جلد اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ ناپائیدار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور ودیعۃ (امانت) کو اس لیے ودیعۃ کہتے ہیں کہ اُسے اپنی جگہ ترک کرنا چاہیے اور اصلی مالک کی طرف پلٹ جانا چاہیے۔

مندرجہ بالا گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ بعض انسان پائیدار ہیں اور بعض ناپائیدار اور اس بارے میں کہ یہاں ان دونوں تعبیرات سے کیا مراد ہے مفسرین کے درمیان بہت اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن ان میں سے چند تفاسیر جو اپنی اصل حالت پر رہتے ہوئے بھی آپس میں ایک دوسرے سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور ان سب کو ہی آیت کی تفسیر کے طور پر قبول کیا جاسکتا ہے اور وہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے کہ "مستقر" سے مراد وہ انسان ہیں کہ جن کی خلقت کامل ہوئی ہے اور وہ رحم مادر میں رہے ہیں یا روئے زمین پر قدم رکھا ہے۔ اور مستودع ان افراد کی طرف اشارہ ہے جن کی خلقت ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی اور وہ نطفہ کی صورت میں آباؤ اجداد کے صلب میں ہی ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "مستقر" روحِ انسان کی طرف اشارہ ہے کہ جو ایک پائیدار و برقرار چیز ہے اور "مستودع" جسم انسانی کی طرف اشارہ ہے جو ناپائیدار اور فانی ہے۔

بعض روایات میں ان دونوں تعبیرات کے لیے ایک معنوی تفسیر بھی بیان ہوئی ہے کہ "مستقر" ان انسانوں کی طرف اشارہ ہے کہ جو پائیدار ایمان کے حامل ہیں اور "مستودع" ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ناپائیدار ایمان رکھتے ہیں[1]

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مذکورہ بالا دونوں تعبیریں نطفۂ انسان کو تشکیل دینے والے اجزائے اولیہ کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ نطفۂ انسان دو اجزاء ایک نطفہ مادہ (OVUM) اور دوسرا نطفہ نر (SPERM) سے تشکیل پاتا ہے، مادہ کا نطفہ تو رحم میں تقریباً ثابت اور مستقر ہے، لیکن نر کے نطفے متحرک جانداروں کی شکل میں اس کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہیں اور (SPERM) کا پہلا فرد جو (OVUM) تک پہنچتا ہے وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے اور باقی کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتا ہے اور یوں انسان کے تخمِ اول کی تشکیل ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ کہا گیا ہے: ہم نے اپنی نشانیوں کو ایک ایک کرکے تفصیل سے بیان کر دیا ہے تاکہ جو لوگ سمجھ دار اور صاحب ادراک ہیں وہ سمجھ لیں (قد فصلنا الآیات لقوم یفقھون)۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۵۰۔

لغت کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "فقہ" ہر قسم کے علم و فہم کو نہیں کہتے بلکہ موجودہ معلومات سے غائب کی معلومات کا کھوج نکالنے کو کہتے ہیں[1] اس بنا پر ان طرح طرح کے چہروں اور مختلف جسمانی و روحانی قیافوں کے ساتھ انسان کی خلقت کی طرف توجہ کرنا اس لائق ہے کہ نکتہ سنج افراد اس میں غور کریں اور اپنے خدا کو پہچانیں۔

دوسری آیت وہ آخری آیت ہے جو ان بحثوں کے سلسلے میں ہمیں جہانِ خلقت کے عجائبات کے ذریعے خدا شناسی کی دعوت دیتی ہے۔

شروع میں پروردگارِ عالم کی اہم ترین اور بنیادی ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت کی طرف کہ جسے تمام نعمتوں کی اصل، جڑ، بنیاد اور ماں سمجھا جاسکتا ہے اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ نباتات (سرسبز پودے) اور درختوں کا بننا اور رشد و نمو کرنا ہے، چنانچہ یہ آیت کہتی ہے: وہی وہ ذات ہے جس نے (تمہارے لیے) آسمان سے پانی نازل کیا (وھو الذی انزل من السماء ماء)۔

یہ جو کہتا ہے کہ آسمان کی طرف سے (یعنی اُوپر کی طرف سے، کیونکہ لغت عرب میں آسمان ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو اُوپر کی طرف قرار پاتی ہو) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ روئے زمین میں پانی کے جتنے بھی منابع ہیں چاہے وہ چشمے ہوں یا دریا، نہریں ہوں یا گہرے کنویں، سب کے سب آخر کار بارش کے پانی کے محتاج ہیں۔ اسی لیے بارش کی کمی اُن سب پر اثر انداز ہوتی ہے اور اگر خشک سالی طول پکڑلے تو وہ سب کے سب خشک ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد بارش کے ایک واضح اثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ: اسی کے ذریعہ سے تمام اُگنے والی چیزوں کو ہم نے زمین سے نکالا ہے (فاخرجنا بہ نبات کل شیءٍ)۔

مفسّرین نے "نبات کل شیءٍ" (ہر چیز کی گھاس) کی تفسیر میں دو احتمال کا ذکر کیا ہے۔ پہلا یہ کہ اس سے مراد ہر نوع اور ہر قسم کی ایسی نباتات ہیں جو ایک ہی پانی سے سیراب ہوتی ہیں اور ایک ہی زمین اور ایک ہی قسم کی مٹی میں پرورش پاتی ہیں اور یہ چیز آفرینش کے عجائبات میں سے ہے کہ یہ تمام قسم قسم کی نباتات اپنے خواص میں مکمل طور پر مختلف ہونے اور بعض اوقات متضاد ہونے اور مختلف شکلوں میں ہونے کے باوجود سب کی سب ایک ہی زمین میں اور ایک ہی پانی سے کیسے پرورش پاتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس سے مراد وہ نباتات ہیں جن کی ہر کسی کو حاجت اور ضرورت ہے۔ یعنی پرندوں، چوپایوں، حشرات اور دریائی و صحرائی جانوروں میں سے ہر ایک ان نباتات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اور یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ایک ہی زمین سے اور ایک ہی پانی سے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق غذا مہیا کی ہے اور یہ قدرت کا ایک عظیم شاہکار ہے کہ جو فی المثل ایک ہی معین مادے سے ایک باورچی خانہ میں ہزاروں قسم کی

---

[1] مفردات راغب صفحہ ۳۸۴۔

غذا مختلف سلیقہ اور مزاجوں کے لوگوں کے لیے مہیا کرتی ہے۔

اور اس سے بھی بڑھ کر لائق توجہ بات یہ ہے کہ نہ صرف صحراؤں کی اور خشکیوں کی گھاس اور سبزے بارش کے پانی کی برکت سے پرورش پاتے ہیں بلکہ بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی نباتات جو سمندر کے پانی کی موجوں کے درمیان اُگتی ہیں اور سمندر میں رہنے والی مچھلیوں کی عمدہ خوراک بنتی ہیں، وہ بھی نورِ آفتاب اور بارش کے قطروں کے اثر سے رشد و نمو حاصل کرتی ہیں۔ میں یہ بات بھولتا نہیں ہوں کہ خلیج فارس کے جزائر کا رہنے والا ایک شخص جو شکار کی کمی کی شکایت کر رہا تھا اس کی علت و سبب کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا کہ مچھلی کے شکار کی کمی خشک سالی کے سبب سے ہے اور وہ اس بات کا معتقد تھا کہ سمندر کے اندر بارش کے قطروں کا حیات بخش اثر خشکیوں میں بارش کے اثر سے بھی کہیں زیادہ ہے۔

اس کے بعد اس جملے کی شرح کرتے ہوئے قرآن گیہوں اور درختوں کے ایسے اہم مواقع کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو بارش کے پانی کے ذریعے پرورش پاتے ہیں پہلے کہتا ہے: ہم نے اُس (بارش کے پانی) کے ذریعہ گیہوں اور نباتات کے سبز تنوں کو زمین سے نکالا ہے اور چھوٹے سے خشک دانے سے ایسا تر و تازہ اور سرسبز تنا پیدا کیا ہے کہ جس کی لطافت (و نزاکت) اور زیبائی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے (فاخرجنا منه خضرا)[1]

"اور اُن سبز ڈنٹھلوں اور تنوں سے ایسے دانے کہ جو ایک دوسرے کے اوپر (موتیوں کی طرح) چنے ہوئے ہوتے ہیں (جیسے مکئی اور گندم کے خوشوں میں) باہر نکالتے ہیں (نخرج منه حبا متراکبا)[2]

اسی طرح اس کے ذریعے کھجور کے درختوں سے سربستہ خوشے باہر نکالتے ہیں جن کے شگفتہ ہونے کے بعد باریک اور خوبصورت دھاگے جو خرما (کھجور) کے دانوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور بوجھ کی وجہ سے نیچے کی طرف کو جھکے ہوئے ہوتے ہیں، باہر نکلتے ہیں (ومن النخل من طلعها قنوان دانية)۔

"طلع" کا معنی کھجور کا سربستہ خوشہ ہے جو ایک خوبصورت سبز رنگ کے غلاف میں لپٹا ہوتا ہے، اور اس کے شگفتہ ہونے اور پھٹ جانے سے اس کے درمیان سے باریک سے دھاگے باہر نکل آتے ہیں اور وہی دھاگے بعد میں کھجور کے خوشوں کو تشکیل دیتے ہیں۔ "قنوان"، جمع ہے "قنو" (بروزن صنف) کی جو انہی باریک اور لطیف دھاریوں اور دھاگوں کی طرف اشارہ ہے۔

"دانية" نزدیک کے معنی میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ ان دھاگوں کے ایک دوسرے کے قریب ہونے

---

[1] "خضر" بمعنی "اخضر" یعنی "سبز رنگ" ہے اس بنا پر تمام سبزوں کو یہاں تک کہ درختوں کی کونپلوں کو بھی شامل ہے لیکن اُوپر والی آیت سے چونکہ اس میں غذائی دانوں کی طرف اشارہ ہوا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خصوصیت سے زراعت مراد ہے۔

[2] "متراکب" "رکوب" کے مادہ سے "سواری" کے معنی میں ہے یعنی ایسے دانے جو ایک دوسرے پر سوار ہیں، اور زیادہ تر غذائی دانے ایسے ہی ہیں۔

کی طرف اشارہ ہو، یا زیادہ بوجھ کی وجہ سے ان کا جھکنا مراد ہو۔

اسی طرح ہم نے انگور، زیتون اور انار کے باغوں کی پرورش کی ہے (وجنات من اعناب والزیتون والرمان)۔

اس کے بعد عالم آفرینش کے ایک اور شاہکار کی طرف جس کا تعلق انہی درختوں کے ساتھ ہے اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ ایک دوسرے کے ساتھ شباہت رکھتے بھی ہیں اور نہیں بھی رکھتے (مشتبھًا وغیر متشابہ)۔

اسی سورہ کی آیہ ۱۴۱ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جس میں متشابہ اور غیر متشابہ کے وصف کا ذکر زیتون اور انار کے لیے کیا گیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیہ میں بھی مذکورہ صفت انہی دو درختوں کے بارے میں ہے [1]

یہ دونوں درخت ظاہری شکل نیز شاخوں اور پتوں کی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت زیادہ شباہت رکھتے ہیں۔ جب کہ پھل، ذائقہ اور خاصیت کے لحاظ سے ان میں بہت فرق ہے۔ ان میں سے ایک مؤثر اور قوی روغنی مادہ رکھتا ہے اور دوسرے میں ترش یا میٹھا مادہ ہوتا ہے جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ علاوہ ازیں بعض اوقات یہ دونوں درخت ایک ہی زمین میں پرورش پاتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں یعنی ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق بھی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں۔

یہ احتمال بھی اس آیت کی تفسیر میں موجود ہے کہ مندرجہ بالا عبارت میں درختوں اور پھلوں کی مختلف انواع واصناف کی طرف اشارہ ہو کہ بعض پھل اور درخت ایک دوسرے سے شباہت رکھتے ہیں اور بعض ایک دوسرے سے مختلف ہیں (یعنی ان دونوں صفات میں سے ہر ایک درختوں اور پھلوں کے ایک گروہ کے لیے ہے، لیکن پہلی تفسیر کے مطابق دونوں صفات ایک ہی چیز کے لیے تھیں)۔

اس کے بعد بحث کو پیکرِ درخت کے اعضاء سے موڑتے ہوئے اُن کے پھلوں سے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتا ہے: ایک نظر درخت کے پھل کی طرف کرو جب کہ وہ ثمر آور ہوئے، اور اسی طرح اس کے پکنے کی کیفیت کی طرف نگاہ کرو کہ ان میں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں خدا کی قدرت وحکمت کی واضح نشانیاں موجود ہیں (انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ ان فی ذالکم لاٰیات لقوم یؤمنون)۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو آج کے زمانے میں نباتات کی تحقیق کے بارے میں پھلوں کی پیدائش کی کیفیت اور ان کے پکنے کے سلسلہ میں کہا گیا ہے، وہ خاص نکتہ جس کا قرآن پھل کے بارے میں ذکر کرتا ہے واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ پھلوں کا پیدا ہونا بعینہ جانداروں میں بچہ پیدا ہونے کی طرح ہے۔ نر نطفے مخصوص ذرائع سے (ہوا کے چلنے یا حشرات وغیرہ کے سبب سے) مخصوص تھیلیوں سے جدا ہوتے ہیں اور نبات کے مادہ حصہ پر جا پڑتے ہیں۔ عمل تلقیح انجام پانے اور ان کے ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پانے کے بعد پہلا بیج تشکیل پاتا ہے

---

[1] راغب کتاب "مفردات" میں کہتا ہے مشتبھًا وغیر متشابہ، متشابھًا وغیر متشابہ، تقریباً ایک ہی معنی رکھتے ہیں۔

اور کئی قسم کے مواد غذائی اسے اطراف میں گوشت کی طرح آغوش میں لے لیتے ہیں۔ یہ مواد غذائی ساخت کے لحاظ سے بہت ہی متنوع اور مختلف ہیں۔ اسی طرح ذائقہ اور غذائی و طبی خواص کے لحاظ سے بھی بہت مختلف ہیں کبھی ایک پھل (مثلاً انار اور انگور) میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں کہ جن میں سے ہر دانہ خود جنین اور ایک درخت کا بیج شمار ہوتا ہے اور اس کی ساخت بہت ہی پیچیدہ اور اندر ہی اندر ہوتی ہے۔

انار کی ساخت

تمام پھلوں کی ساخت اور ان کے غذائی و دوائی مواد اس بحث کی گنجائش سے خارج ہیں۔ لیکن کوئی حرج نہیں ہے کہ نمونہ کے طور پر انار کے پھل کی ساخت کی طرف اشارہ کیا جائے کہ جس کی طرف قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں اشارہ کیا ہے۔

اگر ہم انار کو چیریں اور اس کا ایک چھوٹا سا دانہ ہاتھ میں لے کر اسے آفتاب یا چراغ کے سامنے رکھیں اور صحیح طور پر اس میں غور و فکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ چھوٹے چھوٹے حصوں سے بنا ہوا ہے کہ جو انتہائی چھوٹی چھوٹی شیشیوں کی مانند، انار کے پانی کی ایک خاص مقدار لیے، ایک دوسرے کے پاس چن دی گئی ہیں۔ انار کے ایک چھوٹے سے دانے میں شاید اس قسم کی سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شیشیاں موجود ہیں۔ پھر ان کے اطراف کو ایک باریک چھلکے کے ساتھ جو انار کے ایک دانے کا چھلکا ہے گھیرا ہوا ہے۔ پھر اس غرض سے کہ یہ بستہ بندی کامل تر، محکم تر اور خطرے سے دور تر رہے، انار کے دانوں کی ایک خاص تعداد کو ایک ستون پر ایک خاص نظام کے ساتھ چن دیا گیا ہے اور ایک سفید رنگ کا پردہ جو نسبتاً موٹا ہے اس کے اطراف میں لپیٹ دیا گیا ہے اور اس کے بعد ایک موٹا اور محکم چھلکا جو دونوں طرف سے خاص قسم کا لعاب رکھتا ہے ان سب کے اوپر کھینچ دیا گیا ہے تاکہ وہ ہوا اور جراثیم کے نفوذ کو بھی روکے اور ضربات سے بھی ان کی حفاظت کرے اور دانوں کے اندر موجود پانی کے بخارات بننے کے امکانات کو زیادہ سے زیادہ کم کرے۔ یہ نازک اور عمدہ بستہ بندی انار کے دانوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے، بلکہ دوسرے پھلوں مثلاً مالٹا اور لیموں وغیرہ میں بھی نظر آتی ہے لیکن انار اور انگور میں زیادہ عمدہ اور جاذب نظر ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوع بشر نے بھی سیال چیزوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لیے اسی سے سبق سیکھا ہے کہ وہ پہلے چھوٹی چھوٹی شیشیوں کو ایک چھوٹے سے ڈبے میں جوڑ دیتے ہیں اور ان کے درمیانی حصے کو ایک نرم مادہ کے ساتھ پُر کر دیتے ہیں۔ پھر ان چھوٹے ڈبوں کو ایک بڑے کارٹون میں رکھ دیتے ہیں، اور ان کے مجموعے کو ایک بڑے بنڈل کی صورت میں منزل مقصود کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

انار کے دانوں کے داخلی ستونوں پر قرار پکڑنے کی طرز اور اپنے حصّہ کا پانی اور مواد غذائی اُن سے حاصل کرنا اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ سب سے انوکھی بات یہ ہے کہ یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ جنہیں ہم اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان پھلوں کے ذرات کو (مائیکروسکوپ) دوربین کے نیچے رکھ کر دیکھیں تو اس وقت ایک پُر غوغا جہاں عجیب و غریب اور حیرت انگیز بنیادوں اور تعمیرات کے ساتھ حد سے زیادہ منظم طریقے

پر ہماری نظروں کے سامنے مجسم ہو جاتا ہے۔ تو کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص چشم حقیقت بین کے ساتھ ایک پھل کی طرف نگاہ کرے اور پھر یہ عقیدہ رکھے کہ اس کو بنانے والا علم و دانش نہیں رکھتا ؟ اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں قرآن "انظروا" (نگاہ کرو) کے لفظ کے ساتھ اس قسم کے نباتات کے بارے میں دقتِ نظر اور غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے، انہی حقائق کی طرف توجہ کرنے کے لیے ہے۔

ایک طرف سے تو یہ حقائق اور دوسری طرف سے وہ مختلف مراحل جو ایک پھل کچی حالت سے لے کر پکنے کے موقع تک طے کرتا ہے، بہت ہی قابل ملاحظہ ہے، کیونکہ پھلوں کے اندر کی لیبارٹریاں ہمیشہ کام میں مشغول رہتی ہیں اور ترتیب وار اس کی کیمیائی ترکیب میں تبدیلی کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے آخری مرحلہ تک جا پہنچے اور اس کی کیمیائی ترکیب صحیح صورت اختیار کر لے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر خالق کائنات کی عظمت و قدرت کی ایک نشانی ہے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ قرآن کی تعبیر کے مطابق صرف صاحب ایمان افراد یعنی حق بین اور حقیقت جُو ہی ان مسائل کو دیکھتے ہیں۔ ورنہ چشم عناد اور ہٹ دھرمی یا بے اعتنائی اور سہل انگاری کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہے کہ ان حقائق میں سے کسی ایک کو بھی دیکھ سکیں۔

۱۰۰۔ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝

۱۰۱۔ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

۱۰۲۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۝

۱۰۳۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

ترجمہ

۱۰۰۔ انہوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک قرار دیے ہیں، حالانکہ خدا نے اُن سب کو پیدا کیا ہے، اور انہوں

نے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں جھوٹ اور جہالت سے بنا رکھے ہیں۔ خدا اس بات سے منزہ و برتر ہے جو یہ اس کی توصیف (میں بیان) کرتے ہیں۔

۱۰۱۔ آسمانوں اور زمین کی ابداع کرنے والا (اور انہیں تازہ اور نیا وجود عطا کرنے والا) وہی ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو حالانکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے اور سب چیزوں کو اسی نے پیدا کیا ہے اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

۱۰۲۔ ہاں! ایسا ہی ہے تمہارا خدا، تمہارا پروردگار، اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ تمام چیزوں کا خالق ہے (تم صرف) اسی کی عبادت کرو، اور وہ تمام موجودات کا حافظ اور مدبر ہے۔

۱۰۳۔ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں، لیکن وہ سب آنکھوں کا ادراک رکھتا ہے، اور وہ (طرح طرح کی نعمتوں کا) عطا کرنے والا ہے (اور چھوٹے چھوٹے کاموں سے باخبر) اور (تمام چیزوں سے) آگاہ ہے۔

تفسیر

تمام چیزوں کا خالق وہی ہے

ان آیات میں مشرکین اور باطل مذاہب رکھنے والوں کے کچھ غلط اور بیہودہ عقائد بیان کیے گئے ہیں اور ان کے منطقی جواب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ جنوں میں سے خدا کے لیے شرکاء کے قائل ہو گئے ہیں (وجعلوا للہ شرکاء الجن)۔

اس بارے میں کہ یہاں پر جن سے مراد اس کا لغوی معنی یعنی حسِ انسانی سے غائب اور پوشیدہ موجودات ہیں یا خاص طور پر وہ جنات مراد ہیں کہ جن کے بارے میں قرآن نے بارہا گفتگو کی ہے اور ہم اس کی طرف عنقریب اشارہ کریں گے۔ مفسرین نے اس سلسلہ میں دو احتمال بیان کیے ہیں۔

پہلے احتمال کی بنا پر ممکن ہے کہ آیت ایسے لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو فرشتوں اور سرد کھائی نہ دینے والی چیز کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن دوسرے احتمال کی بنا پر آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو گروہ جنات کو خدا کا شریک یا اس کی بیوی سمجھتے تھے۔

"کلبی" کتاب "الاصنام" میں نقل کرتا ہے کہ عرب کے قبائل میں سے ایک قبیلہ جس کا نام "بنو ملیح" تھا کہ جو قبیلہ

"خزاعہ" کی شاخ تھا جن کی پرستش کرتا تھا[1] کہا جاتا ہے کہ "جن" کی عبادت اور اس کی الوہیت کا عقیدہ قدیم یونان اور ہندوستان کے بیہودہ اور فضول مذاہب میں بھی پایا جاتا تھا[2]

جیسا کہ سورہ صافات کی آیہ ۱۵۸ ہے:

وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا

وہ خدا اور جنات کے درمیان رشتہ داری کے قائل ہو گئے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے درمیان کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو جنوں کی خدا کے ساتھ ایک قسم کی رشتہ داری کے قائل تھے۔

اور جیسا کہ بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے کہ قریش کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے جنیات کے ساتھ شادی کی ہے اور فرشتے اس شادی کا نتیجہ اور ثمر ہیں[3]

اس کے بعد اس فضول اور بیہودہ خیال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: حالانکہ خدا نے تو انہیں (یعنی جنات کو) پیدا کیا ہے (وخلقھم) یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کی مخلوق اسی کی شریک ہو جائے کیونکہ شرکت ہم جنس اور ہم رتبہ ہونے کی علامت ہے حالانکہ مخلوق ہرگز خالق کی ہم پلہ نہیں ہو سکتی۔

دوسری بیہودہ بات یہ تھی کہ: وہ خدا کے لیے نادانی سے بیٹوں اور بیٹیوں کے قائل ہو گئے تھے (وخرقوا لہ بنین و بنات بغیر علم)۔

حقیقت میں ان بیہودہ عقائد کے باطل ہونے کی بہترین دلیل وہی ہے جو "بغیر علم" کے الفاظ سے معلوم ہوتی ہے یعنی کسی قسم کی کوئی دلیل اور نشانی ان خرافات و موہومات کے لیے اُن کے پاس موجود نہیں تھی۔

لائق توجہ بات یہ ہے کہ "خرقوا" "خرق" (بروزن عزق) کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو اصل میں کسی چیز کو بے سوچے سمجھے اور بلا وجہ پارہ پارہ کرنے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ ٹھیک لفظ "خلق" کے بالمقابل ہے جو کسی چیز کو سوچ سمجھ کر کسی حساب سے ایجاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظ (خلق اور خرق) کبھی کبھار گھڑے ہوئے اور جھوٹے مطالب کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ جھوٹ جو سوچ سمجھ کر کسی حساب سے گھڑے گئے ہوں وہ تو خلق و اخلاق کہلاتے ہیں اور وہ جھوٹ جو بغیر کسی حساب اور اندازے کے اور اصطلاح کے مطابق شاخدار جھوٹ ہوں انہیں "خرق و اختراق" کہا جاتا ہے۔

یعنی انہوں نے یہ جھوٹ اس کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کیے بغیر اور اس کے لوازم پر نظر کیے بغیر گھڑا ہے۔

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد سوم صفحہ ۳۲۶ (پاورقی) (حاشیہ)۔

[2] تفسیر المنار جلد ہشتم صفحہ ۶۴۸۔

[3] تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر زیر نظر آیہ کے ذیل میں۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کونسے گروہ تھے جو خدا کے لیے بیٹوں کے قائل تھے، قرآن نے دوسری آیات میں دو گروہوں کے نام لیے ہیں۔ ایک عیسائی جو حضرت عیسیٰؑ کے خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ رکھتے تھے اور دوسرے یہودی جو عزیرؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے اور جیسا کہ سورہ توبہ کی آیہ ۳۰ سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے اور محققین معاصر کی ایک جماعت نے بھی عیسائیت اور بدھ مذہب کے مشترک اصولوں کا خصوصاً مسئلہ تثلیث میں مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم کیا ہے کہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ عیسائیوں اور یہودیوں میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ ان سے پہلے کے فضول و بیہودہ قسم کے مذاہب میں بھی موجود تھا۔

باقی رہا خدا کی بیٹیوں کے وجود کا عقیدہ تو خود قرآن نے دوسری آیات میں اس مطلب کو واضح کیا ہے، اور فرمایا ہے کہ:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا

وہ فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں (زخرف - ۱۹)۔

جیسا کہ ہم سطور بالا میں بھی اشارہ کر چکے ہیں تفاسیر اور تواریخ میں یہ ہے کہ قریش کا ایک گروہ اس بات کا معتقد تھا کہ فرشتے خدا کی وہ اولاد ہیں جو خدا کے جنیات سے شادی کرنے کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں۔

لیکن اس آیت کے آخر میں قرآن نے ان تمام بیہودہ مطالب اور موہوم و بے بنیاد خیالات پر قلم سرخ کھینچ دیا ہے اور ایک عمدہ اور بیدار کرنے والے جملے کے ساتھ ان تمام باطل باتوں کی نفی کر دی ہے اور فرمایا ہے کہ: خدا (ان خرافات سے) منزہ ہے اور ان اوصاف سے برتر و بالاتر ہے جو وہ اس کے لیے بیان کرتے ہیں (سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون)۔

بعد والی آیت میں ان بیہودہ عقائد کا جواب دیتے ہوئے پہلے کہا گیا ہے: خدا وہ ہستی ہے کہ جس نے آسمان اور زمین کو ایجاد کیا (بدیع السمٰوات والارض)۔

آیا کوئی اور بھی ایسا ہے کہ جس نے ایسا کام کیا ہو، یا ایسا کرنے کی قدرت ہی رکھتا ہو۔ جس کی بنا پر وہ عبودیت میں اس کا شریک سمجھا جائے؟۔ نہیں! ایسا نہیں ہے، بلکہ سب اس کی مخلوق ہیں اور اسی کے تابع فرمان ہیں اور اسی کی ذات پاک کے سب محتاج ہیں۔

علاوہ ازیں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے (انی یکون له ولد ولم تکن له صاحبة)۔

اصولی طور پر اُسے بیوی کی ضرورت ہی کیا ہے اور پھر یہ بات کس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کی (بیوی یا) ہمسر ہو سکے جب کہ سب اس کی مخلوق ہیں۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر اس کی ذاتِ مقدس عوارض جسمانی سے پاک و منزہ ہے اور بیوی اور اولاد کا ہونا واضح طور پر جسمانی اور مادی عوارض میں سے ہیں۔

دوسری مرتبہ پھر تمام چیزوں اور تمام افراد کے بارے میں اسی کے خالق ہونے اور ان تمام کے متعلق اس کے

احاطۂ علمی کو بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے : اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے، اور وہ ہر چیز کا عالم ہے (وخلق کل شیءٍ وھو بکل شیءٍ علیم)۔

تیسری زیرِ بحث آیت میں تمام چیزوں کا خالق ہونے، آسمان اور زمین کو ایجاد کرنے، اور اس کے عوارضِ جسم و جسمانی اور بیوی اور اولاد سے منزہ ہونے اور ہر کام اور ہر چیز پر اس کے احاطۂ علمی کا ذکر کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ "تمہارا خدا اور پروردگار ایسی ذات ہے اور چونکہ اور کوئی ان صفات کا حامل نہیں ہے لہٰذا اس کے سوا اور کوئی بھی عبودیت کے لائق نہیں ہوسکتا۔ پروردگار بھی وہی ہے اور خالق و آفریدگار بھی وہی ہے اس بنا پر معبود بھی صرف وہی ہوسکتا ہے لہٰذا اسی کی پرستش اور عبادت کرو (ذٰلکم اللّٰہ ربکم لا الٰہ الا ھو خالق کل شیءٍ فاعبدوہ)۔

آیت کے آخر میں اس مقصد کے پیشِ نظر اور اس غرض سے کہ غیرِ خدا سے ہر قسم کی امید کو قطع کردے اور ہر قسم کے شرک کی جڑ کو اور خدا کے سوا اور کسی پر بھی بھروسہ کرنے کو کلی طور پر ختم کردے قرآن کہتا ہے : اور وہی تمام چیزوں کا حافظ و نگہبان اور مدبر ہے (وھو علیٰ کل شیءٍ وکیل)۔

اس بنا پر تمہاری مشکلات کے حل کی چابیاں صرف اسی کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے سوا کوئی بھی شخص اس کام کی توانائی نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کے سوا جو بھی ہیں وہ سب اس کے محتاج اور نیازمند ہیں اور اس کے احسان کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ تو ان حالات میں کوئی وجہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی مشکلات کسی اور کے پاس لے جائے اور ان کا حل اس سے چاہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہاں " علیٰ کل شیءٍ وکیل " کہا گیا ہے نہ کہ " لکل شیءٍ وکیل " اور ان دونوں کے درمیان فرق واضح ہے، کیونکہ لفظ " علیٰ " کا ذکر اس کے تسلط اور نفوذِ امر کی دلیل ہے جب کہ لفظ "لام" کا استعمال تابع ہونے کی نشانی ہے۔

دوسرے لفظوں میں تعبیرِ اول ولایت اور حافظ ہونے کے معنی میں ہے اور دوسری تعبیر نمائندگی کے معنی میں ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت میں تمام چیزوں پر اس کی حاکمیت اور نگہبانی کو ثابت کرنے کے لیے اور اسی طرح تمام موجودات سے اس کے فرق کو ثابت کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے : آنکھیں اُسے نہیں دیکھ سکتیں لیکن وہ تمام آنکھوں کا ادراک کرتا ہے وہ طرح طرح کی نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے اور ہر چھوٹے سے چھوٹے کام سے باخبر اور تمام چیزوں سے آگاہ ہے، وہ بندوں کے مصالح کو جانتا ہے اور ان کی حاجات و ضروریات سے باخبر ہے اور اپنے لطف و کرم کے مطابق اُن کے ساتھ برتاؤ کرتا ہے (لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر)۔

حقیقت میں جو یہ چاہتا ہو کہ وہ تمام چیزوں کا محافظ و مربی اور سہارا ہو اسے ان صفات کا حامل ہونا چاہیے۔

علاوہ ازیں یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تمام موجوداتِ جہاں سے مختلف و متفاوت ہے، کیونکہ ان میں سے کچھ چیزیں تو ایسی ہیں کہ جو دیکھتی بھی ہیں اور خود بھی دیکھی جاتی ہیں، جیسے انسان ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو نہ خود دیکھتی ہیں اور نہ ہی دیکھی جاتی ہیں، جیسے ہماری اندرونی صفات، اور بعض ایسی ہیں کہ جنہیں دیکھا تو جاسکتا ہے

لیکن وہ کسی کو نہیں دیکھتیں، جیسے جمادات۔ تنہا وہ ہستی کہ جسے دیکھا تو نہیں جاسکتا لیکن وہ ہر چیز اور ہر شخص کو دیکھتی ہے صرف اسی کی ذات پاک ہے۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ آنکھیں خدا کو نہیں دیکھ سکتیں: عقلی دلائل گواہی دیتے ہیں کہ خدا کو آنکھوں کے ساتھ ہرگز نہیں دیکھا جاسکتا، کیونکہ آنکھیں صرف اجسام کو یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہ وہ ان کی بعض کیفیات کو ہی دیکھ سکتی ہیں اور وہ چیز کہ جو نہ جسم ہے اور نہ ہی جسم کی کوئی کیفیت، ہرگز آنکھ سے نظر نہیں آسکتی۔ دوسرے الفاظ میں اگر کوئی چیز آنکھ سے دیکھی جاسکے تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو اور کسی جہت میں ہو اور مادہ رکھتی ہو جب کہ وہ ان تمام باتوں سے (پاک اور) برتر ہے۔ وہ ایک ایسا وجود ہے جو نامحدود ہے اور وہ اسی دلیل سے جہانِ مادہ سے بالاتر ہے، کیونکہ جہانِ مادہ میں تمام چیزیں محدود ہیں۔

قرآن کی بہت سی آیات میں جن میں سے وہ آیات ہیں کہ جو بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں، اور ان کی طرف سے خداوند تعالیٰ کی رویت کا تقاضا کرنے کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، وہ کامل صراحت کے ساتھ خدا کی رویت کے امکان کی نفی کرتی ہیں (جیسا کہ انشاء اللہ اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیہ ۱۴۳ کی تفسیر میں آئے گی)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بہت سے اہلِ سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا اگر اس جہان میں نظر نہ آئے تو عالمِ قیامت میں اس کا دیدار ہوسکے گا، تفسیر المنار کے مؤلف کے بقول:

هٰذا مذاهب اهل السنة والعلم بالحديث

یہ عقیدہ اہلِ سنت اور علماءِ حدیث کا ہے[1]

اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ محققین معاصر تک بھی یعنی ان کے روشن فکر حضرات بھی اسی نظریہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات تو وہ بڑی سختی کے ساتھ اس عقیدہ پر جم جاتے ہیں۔

حالانکہ اس عقیدہ کا باطل ہونا اس قدر واضح ہے کہ بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا و آخرت میں (معادِ جسمانی کی طرف توجہ کرتے ہوئے) اس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں۔ کیا وہ خدا جو ایک مافوق مادہ وجود ہے قیامت کے دن ایک مادی وجود میں تبدیل ہو جائے گا؟ اور اس نامحدود مقام سے محدود مقام میں تبدیل ہو جائے گا؟ کیا وہ اس دن جسم یا عوارضِ جسم میں بدل جائے گا؟ کیا خدا کی رویت کے عدمِ امکان کے بارے میں دلائل عقلی دنیا و آخرت کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق ظاہر کرتے ہیں؟ درانحالیکہ عقل کا فیصلہ اس بارے میں ناقابلِ تبدیل ہے۔ اور یہ عذر جو اُن میں سے بعض نے اختیار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ انسان دوسرے جہان میں ایک دوسرا ادراک

---

[1] تفسیر المنار جلد ۷، صفحہ ۶۵۳۔

اور نظر پیدا کرے، ایک ایسا عذر ہے کہ جو کامل طور پر بلا دلیل ہے کیونکہ اگر اس ادراک و نظر سے مراد فکری و عقلی نظر ہے، تو وہ تو اس جہان میں بھی وجود رکھتی ہے اور ہم دل کی آنکھ اور عقل کی قوت سے خدا کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور اگر اس سے مراد کوئی ایسی چیز ہے کہ جس سے جسم کو دیکھا جا سکتا ہے تو ایسی چیز خدا کے بارے میں محال ہے چاہے وہ اس دنیا میں ہو یا دوسرے جہان میں۔ اس بنا پر مذکورہ گفتگو کہ انسان اس جہان میں تو خدا کو نہیں دیکھتا، لیکن مومنین قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے، ایک غیر منطقی اور ناقابلِ قبول گفتگو ہے۔ غالباً تنہا ایک چیز جو اس بات کا سبب بنی ہے کہ وہ اس عقیدہ کا دفاع کریں، یہ ہے کہ کچھ احادیث میں جو ان کی معروف کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، قیامت میں خدا کی رویت کا امکان بیان ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ عقل کے فیصلہ کی رو سے اس موضوع کے باطل ہونے کو ان روایات کے جعلی ہونے اور اُن کتابوں کے غیر معتبر ہونے کی دلیل سمجھیں کہ جن میں اس قسم کی روایات نقل کی گئی ہیں، سوائے اس صورت کے کہ ان روایات کا معنی دل کی آنکھ سے مشاہدہ کرنا ہو؟ کیا یہ صحیح ہے کہ اس قسم کی احادیث کی وجہ سے عقل و خرد کے فیصلہ کو چھوڑ دیں اور اگر قرآن کی بعض آیات میں ایسی تعبیرات موجود ہیں جن سے ابتدائی نظر میں رویت خدا کے مسئلہ کا اظہار ہوتا ہے جیسے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

اس دن کچھ چہرے پُر طراوت اور پُر رونق ہوں گے اور وہ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے[1]

یہ تعبیرات ایسی ہیں جیسے:

يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ

خدا کا ہاتھ اُن کے ہاتھ کے اُوپر ہے[2]

یہ تعبیرات کنایہ کا پہلو رکھتی ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی کوئی آیت کبھی بھی عقل و خرد کے حکم و فرمان کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات میں اس فضول عقیدہ کی شدت کے ساتھ نفی کی گئی ہے اور ایسے عقائد رکھنے والوں پر دنداں شکن تعبیرات کے ساتھ تنقید کی گئی ہے۔ منجملہ اُن کے امام صادقؑ کے مشہور اصحاب میں سے ایک صحابی جن کا نام ہشام ہے، فرماتے ہیں:

میں حضرت صادقؑ کے پاس موجود تھا کہ معاویہ بن وہب (آپ کے ایک اور صحابی) وارد ہوئے اور کہنے لگے: اے فرزندِ رسول! آپ اس حدیث کے متعلق کیا فرماتے ہیں کہ جو رسولِ خدا کے بارے میں

---

[1] قیامت۔ ۲۲ و ۲۳۔

[2] فتح۔ ۱۰۔

وارد ہوئی ہے کہ انہوں نے خدا کو دیکھا ؟ تو آپ نے خدا کو کس طرح دیکھا ؟ اور اسی طرح ایک دوسری حدیث کے بارے میں کہ جو آنحضرت سے نقل ہوئی ہے کہ مومنین بہشت میں اپنے پروردگار کو دیکھیں گے۔ تو وہ کس طرح سے دیکھیں گے ؟

امام صادق علیہ السلام نے ایک (تلخ) تبسم کیا اور فرمایا: اے معاویہ بن وہب! یہ بات کتنی بُری ہے کہ انسان ستر، اسّی سال عمر گزارے، خدا کے ملک میں زندگی بسر کرے اور اس کی نعمت کھاتا رہے لیکن اس کو صحیح طرح سے نہ پہچانے، اے معاویہ! پیغمبر نے ہرگز خدا کو اس آنکھ سے نہیں دیکھا۔ مشاہدہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک دل کی آنکھ سے دیکھنا اور (دوسرے) ظاہری آنکھ سے دیکھنا۔ جو شخص دل کی آنکھ سے مشاہدہ کی بات کہتا ہے وہ تو صحیح کہتا ہے اور جو شخص ظاہری آنکھ سے خدا کے مشاہدہ کی بات کرتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے اور خدا اور اس کی آیات کا کافر و منکر ہے۔ کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص خدا کو مخلوق کے مشابہ سمجھے وہ کافر ہے۔[1]

ایک اور روایت توحید صدوق میں اسماعیل بن فضل سے منقول ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا خدا قیامت کے دن نظر آئے گا؟ آپ نے فرمایا:

خداوند ایسی چیز سے منزہ ہے، اور بہت ہی منزہ ہے ...... (ان الابصار لا تدرك الا ماله لون والكيفية والله خالق الالوان والكيفيات)۔ آنکھیں نہیں دیکھتیں مگر ایسی چیزوں کو کہ جو رنگ و کیفیت رکھتی ہیں جب کہ خدا رنگوں اور کیفیتوں کا خالق ہے۔[2]

توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس حدیث میں خصوصیت کے ساتھ "لون" (رنگ) کا ذکر کیا گیا ہے اور آج کی دنیا میں ہم پر یہ مطلب واضح ہو چکا ہے کہ خود جسم نہیں دیکھا جاتا بلکہ اس کا رنگ دیکھا جاتا ہے، اور اگر کوئی جسم کسی قسم کا رنگ نہ رکھتا ہو تو وہ ہرگز دیکھا نہیں جائے گا (تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں سورہ بقرہ کی آیہ ۵۶ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک بحث کر چکے ہیں)۔[3]

۲۔ **خدا ہی تمام چیزوں کا خالق ہے**: بعض مفسرین اہل سنت نے جو عقیدہ کے لحاظ سے مذہب جبر کے قائل ہیں اوپر والی آیت کے ساتھ جو خدا کے تمام چیزوں کے خالق ہونے کو بیان کرتی ہے مسلک جبر پر استدلال کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال و افعال بھی اس جہاں کی اشیاء میں سے ہیں، کیونکہ "شئی" (چیز) ہر قسم کے وجود کو کہا جاتا ہے، خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی، خواہ ذات ہو یا صفت، اس بنا پر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے اور یہ جبر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

---

[1] معانی الاخبار بنا بر نقل المیزان جلد ۸ صفحہ ۲۶۸۔

[2] نور الثقلین جلد اول صفحہ ۷۵۳۔

[3] دیکھئے اُردو ترجمہ صفحہ ۱۸۳۔

لیکن آزادئ ارادہ و اختیار کے طرفدار اس قسم کے استدلال کا روشن اور واضح جواب رکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کی خالقیت ہمارے افعال کے بارے میں بھی ہمارے مختار ہونے کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں رکھتی۔ کیونکہ ہمارے افعال کو ہماری طرف بھی منسوب کیا جا سکتا ہے اور خدا کی طرف بھی۔ اگر ہم اُن کی خدا کی طرف نسبت دیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ اُس نے اس کام کے تمام مقدمات ہمارے اختیار میں دے دیئے ہیں، وہی ذات ہے جس نے ہمیں قدرت و طاقت اور ارادہ و اختیار دیا ہے۔ اس بناء پر چونکہ تمام مقدمات اسی کی طرف سے ہیں لہٰذا ہمارے اعمال اس کی طرف بھی منسوب کیے جا سکتے ہیں اور اُسے ان کا خالق جان سکتے ہیں، لیکن اس نظر سے کہ آخری ارادہ ہماری ہی طرف سے ہے۔ وہ ہم ہی ہیں کہ جو خدا کی دی ہوئی قدرت و اختیار سے استفادہ کرتے ہیں اور فعل یا ترک میں سے کسی ایک کا انتخاب ہم ہی کرتے ہیں تو اس سبب سے افعال کی نسبت ہماری طرف دی جاتی ہے اور ہم اُن کے لیے جوابدہ ہیں۔

فلسفی تعبیر کے مطابق یہاں دو خالق اور دو علتیں ایک دوسرے کے عرض میں نہیں ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے طول میں ہیں، دو علت تامہ کا ایک ہی عرض میں ہونا کوئی مفہوم نہیں رکھتا، لیکن اگر طولی ہوں تو کوئی مانع نہیں ہے، چونکہ ہمارے افعال ان مقدمات کا لازمہ ہیں جو خدا نے ہمیں دیئے ہیں، تو ان لوازم کی اس کی طرف بھی نسبت دی جا سکتی ہے اور اس شخص کی طرف بھی کہ جس نے افعال کو انجام دیا ہے۔

اس گفتگو کی مثال ٹھیک اس طرح ہے جیسے کوئی شخص اپنے کارندوں کو آزمانے کے لیے انہیں اپنے کام میں آزاد چھوڑ دے اور انہیں مکمل اختیار دیدے اور کام کے تمام مقدمات انہیں مہیا کر دے، اب یہ بات ظاہر ہے کہ جو کام وہ انجام دیں گے ایک لحاظ سے ان کے سربراہ کا کام شمار ہوگا لیکن یہ امر کارکنوں سے آزادی و اختیار کو سلب نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے کام کے بارے میں جوابدہ ہیں۔ عقیدہ جبر و اختیار کے بارے میں ہم انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل میں بحث کریں گے[1]

۳۔ بدیع کا کیا معنی ہے: جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے لفظ "بدیع" کا معنی کسی چیز کو بغیر سابقہ کے وجود میں لانے والے کے ہیں۔ یعنی خداوند تعالیٰ نے آسمان و زمین کو کسی پہلے سے موجود مادہ یا بنیاد یا نقشہ و منصوبہ کے بغیر ایجاد کیا ہے۔

یہاں بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ بات کس طرح ممکن ہے کہ کوئی چیز عدم سے وجود میں آجائے۔ ہم سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۷ کے ذیل میں (جلد اول تفسیر نمونہ صفحہ ۱۱۲ اُردو ترجمہ پر) تفصیل سے اس سوال کے جواب میں بحث کر چکے ہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ جو ہم یہ کہتے ہیں کہ تمام موجودات کو خدا عدم سے وجود میں لایا ہے اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ "عدم" وہ مادہ ہے کہ جو موجودات عالم کو تشکیل دینے والا ہے۔ جس طرح سے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ بڑھئی

---

[1] کتاب "خدا را چگونہ بشناسیم" کی فصل جبر و اختیار کی طرف بھی رجوع فرما سکتے ہیں۔

نے میز کو لکڑی سے بنایا ہے۔ ایسی چیز یقیناً محال ہے۔ کیونکہ عدم وجود کا مادہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس جہان کی یہ تمام موجودات پہلے موجود نہیں تھیں اس کے بعد وجود میں آئی ہیں۔ یہ امر کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں رکھتا، اور اس سلسلے میں ہم نے جلد اول میں بھی کچھ مثالیں بیان کی ہیں اور یہاں پر مزید بیان کرتے ہیں، کہ ہم اپنے فکر و ذہن میں کچھ ایسی موجودات کو پیدا کر سکتے ہیں جو پہلے کسی صورت میں بھی ہمارے ذہن میں نہیں تھیں، اس میں شک نہیں کہ یہ ذہنی موجودات اپنے لیے ایک قسم کا وجود و ہستی رکھتی ہیں۔ اگرچہ وہ وجود خارجی کی طرح نہیں ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمارے ذہنی افق میں موجود ہوتی ہیں۔ اگر کسی چیز کا وجود عدم کے بعد محال ہو تو وجود ذہنی اور وجود خارجی کے درمیان کیا فرق ہے، اس بنا پر جس طرح ہم اپنے ذہن میں کئی موجودات کو ایجاد و خلق کر لیتے ہیں جو پہلے موجود نہیں تھیں، خداوند تعالیٰ بھی عالم خارج میں ایسا ہی کام کرتا ہے، اس مثال میں اور اُن مثالوں میں جو ہم جلد اول میں بیان کر چکے ہیں تھوڑا سا غور کرنے سے یہ مشکل حل ہو جاتی ہے۔

۴۔ لطیف کا معنی کیا ہے: اُوپر والی آیات میں خداوند تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت "لطیف" کا ذکر ہوا ہے اور وہ مادہ لطف سے ہے، جب وہ اجسام کے بارے میں استعمال ہو تو وہ ہلکا ہونے کے معنی میں ہے۔ جو ثقل کے مقابلہ میں ہے، اور جس وقت حرکات کے بارے میں (حرکت لطیفہ) استعمال ہو تو ایک چھوٹی سی جلد گزر جانے والی حرکت مراد ہوتی ہے، اور کبھی ایسے موجودات اور کاموں پر بھی جو بہت دقیق اور باریک ہوتے ہیں اور جو قوت حس سے قابلِ ادراک نہیں ہوتے یہ لفظ بولا جاتا ہے، اور اگر ہم خدا کی لطیف کے نام سے توصیف کرتے ہیں تو وہ بھی اسی معنی میں ہے یعنی وہ ایسی نظر نہ آنے والی اشیاء کا خالق اور ایسے افعال کا موجد ہے کہ جو قوتِ سماعت کے دائرے سے باہر ہے، بہت ہی باریک بین اور حد سے زیادہ دقیق ہے۔

اس سلسلے میں ایک قابلِ توجہ حدیث فتح بن یزید جرجانی کے واسطے سے امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے نقل ہوئی ہے جو ایک علمی معجزہ شمار ہوتی ہے حدیث اس طرح ہے کہ امامؑ فرماتے ہیں:

> یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا لطیف ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے لطیف مخلوقات کو پیدا کیا ہے اور اس سبب سے ہے کہ وہ لطیف وظریف اور نظر نہ آنے والی اشیاء سے آگاہ ہے۔ کیا تم اس کی صنعت کے آثار کو لطیف وغیر لطیف نباتات میں دیکھتے نہیں ہو؟ اور اسی طرح چھوٹی چھوٹی مخلوقات و حیوانات اور باریک باریک حشرات اور اُن چیزوں میں جو اُن سے بھی چھوٹی ہیں۔ ایسی موجودات کہ جو ہرگز آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتیں، اور اس قدر چھوٹی ہیں کہ ان کے نر و مادہ اور نئے اور پرانے بھی پہچانے نہیں جاتے۔ جب ہم اس قسم کے موضوعات کا مشاہدہ کرتے ہیں ..... اور جو کچھ گہرے سمندروں میں، اور درختوں کی چھال کے نیچے اور بیابانوں اور صحراؤں میں موجود ہیں اُن پر نظر کرتے ہیں ...... اور یہ کہ ایسی ایسی موجودات بھی ہیں کہ جنہیں ہرگز ہماری آنکھیں نہیں دیکھتیں اور اپنے ہاتھوں سے انہیں ہم چھو بھی نہیں سکتے۔ تو ان تمام چیزوں سے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا پیدا کرنے والا لطیف ہے۔[1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اُوپر والی حدیث جو جراثیم اور خوردبینی حیوانات کی طرف اشارہ ہے اور پاسٹور کی پیدائش سے کئی صدیوں پہلے بیان ہوئی ہے لطیف کی تفسیر کو واضح کرتی ہے۔

اس لفظ کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خدا کے لطیف ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی ذات پاک ایسی ہے جو ہرگز کسی کے بھی حس سے ادراک نہیں ہو سکتی اس بنا پر وہ لطیف ہے کیونکہ کوئی شخص بھی اس کی ذات سے آگاہ نہیں ہے اور خبیر ہے چونکہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ ہے، اس معنی کی طرف بھی بعض روایات اہلِ بیت علیہم السلام میں اشارہ ہوا ہے[1] اور اس بات پر بھی توجہ رکھنی چاہیے کہ اس لفظ کے دونوں ہی معنی مراد لینے میں بھی کوئی امر مانع نہیں ہے۔

۱۰۴۔ قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○

۱۰۵۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

۱۰۶۔ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○

۱۰۷۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ؕ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○

ترجمہ

۱۰۴۔ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے واضح دلیلیں آئی ہیں۔ جو شخص (اس کے ذریعہ سے حق کو) دیکھے تو یہ اسی کے فائدہ میں ہے اور جو شخص ان کو دیکھنے سے آنکھیں بند کرلے تو خود اسی کا نقصان ہے اور میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔

حاشیہ صفحہ سابقہ: اصولِ کافی جلد اول صفحہ ۹۳۔

[1] تفسیر برہان جلد اول صفحہ ۵۴۸۔

۱۰۵۔ اور ہم آیات کو اس طرح مختلف شکلوں میں بیان کرتے ہیں، اور انہیں کہنے دو کہ تو نے سبق پڑھا ہے (اور تو نے ان کو کسی دوسرے سے سیکھا ہے) ہمارا ہدف یہ ہے کہ ہم علم و آگاہی رکھنے والوں کے لیے اسے واضح کردیں۔

۱۰۶۔ جو کچھ تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر وحی ہوئی ہے اس کی پیروی کر اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے، اور مشرکین سے منہ پھیر لو۔

۱۰۷۔ اگر خدا چاہتا (تو سب جبری طور پر ایمان لے آتے اور کوئی بھی) مشرک نہ ہوتا، اور ہم نے تجھے اُن کے اعمال کا جوابدہ قرار نہیں دیا، اور تیری یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ انہیں (ایمان لانے پر) مجبور کرتے۔

تفسیر

پیغمبر مجبور نہیں کرتے

درحقیقت ان آیات میں گذشتہ آیات کا ایک طرح سے خلاصہ اور نتیجہ پیش کیا گیا ہے، پہلے کہا گیا ہے: تمہارے پاس توحید، خداشناسی اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بارے میں ایسی واضح و روشن دلائل اور نشانیاں آچکی ہیں جو بصیرت و بینائی کا سبب ہیں (قد جاءکم بصائر من ربکم)۔

"بصائر" جمع ہے "بصیرت" کی "بصر" کے مادہ سے دیکھنے کے معنی میں لیکن عام طور پر یہ لفظ فکری و عقلی بصیرت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان تمام امور پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کہ جو کسی مطلب کے ادراک و فہم کا باعث ہوں۔ زیر نظر آیت میں یہ لفظ دلیل، شاہد اور گواہ کے معنی میں آیا ہے، اور اُن تمام دلائل کو جو گذشتہ آیات میں خداشناسی کے سلسلہ میں بیان کی جاچکی ہیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے بلکہ سارا قرآن اس کے مفہوم میں موجود ہے۔

اس کے بعد یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے کہ یہ دلائل حقیقت کو آشکار کرنے کے لیے کافی ہیں اور منطقی پہلو رکھتے ہیں، کہا گیا ہے: وہ لوگ جو ان دلائل کے ذریعہ حقیقت کے چہرے کو دیکھ لیں تو انہوں نے خود اپنے ہی نفع کی طرف قدم بڑھایا ہے اور وہ لوگ جو اندھوں کی طرح ان کے مشاہدہ سے اپنے آپ کو محروم رکھیں انہوں نے اپنے ہی نقصان میں کام کیا ہے (فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها)۔

اور آیت کے آخر میں پیغمبر کی زبانی کہا گیا ہے: میں تمہارا نگہبان اور محافظ نہیں ہوں (وما انا علیکم بحفیظ)۔

اس بارے میں کہ اس جملے سے مراد کیا ہے، مفسرین نے دو احتمال ظاہر کیے ہیں۔

پہلا یہ کہ میں تمہارے کاموں کا محافظ ونگہبان اور جوابدہ نہیں ہوں، بلکہ خدا ہی سب کی نگہداری کرنے والا ہے اور وہی ہر شخص کو جزا وسزا دے گا، میرا فریضہ تو صرف رسالت کو پہنچانا اور لوگوں کی ہدایت کے لیے جتنی زیادہ سے زیادہ سعی وکوشش ہوسکتی ہے، کرنا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں اس بات پر مامور اور تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں کہ میں تمہیں جبر واکراہ سے طاقت سے اور زبردستی ایمان کی دعوت دوں۔ بلکہ میرا فریضہ تو صرف منطقی حقائق بیان کرنا ہے اور آخری تصمیم وارادہ خود تمہارا اپنا کام ہے۔

اس امر میں کوئی بات مانع نہیں ہے کہ اس لفظ سے دونوں ہی معانی مراد لیے گئے ہوں۔

بعد والی آیت میں اس امر کی تاکید کے لیے کہ حق وباطل کے انتخاب کی راہ میں آخری ارادہ خود لوگوں کے اپنے اختیار میں ہے فرمایا گیا ہے: ہم آیات ودلائل کو اس طرح سے مختلف شکلوں، مختلف قیافوں اور مختلف صورتوں میں بیان کرتے ہیں (وکذلک نصرف الآیات)[1]۔

لیکن ایک جماعت مخالفت پر کھڑی ہوگئی، اور بغیر مطالعہ اور بغیر کسی قسم کی دلیل کے کہنے لگی، تونے یہ درس دوسروں (یہود ونصاریٰ اور ان کی کتب) سے لیے ہیں (ولیقولوا درست)[2]۔

لیکن ایک اور دوسرا گروہ کہ جو حق کو قبول کرنے کی آمادگی رکھتا ہے اور جس کے افراد صاحب بصیرت، عالم و آگاہ ہیں، وہ اس کے ذریعہ حقیقت کے چہرے کو دیکھ لیتے ہیں اور اسے قبول کرلیتے ہیں (ولنبینہ لقوم یعلمون)۔

پیغمبر پر اس نظر سے تہمت کہ آپ نے اپنی تعلیمات یہود ونصاریٰ سے حاصل کی ہیں، ایک ایسی بات ہے جو مشرکین کی طرف سے بارہا کہی گئی ہے اور ہٹ دھرم مخالفین اب بھی ایسا کہتے رہتے ہیں حالانکہ اصولاً پورے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی درس مکتب اور علم تھا ہی نہیں کہ پیغمبرؐ اسے حاصل کرتے اور جزیرہ نمائے عرب سے باہر پیغمبر کے سفر اس قدر کم تھے کہ جن میں اس قسم کے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہے، پورے حجاز کے اندر رہنے والے یہودیوں اور عیسائیوں کی معلومات بھی اس قدر کم اور خرافات سے مخلوط تھیں کہ وہ اصلاً اس قابل ہی نہ تھیں کہ ان کا قرآن اور تعلیمات پیغمبرؐ سے موازنہ کیا جائے۔ اس موضوع کے بارے میں ہم انشاء اللہ مزید وضاحت

---

[1] "نصرف"، "تصریف" کے مادہ سے دگرگوں کرنے اور مختلف شکلوں میں لانے کے معنی میں ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی آیات مختلف لب ولہجہ میں، اور دل میں اتر جانے والے تمام وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے، ایسے اشخاص کے لیے جو فکر وعقیدہ اور تمام معاشرتی اور نفسیاتی پہلوؤں سے مختلف سطح پر ہوتے ہیں، نازل ہوئی ہیں۔

[2] لام لیقولوا، اصطلاح کے مطابق (لام عاقبت) ہے، جو کسی چیز کے سرانجام اور عاقبت کے بیان کے لیے لایا جاتا ہے، لیکن وہ اس کا اصلی ہدف نہیں ہوتا اور "درست" "مادہ درس" سے، حاصل کرنے اور قبضے میں لینے کے معنی میں ہے، اور یہ ایک تہمت تھی جو مشرک پیغمبر اکرمؐ پر لگایا کرتے تھے۔

سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ میں بیان کریں گے۔

اس کے بعد مخالفین کی ہٹ دھرمیوں، کینہ پروریوں اور تہمتوں کے مقابلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تیرا فریضہ یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تجھ پر وحی ہوتی ہے اس کی پیروی کر، وہ خدا کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے (اتبع ما اوحی الیک من ربک لا الٰہ الا ھو)۔

نیز تیرا فرض یہ ہے کہ "مشرکین اور ان کی ناروا تہمتوں اور بے بنیاد باتوں کی پرواہ نہ کر" (واعرض عن المشرکین)۔

حقیقت میں یہ آیت پیغمبر اکرمؐ کے لیے ایک قسم کی تسلی اور روحانی تقویت ہے تاکہ اس قسم کے مخالفین کے مقابلہ میں آپ کے عزم راسخ اور آہنی ارادہ میں ذرا سی بھی کمزوری واقع نہ ہو۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اُس سے اچھی طرح واضح اور روشن ہو جاتا ہے کہ "واعرض عن المشرکین" (مشرکین سے منہ پھیر لو اور ان کی پرواہ نہ کرو) کا جملہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کے حکم اور ان کے مقابلے میں جہاد کرنے سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتا، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی بے بنیاد باتوں اور تہمتوں کی پرواہ نہ کرو اور اپنی راہِ حق پر ثابت قدم رہو۔

آخری زیرِ بحث آیت میں اس حقیقت کی دوبارہ تائید کی گئی ہے کہ خداوند تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ انہیں جبراً ایمان پر آمادہ کرے، اور اگر وہ یہ چاہتا تو سب کے سب ایمان لے آتے اور کوئی مشرک نہ ہوتا (ولو شاء اللہ ما اشرکوا)۔

اور یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ تم ان کے اعمال کے لیے جوابدہ نہیں ہو اور تم انہیں ایمان پر مجبور کرنے کے لیے بھی مبعوث نہیں ہوئے ہو (وما جعلناک علیھم حفیظاً)۔

جیسا کہ تمہارا یہ فرض بھی نہیں کہ تم انہیں کارِ خیر پر مجبور کرو (وما انت علیھم بوکیل)۔

"حفیظ" اور "وکیل" میں فرق یہ ہے کہ حفیظ تو اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو کسی شخص یا چیز کی نگہبانی کرے اور اُسے زیان وضرر پہنچنے سے محفوظ رکھے، لیکن وکیل اُس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کے لیے منافع کے حصول کے لیے جستجو اور کوشش کرے۔

شاید یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہ ہو کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان دو صفات (حفیظ و وکیل) کی نفی دفع ضرر اور جلب منفعت پر مجبور کرنے کی نفی کے معنی میں ہے، ورنہ پیغمبرؐ تبلیغ کے طریقے سے اور نیک کاموں کے بجالانے اُور بُرے کاموں کے ترک کرنے کی دعوت کے ذریعہ ان دونوں فرائض کو ان کے موقع ومحل پر اختیاری صورت میں انجام دیتے رہیں۔

ان آیات کا لب ولہجہ اس نظر سے بہت ہی قابلِ ملاحظہ ہے کہ خدا پر اور مبانیٔ اسلام پر ایمان لانا کسی قسم کا بھی جبری پہلو نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ ان امور کو منطق واستدلال اور افرادِ بشر کی فکر وروح میں نفوذ کے طریق سے پیش رفت کرنا چاہیے۔ کیونکہ جبری ایمان کی تو کوئی بھی قدر وقیمت نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ لوگ حقائق کو سمجھیں اور اپنے ارادہ و اختیارؔ

کے ساتھ انہیں قبول کریں۔

قرآن نے بارہا مختلف آیات میں اس حقیقت پر تاکید کی ہے اور وہ ایسے سخت گیر اعمال سے جیسے کہ قرون وسطیٰ[1] میں کلیسا کے اعمال اور محکمۂ تفتیش عقائد وغیرہ کے اعمال تھے اسلام کی بیگانگی کا اعلان کر رہا ہے۔ اور انشاء اللہ سورۂ برائت کی ابتداء میں مشرکین کے مقابلہ میں اسلام کی سخت گیری کے علل و اسباب کو زیر بحث لایا جائے گا۔

۱۰۸۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۪ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۸۔ ایسے لوگوں (کے معبود) کو جو خدا کے علاوہ کسی کو پکارتے ہیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ (بھی) ظلم و جہالت کی وجہ سے خدا کو گالیاں دینے لگ جائیں، ہم نے ہر اُمت کے لیے ان کے عمل کو اسی طرح زینت دی ہے اس کے بعد ان کی بازگشت تو ان کے پروردگار کی طرف ہی ہے، اور وہ انہیں ان کے اس عمل سے جو وہ کیا کرتے تھے آگاہ کرے گا (اور اس کی جزا یا سزا دے گا)۔

تفسیر

اس بحث کے بعد جو تعلیمات اسلام کے منطقی ہونے، اور دعوت کے استدلال کے ذریعہ لازم ہونے اور جبری طریقہ سے نہ ہونے کے بارے میں گذشتہ آیات میں گزری ہے، ان آیات میں تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: تم مشرکین کے بتوں اور معبودوں کو کبھی گالیاں نہ دو کیونکہ یہ عمل سبب بن جائے گا کہ وہ بھی یہی کام خداوند تعالیٰ کی شانِ اقدس میں ظلم و ستم اور جہل و نادانی کی وجہ سے انجام دینے لگیں (ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوًا بغیر علم)۔

جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کا ایک گروہ مسلسل بت پرستی پر سخت برہمی کی بناء پر بعض اوقات

---

[1] قرون وسطیٰ: ایک ہزار سالہ دور کو کہتے ہیں جو چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہو کر پندرہویں صدی عیسوی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ زمانہ مغرب اور مسیحیت کا ایک تاریک ترین دور تھا، اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسلام کا سنہری دور ٹھیک قرون وسطیٰ کے وسط میں ہوا ہے۔

مشرکین کے بتوں کو برا بھلا کہتے ہوئے انہیں گالیاں دیتا تھا۔ قرآن نے صراحت سے انہیں اس بات سے منع کیا، اور اصولِ ادب وعفت اور شیریں بیانی کو بیہودہ ترین اور بدترین مذاہب وادیان کے مقابلہ میں بھی لازم وضروری قرار دیا۔
اس موضوع کی دلیل واضح ہے، کیونکہ گالی دینے اور برا بھلا کہنے سے کسی کو غلط راستے سے نہیں پھیرا جاسکتا، بلکہ اس کے برعکس جہالت آمیز شدید تعصب جو اس قسم کے افراد میں ہوتا ہے اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ بقولے: زدی دندہ لجاحت افتادہ (یعنی اپنی ہٹ دھرمی پر اڑ جانا) کے مطابق اپنے باطل دین میں اور زیادہ راسخ ہو جائیں، اس صورت میں یہ بات آسان ہو جائے گی کہ خداوند تعالیٰ کی شان اقدس میں بدگوئی اور توہین کے لیے زبان کھولیں۔ کیونکہ ہر گروہ اور ہر مذہب کے لوگ اپنے عقائد واعمال میں متعصب ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن بعد والے جملے میں کہتا ہے:
ہم نے اس طرح ہر گروہ کے لیے اُن کے عمل کو زینت دے دی ہے" (کذالک زینا لکل امة عملھم)۔
اور آیت کے آخر میں کہتا ہے کہ: اُن سب کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے اور وہ انہیں خبر دے گا کہ انہوں نے کون سے عمل انجام دیئے ہیں (ثم الی ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون)۔

قابلِ توجہ نکات

۱۔ خدا زینت دیتا ہے؟ اوپر والی آیت میں ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال کو اس کی نظر میں زینت دینے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ بات بعض لوگوں کے لیے تعجب کا باعث ہو کہ کیا یہ بات ممکن ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی کے عمل بد کو اس کی نظر میں زینت دے۔
اس سوال کا جواب وہی ہے جو ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ اس قسم کی تعبیرات عمل کی خاصیت اور اثر کی طرف اشارہ ہوتی ہیں۔ یعنی جس وقت انسان کسی کام کو بار بار انجام دے تو آہستہ آہستہ اس کی قباحت اور بدی اس کی نگاہ میں ختم ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی نظر میں ایک عمدہ صورت اختیار کر لیتا ہے اور چونکہ علت العلل اور مسبب الاسباب اور ہر چیز کا خالق خدا ہے اور تمام تاثیرات خدا ہی کی طرف منتہی ہوتی ہیں لہٰذا قرآن کی زبان میں اس قسم کے آثار کی بعض اوقات اس کی طرف نسبت دے دی جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔
زیادہ واضح تعبیر میں " زینا لکل امة عملھم " کا معنی یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان کے برے اعمال کے نتیجے میں گرفتار کر دیا ہے یہاں تک کہ برائیاں ان کی نظر میں اچھائیاں معلوم ہونے لگیں۔
اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض آیاتِ قرآن میں عمل کو زینت دینے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے وہ بھی اس بات سے اختلاف نہیں رکھتی کیونکہ شیطان انہیں برے عمل کے انجام دینے کا وسوسہ کرتا ہے اور وہ شیطان کے وسوسے کے سامنے جھک جاتے ہیں آخر کار وہ اپنے عمل کے نتائج بد میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ علمی تعبیر کے لحاظ سے سببیت تو خدا کی طرف سے ہے لیکن ایجادِ سبب اُن افراد اور شیطانی وسوسوں کے ذریعے ہوتا ہے [1]

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

۲۔ گالیاں نہ دینے کا حکم : اسلامی روایات میں بھی گمراہ اور منحرف لوگوں کو گالیاں نہ دینے کی قرآنی منطق کی پیروی کی گئی ہے اسلام کے بزرگ پیشواؤں اور رہنماؤں نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ ہمیشہ منطق و استدلال کا سہارا لیں اور مخالفین کے اعتقادات کے بارے میں گالی دینے کے لاحاصل حربے کو وسیلہ نہ بنائیں۔ ہم نہج البلاغہ میں پڑھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام اپنے اصحاب کی ایک جماعت کو جو جنگِ صفین کے دنوں میں معاویہ کے پیروکاروں کو گالیاں دے رہی تھی، فرماتے ہیں :

انی اکرہ ان تکونوا سبابین ولکنکم لو وصفتم اعمالھم و ذکرتم حالھم کان اصوب فی القول و ابلغ فی العذر۔

مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ تم فحش گوئی کرنے والے اور گالیاں دینے والے بنو، اگر تم گالیاں دینے کے بجائے، ان کی کارگزاریوں کو بیان کرو اور ان کے حالات کا تذکرہ کرو (اور ان کے اعمال کا تجزیہ و تحلیل کرو) تو یہ بات حق و راستی کے زیادہ قریب ہے اور اتمام حجت کے لیے بہتر ہے۔[۱]

۳۔ بت پرست اور خدا کے بارے میں بدگوئی : بعض اوقات یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بت پرست خدا کے بارے میں بدگوئی کریں، جب کہ ان کی اکثریت اللہ کا اعتقاد رکھتی تھی اور بتوں کو اس کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتی تھی۔

لیکن اگر ہم ہٹ دھرم اور متعصب عوام کی وضع و کیفیت میں غور و فکر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ بات کوئی زیادہ تعجب کا باعث نہیں ہے اس قسم کے لوگ جب غصہ میں آجاتے ہیں تو پھر کوشش کرتے ہیں کہ وہ مدمقابل کو جس طرح بھی ممکن ہو تکلیف اور دکھ پہنچائیں، چاہے اس کے لیے طرفین کے مشترک عقائد کی ہی بدگوئی کرنی پڑے مشہور سنی عالم آلوسی تفسیر روح المعانی میں نقل کرتے ہیں کہ جاہل عوام میں سے بعض نے جب یہ دیکھا کہ شیعہ شیخین کو برا بھلا کہتے ہیں تو انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے حضرت علیؑ کی شان میں گستاخی اور اہانت شروع کردی۔ ایسے ایک شخص سے جب یہ پوچھا گیا کہ تو حضرت علیؑ کی جو تیرے نزدیک بھی قابلِ احترام ہیں کیوں اہانت کرتا ہے ؟ تو وہ کہنے لگا کہ میں یہ چاہتا تھا کہ شیعوں کو اس طرح سے تکلیف اور دکھ پہنچاؤں، کیونکہ میں نے انہیں اس چیز سے زیادہ اور کسی چیز کو دکھ دینے والا نہیں دیکھا اور بعد میں اُسے اس عمل سے توبہ کرنے پر آمادہ کیا گیا۔[۲]

حاشیہ بر صفحہ سابقہ : آیات قرآن میں ۸ مقامات پر بُرے اعمال کے زینت دینے کی نسبت شیطان کی طرف دی گئی ہے اور دس مقامات پر فعل مجہول کی شکل میں (زُیّن) آیا ہے اور دو مقامات پر خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ اُوپر جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر توجہ کرتے ہوئے تینوں مقامات کا معنی واضح ہو جاتا ہے۔

[۱] نہج البلاغہ کلام ۲۰۶، صبحی صالح۔

[۲] تفسیر روح المعانی آلوسی جلد ۷، صفحہ ۲۱۸۔

۱۰۹۔ وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَئِنۡ جَآءَتۡهُمۡ اٰيَةٌ لَّيُؤۡمِنُنَّ بِهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰيٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَمَا يُشۡعِرُكُمۡ ۙ اَنَّهَاۤ اِذَا جَآءَتۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ○

۱۱۰۔ وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۰۹۔ انہوں نے بہت ہی اصرار سے اللہ کی قسم کھائی کہ اگر کوئی نشانی (معجزہ) ان کے لیے آجائے تو وہ یقینی طور پر اس پر ایمان لے آئیں گے (اے رسول تم یہ) کہہ دو کہ معجزات خدا کی طرف سے ہوتے ہیں (اور یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہاری خواہش پر معجزہ لے آؤں) اور تم نہیں جانتے کہ وہ معجزات کے آجانے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۱۰۔ اور ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو اوندھا کر دیں گے کیونکہ وہ ابتدا میں ایمان نہیں لائے تھے اور انہیں طغیان و سرکشی کے عالم میں خود ان کی حالت میں چھوڑ دیں گے تاکہ وہ سرگرداں ہو جائیں۔

شانِ نزول

مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں یہ نقل کیا ہے کہ قریش کا ایک گروہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ تم موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے بڑے بڑے معجزات بیان کرتے ہو اور اسی طرح دوسرے انبیاء کے بھی، تم بھی ہمیں کوئی ایسا ہی کام کر کے دکھاؤ، تاکہ ہم ایمان لائیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم کونسا کام چاہتے ہو کہ میں اُسے تمہارے لیے انجام دوں۔ انہوں نے کہا، کہ تم خدا سے درخواست کرو کہ وہ کوہ صفا کو سونے میں تبدیل کر دے اور ہمارے بعض پہلے کے مرے ہوئے مردے زندہ ہو جائیں اور ہم ان سے تیری حقانیت کے بارے میں سوال کریں اور ہمیں فرشتے بھی دکھا جو تیرے بارے میں گواہی دیں یا خدا اور فرشتوں کو اکٹھا اپنے ساتھ لے آ۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں ان میں سے بعض کام انجام دے دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہم ایسا کریں گے (یعنی ایمان لے آئیں گے) مسلمانوں نے جب مشرکین کا اس سلسلہ میں اصرار دیکھا تو پیغمبرؐ سے تقاضا کیا کہ آپ ایسا کریں شاید یہ ایمان لے آئیں، جونہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا کرنے کے لیے آمادہ ہوئے کہ ان میں سے بعض مطالبات کے لیے خدا سے دعا کریں (کیونکہ ان میں سے بعض تو نامعقول اور محال تھے) کہ امین وحی خدا نازل ہوئے اور یہ پیغام لائے کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی دعا قبول ہو جائے گی لیکن اس صورت میں (چونکہ ہر لحاظ سے اتمام حجت ہو جائے گا اور یہ حسّی طور پر ظاہر بظاہر کھل کر سامنے آجائے گا) اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب کو سخت عذاب ہو گا (اور نیست ونابود ہو جائیں گے) لیکن اگر ان کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے اور تم انہیں ان کی اپنی اسی حالت پر چھوڑ دو تو ممکن ہے کہ ان میں سے بعض آئندہ توبہ کر لیں اور راہ حق اختیار کر لیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے قبول کر لیا اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں متعدد منطقی دلیلیں بیان ہوئی ہیں کہ جو خدا کی وحدانیت کے اثبات اور شرک وبت پرستی کی نفی کے لیے کافی تھیں لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرم اور متعصب مشرکین کی ایک جماعت نے سرِ تسلیم خم نہ کیا اور وہ بہانے تراشنے لگے اور منجملہ ان کے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عجیب وغریب خارق عادات کے لیے کہ جن میں سے بعض تو بنیادی طور پر محال تھے، مطالبہ کرنے لگے اور دروغ بیانی کے ساتھ یہ دعویٰ کرنے لگے کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ اس قسم کے معجزات دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ قرآن پہلی آیت میں اُن کی کیفیت اور وضع کو اس طرح بیان کرتا ہے: انہوں نے انتہائی اصرار کے ساتھ یہ قسم کھائی کہ اگر ان کے لیے معجزہ آجائے تو وہ ایمان لے آئیں گے (واقسموا باللہ جهد ایمانهم لئن جاءتهم اٰیة لیؤمنن بها)۔[1]

قرآن اُن کے جواب میں دو حقیقتوں کو بیان کرتا ہے: پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ تو اُن سے یہ کہہ دے کہ یہ کام میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں تمہارے ہر مطالبے اور ہر تقاضے کو پورا کر دوں، بلکہ معجزات تو صرف خدا ہی کی طرف سے (ہوتے) ہیں، اور اسی کے فرمان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں (قل انما الاٰیات عند اللہ)۔

اس کے بعد روئے سخن اُن سادہ لوح مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے کہ جو ان کی سخت اور شدید قسموں سے متاثر ہو گئے تھے کہتا ہے: تم نہیں جانتے کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں اور اگر یہ معجزات اور ان کی درخواستوں کے مطابق مطلوبہ نشانیاں دکھا بھی دی جائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے (وما یشعرکم انها اذا جاءت

---

[1] "جهد" کسی بھی کام کرنے کے لیے سعی و کوشش کرنے کو کہتے ہیں اور یہاں تاکیدی قسموں کے لیے کوشش کرنا مراد ہے

لا یؤمنون)[1]۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان کے ساتھ ٹکراؤ کے مختلف مناظر اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ یہ گروہ حق کی جستجو میں نہیں تھا بلکہ ان کا ہدف اور مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بہانہ تراشیوں میں لگائے رکھیں اور شک وشبہ کے بیج ان کے دلوں میں بکھیرتے رہیں۔

بعد والی آیت میں ان کی ہٹ دھرمی کی علت کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ وہ کجروی، جاہلانہ تعصبات اور حق کے مقابلہ میں سر تسلیم خم نہ کرنے پر اصرار کی وجہ سے قوتِ ادراک اور صحیح نظر کھو بیٹھے ہیں۔ اور حیران وپریشان اور گمراہ ہوکر سرگردانی کے عالم میں پھر رہے ہیں چنانچہ قرآن اس طرح کہتا ہے: ہم ان کے دلوں اور آنکھوں کو دگرگوں کردیں گے جیسا کہ وہ آغاز میں اور دعوت کی ابتدا میں ایمان نہیں لاتے تھے (ونقلب افئدتھم و ابصارھم کما لم یؤمنوا بہ اول مرۃ)۔

یہاں بھی اس کام کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے جس کی ایک نظیر قبل کی آیات میں گزر چکی ہے۔ یہ حقیقت میں خود انہی کے اعمال کا نتیجہ اور عکس العمل ہے۔ اس کی خدا کی طرف نسبت اس عنوان سے ہے کہ وہ علت العلل اور عالم ہستی کا سرچشمہ ہے اور ہر چیز میں جو بھی خاصیت ہے وہ اسی کے ارادہ سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں خداوند تعالیٰ نے ہٹ دھرمی، کجروی اور اندھے تعصبات میں یہ اثر پیدا کیا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ انسان کے ادراک اور فکر ونظر کو بے کار کردیتے ہیں۔

آیت کے آخر میں کہتا ہے: ہم انہیں طغیان وسرکشی کی حالت میں ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ سرگرداں پھرتے رہیں (ونذرھم فی طغیانھم یعمھون)[2]۔

خداوند تعالیٰ ہم سب کو اس قسم کی سرگردانی سے جو ہمارے بے سوچے سمجھے اعمال کا نتیجہ ہے محفوظ رکھے اور ہمیں قوتِ ادراک اور ایسی کامل نظر مرحمت فرمائے کہ ہم حقیقت کے چہرے کو اس کی اصلی ہیئت وصورت میں دیکھ لیں۔

---

[1] اس بارے میں کہ اوپر والے جملے میں "ما" استفہامیہ ہے یا نافیہ اور اسی طرح جملے کی ترکیب کی کیفیت میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے "ما" کو استفہام انکاری قرار دیا ہے، حالانکہ اگر ایسا ہو تو جملہ کا معنی یہ ہوگا کہ: تم کہاں سے جانتے ہو کہ اگر معجزہ آگیا تو یہ ایمان نہیں لائیں گے، یعنی ہوسکتا ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور یہ مفہوم مقصودِ آیت کے بالکل برخلاف ہے، لہٰذا بعض نے "ما" کو نافیہ قرار دیا ہے (اور ذہن سے زیادہ نزدیک بھی یہی ہے)، تو اس بنا پر جملے کا معنی اس طرح ہوگا: تم نہیں جانتے کہ اگر یہ معجزات دکھا بھی دیے جائیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اس صورت میں " یشعر " کا فاعل لفظ " شیءٌ " ہے جو مقدر ہے اور " یشعر " کے دو مفعول ہیں پہلا مفعول " کم " اور دوسرا " انھا "۔ (غور کیجئے گا)

[2] " یعمھون " " عمہ " (بروزن " قدح ") کے مادہ سے سرگردانی اور تحیر کے معنی میں ہے۔

پارہ ہشتم

اس کا آغاز سورہ انعام کی آیت ۱۱۱
سے ہوتا ہے

۱۱۱۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۱۔ اور اگر ہم ان پر فرشتوں کو نازل کر دیتے اور مردے اُن سے باتیں کرتے اور تمام چیزوں کو ان کے سامنے جمع کر دیتے تو بھی وہ ہرگز ایمان نہ لاتے، مگر یہ کہ خدا چاہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

ہٹ دھرم لوگ راہِ راست پر کیوں نہیں آتے؟

یہ آیت گذشتہ آیات کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ سب آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں، ان چند آیات کا مفہوم یہ ہے کہ ان عجیب وغریب معجزات کا تقاضا کرنے والوں میں سے بہت سے اپنے تقاضوں میں سچے نہیں ہیں اور ان کا ہدف حق کو قبول کرنا نہیں ہے لہٰذا ان کے مطالبات میں سے بعض (مثلاً خدا کا ان کے سامنے آنا) اصولاً محال ہیں۔

وہ اپنے گمان کے مطابق چاہتے یہ ہیں کہ ان عجیب وغریب معجزات کا تقاضا کر کے مومنین کے افکار کو متزلزل کر دیں اور حق طلب لوگوں کے نظریے خلط ملط ہوں اور یہ انہیں اپنی طرف مشغول کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن زیر نظر آیت میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: اگر ہم (جس طرح انہوں نے درخواست کی تھی) فرشتوں کو ان پر نازل کر دیتے، اور مردے بھی آجاتے اور اُن سے باتیں کرتے اور خلاصہ یہ کہ جو جو مطالبات اور تقاضے وہ کر رہے تھے اُن سب کو جمع کر دیتے تو پھر بھی وہ ایمان نہ لاتے (ولو اننا نزلنا الیھم الملا ئکۃ وکلمھم الموتٰی وحشرنا علیھم کل شیء قبلاً ما کانوا لیؤمنوا)[1]۔

---

[1] "حشرنا علیھم کل شیء" سے مراد یہ ہے کہ تمام چیزیں اور اُن کے تمام مطالبات پورے کر دیئے جائیں، کیونکہ "حشر" اصل میں جمع کرنے اور ایک دوسرے کے گرد لانے کے معنی میں ہے۔ اور قبلا کا معنی روبرو اور مدمقابل ہونا ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ قبلا، قبیل کی جمع ہو، یعنی گروہ در گروہ فرشتے اور مردے اور .... ان کے سامنے آحاضر ہوں۔

اس کے بعد تائید مطلب کے لیے فرماتا ہے: صرف ایک ہی صورت میں ممکن ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور وہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی جبری مشیت کے ذریعہ انہیں ایمان کے قبول کرنے پر آمادہ کر دے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان کوئی تربیتی فائدہ اور فکر کامل اور ارتقائی اثر نہیں رکھتا (الا ان یشاء اللہ)۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے کہ ان میں سے اکثر جاہل اور بے خبر ہیں (ولکن اکثرھم یجھلون)۔

اس بارے میں کہ اس جملے میں ضمیر " ھم " سے کون سے اشخاص مراد ہیں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے ممکن ہے یہ اشارہ اُن مومنین کی طرف ہو جو یہ اصرار کر رہے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار کے اس گروہ کے مطالبات پورا کر دیں اور جس جس معجزہ کے لیے وہ تقاضا کر رہے ہیں اُسے لے آئیں۔

ان مومنین میں سے کیونکہ بہت سے اس واقعیت سے بے خبر تھے اور اس بات کی طرف متوجہ نہیں تھے کہ وہ اپنے تقاضے میں سچے نہیں ہیں، لیکن خدا جانتا تھا کہ یہ مدعی جھوٹ بول رہے ہیں، اسی بنا پر ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا، لیکن اس بنا پر کہ دعوت پیغمبر معجزہ کے بغیر نہیں ہو سکتی لہٰذا خاص مواقع پر ان کے ہاتھ پر مختلف معجزات ظاہر کیے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ضمیر " ھم " کا مرجع اور بازگشت تقاضا کرنے والے کفار ہوں۔ یعنی اُن میں سے بیشتر اس واقعیت سے بے خبر ہیں کہ خدا ہر قسم کے خارق العادۃ فعل پر قدرت رکھتا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی قدرت کو محدود جانتے ہیں۔ لہٰذا جب بھی پیغمبر کوئی معجزہ دکھاتے تھے تو وہ اُسے جادو یا نظر فریبی پر محمول کرتے تھے جیسا کہ ہم دوسری آیت میں پڑھتے ہیں:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝

اگر ہم آسمان سے کوئی دروازہ ان کے اوپر کھول دیتے اور وہ اس کے ذریعے اُوپر چڑھ جاتے تو کہتے کہ ہماری تو نظروں کو دھوکا دیا گیا ہے اور ہمارے اُوپر جادو کر دیا گیا ہے۔ (حجر ۱۴ - ۱۵)۔

اس بنا پر وہ ایک نادان اور ہٹ دھرم گروہ ہے، لہٰذا ان کی اور ان کی باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرنا چاہیے۔

۱۱۲۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

۱۱۳۔ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۲- اس طرح ہم نے ہر نبی کے مقابلے میں شیاطینِ جن وانس سے کچھ دشمن قرار دیئے ہیں کہ جو پُرفریب اور بے بنیاد باتیں (لوگوں کو غافل رکھنے کے لیے مخفی طور پر (اور کانوں میں) ایک دوسرے سے کہتے تھے اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے (اور وہ انہیں جبری طور پر روک سکتا تھا لیکن اجبار واکراہ کا کوئی فائدہ نہیں ہے) اس بناء پر انہیں اور ان کی تہمتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو۔

۱۱۳- اور (شیطانی وسوسوں اور شیطان صفت افراد کی تبلیغات کا) نتیجہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں کے دل جو روزِ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان کی طرف مائل ہوجائیں گے اور وہ اس پر راضی ہوجائیں گے اور جو گناہ بھی وہ انجام دینا چاہیں گے، دیں گے۔

تفسیر

شیطانی وسوسے

اس آیت میں اس بات کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ اس قسم کے سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں وجود کہ جس کی طرف گذشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے صرف آنحضرتؐ کی ذات کے لیے ہی منحصر نہیں تھا بلکہ تمام انبیاء ہی کے مقابلہ میں شیاطینِ جن وانس میں سے دشمن موجود تھے (وکذلک جعلنا لکل نبی عدوًا شیاطین الانس والجن) اور ان کا کام یہ ہوتا تھا کہ "وہ پُرفریب باتیں ایک دوسرے کو غافل کرنے کے لیے پُراسرار طریقے پر بھی اور ظاہر بظاہر بھی ایک دوسرے کے کان میں کہتے تھے" (یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورًا)۔

لیکن اشتباہ نہیں ہونا چاہیے کہ "اگر خدا چاہتا تو وہ جبرًا سب کو روک سکتا تھا" تاکہ کوئی شیطان یا شیطان صفت انبیاء اور ان کی دعوت کے راستے میں کوئی معمولی سے معمولی رکاوٹ بھی نہ ڈال سکے (ولو شاء ربك ما فعلوہ)۔

لیکن خداوند تعالیٰ نے یہ کام نہیں کیا کیونکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ آزاد رہیں تاکہ ان کی آزمائش اور ارتقا و پرورش کے لیے میدان موجود رہے۔ جب کہ جبر اور سلب آزادی اس ہدف کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے سخت اور ہٹ دھرم دشمنوں کا وجود (اگرچہ ان کے اعمال خود ان کی خواہش وارادہ کے ماتحت تھے) نہ صرف یہ کہ وہ سچے مومنین کے لیے کوئی ضرر نہیں رکھتا، بلکہ غیر مستقیم طریقہ سے ان کے تکامل میں مدد کرتا ہے

چونکہ ہمیشہ تکامل وارتقا تضادات میں پنہاں ہوتا ہے اور ایک طاقتور دشمن کا ہونا انسان کی قوتوں کے اجتماع اور اس کے ارادوں کی تقویت کے لیے موثر ہے۔

لہٰذا آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ پیغمبرؐ کو حکم دیتا ہے کہ تم اس قسم کی شیطنتوں کی کسی طرح بھی پرواہ نہ کرو اور انہیں اور ان کی تہمتوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (فذرھم وما یفترون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ مندرجہ بالا آیت میں خداوند تعالیٰ شیاطین جن وانس کے وجود کی نسبت اپنی طرف دے رہا ہے اور کہتا ہے: "وکذٰلک جعلنا" (ہم نے ایسا قرار دیا)۔ اس جملے کے معنی کے بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ انسانوں کے تمام اعمال ایک لحاظ سے خدا کی طرف بھی منسوب کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ ہر شخص جو کچھ بھی رکھتا ہے وہ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اس کی قدرت اسی کی طرف سے ہے جیسا کہ اس کا اختیار اور اُس کی آزادی بھی اسی کی طرف سے ہے، لیکن ایسی تعبیرات کا مفہوم ہرگز جبر اور سلب اختیار نہیں ہے کہ خدا نے کچھ لوگوں کو اس طرح سے پیدا کیا ہو کہ وہ انبیاء کے مقابلے میں دشمنی کے لیے کھڑے ہو جائیں۔

کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ اپنی عداوت ودشمنی میں کسی قسم کی کوئی مسئولیت اور جوابدہی نہ رکھتے ہوتے بلکہ ان کا کام ایک رسالت کی انجام دہی شمار ہوتا۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

البتہ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے دشمنوں کا وجود چاہے وہ خود ان کے اپنے اختیار سے ہی ہو، مومنین کے لیے بالواسطہ طور پر اصلاح کنندہ اثر رکھتا ہے، اور بہتر لفظوں میں سچے مومنین ہر قسم کے دشمن کے وجود سے مثبت اثر لے سکتے ہیں اور اُسے اپنی آگاہی، آمادگی اور مقاومت کی سطح بلند کرنے کا وسیلہ بنا سکتے ہیں کیونکہ دشمن کا وجود انسان کی قوتوں کے اجتماع کا سبب اور باعث ہوتا ہے۔

۲۔ لفظ "شیاطین" "شیطان" کی جمع ہے اور یہ ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور وہ ہر سرکش باغی اور موذی موجود کے معنی میں ہے، لہٰذا قرآن میں پست، خبیث اور سرکش انسانوں پر بھی لفظ شیطان بولا گیا ہے۔ جیسا کہ اُوپر والی آیت میں لفظ شیطان کا انسانی شیطانوں پر بھی اور ایسے غیر انسانی شیطانوں پر بھی جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، اطلاق ہوا ہے۔ لیکن "ابلیس" اس شیطان کا اسم خاص ہے کہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابل میں آیا تھا اور حقیقت میں وہ تمام شیاطین کا رئیس وسردار ہے۔ اس بنا پر شیطان اسم جنس ہے اور ابلیس اسم خاص[1]

۳۔ "زخرف القول" پر فریب باتوں کو کہتے ہیں، جن کا ظاہر خوشنما اور باطن قبیح اور بُرا ہوتا ہے اور غرور کا معنی غفلت میں رکھنا ہے[2]

---

[1] اس سلسلہ میں ہم تفسیر نمونہ کی پہلی جلد ص۱۶۶ پر بھی بحث کر چکے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر

۴۔ زیر نظر آیت میں وحی کی تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اپنے شیطانی گفتار و اعمال میں ایسے اسرار آمیز پروگرام رکھتے ہیں کہ جن کو وہ رازدارانہ طریقے سے ایک دوسرے کی طرف القا کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اُن کے کاموں سے آگاہ نہ ہوں اور ان کی سازشیں کامل طور پر کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں۔ کیونکہ "وحی" کے معانی میں سے ایک معنی لغت میں آہستہ اور کان میں بات کرنا بھی ہے۔

بعد والی آیت میں شیاطین کی پُر فریب تلقینات و تبلیغات کے نتیجے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ان کے کام کا سرانجام یہ ہوگا کہ بے ایمان افراد یعنی وہ جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کی باتوں کو کان لگا کر سنیں گے، اور ان کے دل ان کی طرف مائل ہوں گے (ولتصغی الیہ افئدۃ الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ)[۱]۔

"لتصغی" "صغو" (بروزن سرو) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف میلان پیدا کرنے کے معنی میں ہے، لیکن زیادہ تر اس میلان و رغبت پر بولا جاتا ہے کہ جو سماعت اور کان کے وسیلہ سے حاصل ہو اور اگر کوئی شخص کسی کی بات پر موافقت کی نظر سے کان دھرے تو اس کو "صغو" اور "اصغاء" کہتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اس میلان کا انجام شیطانی پروگراموں پر کامل طور پر راضی ہونے کی صورت میں نکلے گا (ولیرضوہ)۔

اور اُن سب کا نتیجہ مختلف قسم کے گناہوں کے ارتکاب اور بُرے اور ناپسندیدہ اعمال کی صورت میں رونما ہوگا (ولیقترفوا ما ھم مقترفون)۔

۱۱۴۔ اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا وَّ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ۝

حاشیہ صفحہ سابقہ: اس طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ "زخرف" اصل میں "زینت" کے معنی میں ہے، اور اسی طرح "سونے" کے معنی میں بھی کہ جو زینت کا ایک ذریعہ ہے۔ بعد ازاں دھوکا اور فریب دینے والی باتوں پر بھی کہ جن کا ظاہر زیبا اور خوبصورت ہو، "زخرف" اور "مزخرف" بولا جانے لگا۔

[۱] آیت کی ترکیب کے بارے میں اور یہ کہ لفظ "ولتصغی" کا عطف کس پر ہے مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ آیت کے مفہوم کے ساتھ جو بات زیادہ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ اس کا عطف "یوحی" پر ہونا چاہیے اور اس کی "لام" "عاقبت کی لام" ہے۔ یعنی شیاطین کے کام کا انجام یہ ہوگا کہ وہ پُر فریب باتیں ایک دوسرے سے کہیں گے، اور بے ایمان افراد ان کی طرف مائل ہو جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ "غرورا" کے اُوپر عطف ہو جو "مفعول لاجلہ" ہے۔ یعنی "لیغتروا ولیتصغی"، کیونکہ انسان مرحلہ اوّل میں فریب کھاتا ہے اور پھر میلان پیدا کرتا ہے (غور کیجیے گا)۔

۱۱۵۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

ترجمہ

۱۱۴۔ کیا میں (اس حال میں) غیر خدا کو منصف کے طور پر اپناؤں حالانکہ وہی وہ ہستی ہے کہ جس نے اس آسمانی کتاب کو جس میں ہر چیز کا تفصیلی بیان ہے نازل کیا ہے، اور وہ لوگ کہ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اس بناء پر تم ہرگز شک و تردد کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔

۱۱۵۔ اور تیرے پروردگار کا کلام صدق و عدل کے ساتھ انجام کو پہنچا۔ کوئی شخص اس کے کلمات کو دگرگوں نہیں کر سکتا اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

تفسیر

یہ آیت حقیقت میں گذشتہ آیات کا نتیجہ ہے اور یہ آیت کہتی ہے کہ ان واضح آیات کے باوجود جو توحید کے سلسلے میں گزر چکی ہیں کیا کسی شخص کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے۔ کیا میں غیر خدا کو منصف اور حکم کے طور پر قبول کروں (افغیر اللہ ابتغی حکمًا)[1]۔

جب کہ وہی ذات ہے کہ جس نے یہ عظیم آسمانی کتاب نازل کی ہے جس میں انسان کی تمام تربیتی ضروریات آ چکی ہیں اور جس نے حق و باطل، نور و ظلمت اور کفر و ایمان کے درمیان فرق ظاہر کر دیا ہے (وھو الذی انزل الیکم الکتاب مفصلًا)۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے نہ صرف تم اور تمام مسلمان اس بات کو جانتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے

---

[1] "حکم" (بروزن "قلم") کا معنی فیصلہ کرنے والا۔ قاضی اور حاکم ہے اور بعض نے اسے معنی کے لحاظ سے حاکم کے مساوی جانا ہے لیکن مفسرین کی ایک جماعت کہ جن میں ایک شیخ طوسی بھی ہیں، کتاب "تبیان" میں انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ "حکم" اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو حق کے علاوہ فیصلہ نہ کرتا ہو لیکن دونوں کے لیے بولا جاتا ہے بعض دوسرے کہ جن میں "المنار" کا مؤلف بھی ہے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ "حکم" وہ شخص ہے جسے طرفین دعویٰ نے انتخاب کیا ہو۔ جبکہ حاکم ہر قسم کے فیصلہ کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔

ہے ، بلکہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کہ جنہوں نے اس آسمانی کتاب کی نشانیاں اپنی کتابوں میں دیکھی ہیں ، وہ بھی جانتے ہیں ، کہ یہ تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے (والذین اٰتینا ھم الکتٰب یعلمون انہ منزل من ربک بالحق)۔ اس بنا پر اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے "اور اے پیغمبر تم ہرگز اس بارے میں تردد کرنے والوں میں سے نہ ہونا (فلا تکونن من الممترین)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس بارے میں کچھ شک تھا کہ اس قسم کا خطاب آپ سے ہو رہا ہے ؟

اس سوال کا جواب وہی ہے جو ہم نے اس کے مشابہ اور اس سے ملتے جلتے مواقع پر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس میں درحقیقت مخاطب تو عام لوگ ہیں لیکن خداوند تعالیٰ تاکید اور تحکیم مطلب کے لیے اپنے پیغمبر کو مخاطب کرتا ہے تاکہ دوسرے لوگ اپنے بارے میں جان لیں ۔

بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : تیرے پروردگار کا کلام صدق ، عدل کے ساتھ مکمل ہو گیا اور کوئی بھی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ اس کے کلمات کو دگرگوں کر دے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے (وتمت کلمۃ ربک صدقا و عدلا لا مبدل لکلماتہ وھو السمیع العلیم)۔" کلمۃ "۔ لغت عرب میں گفتگو اور ہر قسم کے جملے کے معنی میں ہے یہاں تک کہ مفصل اور طولانی گفتگو کو بھی کہا جاتا ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ بعض اوقات وعدہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً :

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا

تیرے پروردگار کا وعدہ بنی اسرائیل کے بارے میں اس صبر و استقامت کے مقابلے میں جو انہوں نے کیا انجام پا گیا ۔ (سورہ اعراف ۔ ۱۳۷)

یہ بھی اسی لحاظ سے ہے کیونکہ انسان وعدہ کرتے وقت ایسا جملہ کہتا ہے جو وعدہ کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتا ہے ۔

بعض اوقات "کلمہ" دین و آئین اور حکم و دستور کے معنی میں بھی آتا ہے اور وہ بھی اسی اصل کی طرف لوٹتا ہے ۔

اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں لفظ "کلمہ" سے مراد قرآن ہے یا خدا کا دین و آئین ہے یا کامیابی کے وہ وعدے جو پیغمبر سے کیے گئے تھے ، مختلف احتمالات ہیں کہ جن میں مختلف ہونے کے باوجود کوئی تضاد نہیں ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں تمام احتمالات کو مدنظر رکھا گیا ہو لیکن اس لحاظ سے کہ گذشتہ آیات میں گفتگو قرآن کے بارے میں تھی لہٰذا یہ معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے ۔

حقیقت میں آیت یہ بیان کر رہی ہے کہ کسی طرح سے بھی قرآن میں کوئی شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے ، کیونکہ یہ ہر لحاظ سے کامل اور بے عیب ہے ، اس کی تواریخ اور اخبار سب کے سب صدق ہیں اور اس کے احکام و قوانین سب کے سب عدل ہیں ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ "کلمہ" سے مراد وہی "وعدہ" ہو جو بعد والے جملہ میں یعنی "لامبدل لکلماتہ" (کوئی شخص کلمات خدا میں تغیر اور تبدیل نہیں کرسکتا) کے جملہ میں آیا ہے کیونکہ اس جملہ کی نظیر دوسری آیات قرآنی میں بھی نظر آتی ہے مثلاً:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ. (ھود : ۱۱۹)

یا دوسری آیات میں ہم پڑھتے ہیں:۔ (وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ o اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ) پیغمبروں کے بارے میں ہمارا پہلے سے یہ وعدہ تھا کہ مظفر و منصور تو وہی ہوں گے (سورہ صافات آیہ ۱۷۱، ۱۷۲)

اس قسم کی آیات میں بعد کا جملہ اس وعدہ کی وضاحت ہے کہ جس کی طرف قبل کے جملہ میں لفظ "کلمہ" کے ذکر سے اشارہ ہوا ہے۔ اس بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی "ہمارا وعدہ صدق و عدالت کے ساتھ انجام پذیر ہوا کوئی شخص پروردگار کے احکام اور فرامین میں تبدیلی کی طاقت نہیں رکھتا۔"

اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ آیت ان تمام معانی کی طرف اشارہ کرتی ہو۔

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت اگر قرآن کی طرف اشارہ کررہی ہو تو یہ بات اس امر سے کسی قسم کا اختلاف نہیں رکھتی کہ اس وقت تک سارا قرآن نازل نہیں ہوا تھا کیونکہ آیات قرآن کے کامل ہونے سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ نازل ہو چکا تھا اس میں کوئی عیب اور نقص نہیں اور وہ ہر لحاظ سے کامل ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے قرآن میں تحریف کے بارے میں عدم امکان پر استدلال کیا ہے، کیونکہ "لا مبدل لکلماتہ" کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی شخص لفظ کے لحاظ سے، اخبار کے لحاظ سے اور احکام کے لحاظ سے قرآن میں تغیر و تبدل نہیں کرسکتا اور یہ آسمانی کتاب جسے آخر دنیا تک عالمین کا رہنما ہونا چاہیے خیانت کرنے والوں اور تحریف کرنے والوں کی دستبرد سے مصون و محفوظ رہے گی۔

۱۱۶۔ وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ o

۱۱۷۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ o

ترجمہ

۱۱۶۔ اور اگر تم زمین پر رہنے والے لوگوں میں سے اکثر لوگوں کی اطاعت کروگے تو وہ تمہیں راہ خدا سے گمراہ کردیں گے، وہ تو صرف ظن اور گمان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ اٹکل پچو لڑاتے رہتے ہیں۔

۱۱۷۔ تیرا پروردگار اُن لوگوں سے بھی خوب اچھی طرح آگاہ ہے جو اُس کی راہ سے گمراہ ہو گئے ہیں اور اُن لوگوں سے بھی کہ جو ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ اس سورہ کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس زمانے میں مسلمان انتہائی اقلیت میں تھے۔ یہ ممکن تھا کہ اُن کی اقلیت اور بت پرستوں اور مخالفین اسلام کی قطعی اکثریت بعض لوگوں کے لیے یہ توہم پیدا کر دے کہ اگر ان کا دین و آئین باطل اور بے اساس ہے تو ان کی پیروی کرنے والے اتنی اکثریت میں کیوں ہیں اور اگر ہم حق پر ہیں تو اسس قدر کم تعداد میں کیوں ہیں۔

اس آیت میں اس توہم کو دفع کرنے کے لیے کہ جو ممکن تھا کہ قبل کی آیات میں قرآن کی حقانیت کے ذکر کے بعد پیدا ہو جائے، اپنے پیغمبر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اگر تم زمین میں رہنے والے اکثر لوگوں کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں راہِ حق سے گمراہ اور منحرف کر دیں گے (وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللّٰہ)۔

بعد والے جملے میں اس امر کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کی علت اور سبب یہ ہے کہ وہ منطق اور فکرِ صحیح کی بنیاد پر کام نہیں کرتے" ان کے راہنما ہوا و ہوس سے آلودہ گمان ہیں اور کچھ جھوٹ، فریب اور تخمینے ہیں (ان یتبعون الا الظن و ان ھم الا یخرصون)[1]۔

چونکہ قبل والی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ محض اکثریت تمہارا راہِ حق کی نشاندہی نہیں کر سکتی، تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ راہِ حق صرف خدا سے حاصل کرنا چاہیے چاہے حق کے طرفدار اقلیت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا دوسری آیت میں اس امر کی دلیل واضح کرتا ہے کہ تیرا پروردگار کہ جو تمام چیزوں سے باخبر اور آگاہ ہے اور اس کے علم غیر متناہی میں ذرہ بھر اشتباہ بھی نہیں ہے وہ بہتر طور پر جانتا ہے کہ راہ ضلالت کونسی ہے اور راہِ ہدایت کونسی، اور وہ گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور پر پہچانتا ہے (ان ربک ھو اعلم من یضل عن سبیلہ و ھو اعلم بالمھتدین)[2]۔

---

[1] "خرص" (بروزن ترس) اصل میں تخمین کے معنی میں ہے پہلے پہل تو باغ وغیرہ کو کرایہ پر دینے کے وقت درختوں پر پھلوں کی مقدار کے تخمینے اور اندازے کے لیے استعمال ہوتا تھا، بعد ازاں ہر قسم کے حدس و تخمین کے لیے یہ لفظ بولا جانے لگا اور چونکہ تخمینہ اور اندازہ بعض اوقات واقع کے مطابق اور بعض اوقات اس کے خلاف ہوتا ہے لہٰذا یہ لفظ جھوٹ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور مندرجہ بالا آیت میں ہو سکتا ہے دونوں معانی کے لیے ہو۔

[2] عموماً "افعل تفضیل" "با" کے ذریعہ متعدی ہو جاتا ہے لہٰذا یہاں یہ کہنا چاہیے " اعلم بمن " لیکن "با" محذوف ہے اور "من یضل" اصطلاح کے مطابق منصوب بنزع خافض ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسرے لوگ راہِ ہدایت وضلالت کو خدا کی رہنمائی کے بغیر بھی پہچان لیتے ہیں کہ آیت یہ کہہ رہی ہے کہ خدا دوسروں سے بہتر طور پہ پہچانتا اور بہتر طور پر جانتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ انسان اپنی عقل کے ذریعے حقائق کا ادراک کرتا ہے اور راہِ ہدایت وضلالت کو کسی حد تک سمجھ لیتا ہے لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ چراغ عقل کی روشنی اور اس کی شعاع محدود ہے اور ممکن ہے کہ بہت سے مطالب نگاہِ عقل سے مخفی رہ جائیں۔ علاوہ ازیں انسان اپنی معلومات میں اشتباہ میں بھی گرفتار ہو جاتا ہے اور اسی بناء پر وہ خدائی رہبروں اور رہنماؤں کا محتاج ہے۔ اس لیے یہ جملہ کہ "خدا زیادہ جانتا ہے" صحیح ہے۔ اگرچہ انسان کا علم خدا کے علم کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

عددی اکثریت کچھ اہمیت نہیں رکھتی

بعض لوگوں کی نظر میں یہ بات مسلّم ہے کہ عددی اکثریتیں ہمیشہ صحیح راستہ پر گامزن ہوتی ہیں لیکن قرآن اس کے برخلاف متعدد آیات میں اس کی نفی کرتا ہے اور وہ عددی اکثریت کے لیے کسی اہمیت کا قائل نہیں ہے اور حقیقت میں وہ اکثریت "کیفی" کو معیار سمجھتا ہے نہ کہ اکثریت "کمی" کو۔ اس امر کی دلیل واضح ہے، کیونکہ آج کے معاشروں میں اگرچہ معاشرے کے امور میں لوگوں کو اکثریت پر بھروسہ کرنے کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں سوجھا لیکن یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ یہ بات جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ایک طرح سے مجبوری کے باعث قبول کرنا پڑتی ہے، کیونکہ ایک مادی معاشرے میں اصلاحات کرنے اور درست قوانین بنانے کا کوئی ایسا ضابطہ موجود نہیں جو اشکال اور عیب سے خالی ہو لہٰذا بہت سے علماء اور ماہرین اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے ساتھ کہ افراد معاشرہ کی اکثریت کی نظر اکثر اوقات اشتباہ آمیز ہوتی ہے اس بات کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ دوسرے راستوں کے عیوب اس سے زیادہ ہیں۔

لیکن ایک ایسا معاشرہ جو انبیاء علیہم السلام کی رسالت پر ایمان رکھتا ہو وہ قوانین کے نفاذ اور برپا کرنے کے لیے اکثریت کی پیروی کی کوئی مجبوری نہیں رکھتا۔ کیونکہ سچے انبیاء کے پروگرام اور قوانین ہر قسم کے نقص، عیب اور اشتباہ سے خالی ہوتے ہیں اور جن قوانین کی جائز الخطا اکثریت تصویب وتصدیق کرتی ہے ان کا ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

آج کی دنیا کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالنے اور ان حکومتوں پر جو اکثریت کی بنیاد پر قائم ہوتی ہیں نظر کرنے اور ان نادرست اور ہوس آمیز قوانین کو جو بعض اوقات اکثریتوں کی طرف سے تائید وتصویب شدہ ہوتے ہیں دیکھنے سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ اکثریت عددی نے کسی درد کی دوا نہیں کی ہے۔ بہت سی جنگوں کی اکثریت نے ہی تصویب کی تھی اور بہت سے مفاسد کو اکثریت نے ہی چاہا تھا۔

استعمار واستثمار، جنگیں اور خونریزیاں، شراب نوشی کی آزادی، قمار بازی، اسقاط حمل، فحشاء ومنکر یہاں تک کہ بعض ایسے قبیح وشنیع افعال کہ جن کا ذکر باعث شرم ہے بہت سے ایسے ممالک جو اصطلاح میں ترقی یافتہ کہلاتے ہیں کے نمائندوں کی اکثریت کی طرف سے ہیں جو ان ممالک کے عوام کی اکثریت کے نظریہ کو منعکس کرتے تھے، اس حقیقت پر

گواہ ہیں۔

علمی نکتہ نظر سے کیا عوام کی اکثریت سچ ہی بولتی ہے؟ کیا اکثریت امین ہوتی ہے؟ کیا اکثریت دوسروں کے حقوق پر تجاوز کرنے سے اگر وہ کرسکے تو اجتناب کرتی ہے؟ کیا اکثریت اپنے اور دوسروں کے منافع کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے!

ان سوالات کے جواب بغیر کہے ظاہر ہیں۔ اس بناء پر اس حقیقت کا اعتراف کرلینا چاہیے کہ آج کی دنیا کا اکثریت پر اعتبار اور بھروسہ کرنا حقیقت میں ایک قسم کی مجبوری اور ماحول کی ضرورت ہے اور ایک ایسی بڈی ہے کہ جو معاشروں کے گلے میں پھنسی ہوئی ہے۔

ہاں انسانی معاشروں کے صاحبان فکر و نظر اور دل سوز مصلحین اور بامقصد سوچ رکھنے والے جو ہمیشہ اقلیت میں ہوتے ہیں اگر عوام ان س کو روشنی بخشنے کے لیے ہمہ جہتی تلاش و کوشش کریں اور انسانی معاشرے کافی حد تک فکری، اخلاقی اور اجتماعی رشد پالیں تو مسلمہ طور پر اس قسم کی اکثریت کے نظریات حقیقت کے بہت قریب ہوں گے۔ لیکن غیر رشید اور ناآگاہ یا فاسد، منحرف اور گمراہ اکثریت کونسی مشکل اپنے اور دوسروں کے راستوں سے ہٹا سکے گی۔ اس بناء پر محض اکثریت اکیلی کافی نہیں ہے بلکہ صرف وہی اکثریت کہ جو ہدایت یافتہ ہو اپنے معاشرے کی مشکلات کو اس حد تک کہ جو امکان بشر میں ہے حل کرسکتی ہے۔

اگر قرآن مختلف آیات میں اکثریت کے بارے میں اعتراض کرتا ہے تو اس میں شک نہیں ہے کہ اس کی مراد ایسی اکثریت ہے کہ جو غیر رشید ہو اور ہدایت یافتہ نہ ہو۔

۱۱۸۔ فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ○

۱۱۹۔ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ○

۱۲۰۔ وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ○

ترجمہ

۱۱۸۔ اور جس (ذبیحہ) پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اس سے کھاؤ۔ (لیکن ان جانوروں کے گوشت سے کہ جن کو ذبح کرتے وقت ان پر خدا کا نام نہیں لیا گیا نہ کھاؤ) اگر تم اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔

۱۱۹۔ تم اُن چیزوں میں سے کیوں نہیں کھاتے کہ جن پر خدا کا نام لیا گیا ہے۔ حالانکہ (خداوند تعالیٰ نے) جو کچھ تم پر حرام تھا اُسے بیان کر دیا ہے۔ مگر یہ کہ تم مجبور ہو جاؤ، (کہ اس صورت میں اس قسم کے جانور کا گوشت کھانا جائز ہے) اور بہت سے لوگ (دوسروں کو) ہوا و ہوس اور بے علمی کی وجہ سے گمراہ کر دیتے ہیں اور تیرا پروردگار تجاوز کرنے والوں کو بہتر طور پر پہچانتا ہے۔

۱۲۰۔ آشکارا اور مخفی گناہوں کو چھوڑ دو کیونکہ جو لوگ گناہ کماتے ہیں انہیں اُن کے بدلے میں سزا دی جائے گی۔

تفسیر

شرک کے تمام آثار مٹ جانے چاہئیں

یہ آیات حقیقت میں توحید و شرک کے بارے میں گذشتہ مباحث کے نتائج میں سے ایک ہیں۔ لہٰذا پہلی آیت "فاء" تفریع کے ساتھ آئی ہے جو عام طور پر نتیجہ کے بیان کے لیے ہوتی ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ گذشتہ آیات میں مختلف بیانات کے ساتھ حقیقتِ توحید کا اثبات اور شرک و بت پرستی کا بطلان واضح ہوا ہے۔ اس مسئلہ کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اُن جانوروں کے گوشت کھانے سے جو "بتوں" کے نام پر ذبح ہوتے ہیں احتراز کریں اور صرف ان جانوروں کے گوشت سے استفادہ کریں کہ جو خدا کے نام پر ذبح ہوتے ہیں۔ کیونکہ مشرکین عرب کی ایک عبادت یہ تھی کہ وہ بتوں کے لیے قربانی کرتے تھے اور اُن کے گوشت سے تبرک کے طور پر کھاتے تھے اور یہ کام ایک قسم کی بت پرستی ہی تھا۔

لہٰذا پہلے کہا گیا ہے: ان چیزوں سے کھاؤ کہ جن پر اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھتے ہو (فکلوا مما ذکر اسم الله علیه ان کنتم بآیاته مؤمنین)۔

یعنی ایمان محض دعوے، گفتار اور عقیدے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کا اظہار عمل سے بھی ہونا چاہیے۔ جو شخص خدائے یکتا پر ایمان رکھتا ہے وہ صرف اسی قسم کے گوشت میں سے کھاتا ہے۔ البتہ امر "کُلُوا" (کھاؤ) یہاں اس قسم کے گوشت کے کھانے کے وجوب کے لیے نہیں ہے بلکہ حقیقت میں اس سے مراد اس کا مباح ہونا اور اس کے غیر کا حرام ہونا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس گوشت کا حرام ہونا کہ جس کے ذبح کے وقت اُس پر خدا کا نام نہیں لیا جاتا، اس نکتہ نظر سے نہیں ہے کہ یہ بات صحتِ عامہ کے پہلو سے ہے کہ یہ کہا جائے کہ نام لینے سے کیا اثر ہوتا ہے، بلکہ اس کا ربط معنوی و اخلاقی پہلوؤں اور توحید پرستی کی بنیادوں کو محکم کرنے کے ساتھ ہے۔

بعد والی آیت میں یہی بات دوسری عبارت سے بیان کی گئی ہے جو اور زیادہ استدلال کے ساتھ ہے، فرمایا ہے: تم اُن جانوروں سے کیوں نہیں کھاتے کہ جن پر اللہ کا نام لیا گیا ہے؟ حالانکہ جو کچھ تم پر حرام ہے خدا نے اس کی تشریح کر دی ہے (ومالکم الا تاکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ وقد فصّل لکم ما حرم علیکم)۔

ہم یہ بات دوبارہ دل نشین کراتے ہیں کہ یہ توبیخ و تاکید حلال گوشت کے کھانے کو ترک کرنے کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ صرف اِن گوشتوں سے کھانا چاہیے اور ان کے سوا دوسرے گوشتوں سے استفادہ نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے لفظوں میں نظر نقطہ مقابل اور مفہوم جملہ پر ہے۔ اسی لیے "قد فصّل لکم ما حرم علیکم" (خدا نے اس کی تشریح کر دی ہے جو تم پر حرام ہے) کے جملہ سے استدلال کیا گیا ہے۔

اس بارے میں کہ یہ بات کس سورۃ اور کس آیت میں آئی ہے کہ جس میں حلال حرام گوشت کی وضاحت کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اس سے مراد سورۂ مائدہ ہے یا اسی سورہ کی بعض آیات ہیں جو آئندہ آئیں گی (مثلاً آیہ ۱۴۵) لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور سورہ مائدہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور اس سورت کی آئندہ آنے والی آیات بھی ان آیات کے نزول کے وقت ابھی تک نازل نہیں ہوئی تھیں، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں احتمالات میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس سے مراد یا تو سورہ نحل کی آیہ ۱۱۵ ہے کہ جس میں صراحت کے ساتھ حرام گوشتوں کی بعض اقسام کا بیان آیا ہے اور خصوصاً وہ جانور جو غیر خدا کے لیے ذبح ہوئے ہوں اور یا اس سے مراد اُن گوشتوں کے بارے میں حکم ہے جو پیغمبرؐ کے وسیلہ سے دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ وہ کوئی حکم وحی الٰہی کے بغیر نہیں دیتے تھے۔

پھر ایک صورت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر اس صورت میں کہ تم مجبور ہو جاؤ (الا ما اضطررتم الیہ)۔ چاہے یہ اضطرار بیابان میں گرفتار ہو جانے اور شدید بھوک کی وجہ سے ہو یا مشرکین کے چنگل میں گرفتار ہونے اور ان کے اس امر پر مجبور کرنے کی وجہ سے ہو۔

اس کے بعد مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: بہت سے لوگ دوسروں کو جہل و نادانی اور ہوا و ہوس کی بناء پر گمراہ کرتے ہیں (وان کثیرًا لیضلون باھوائھم بغیر علم)۔

اگرچہ ہوا پرستی اور جہل و نادانی اکثر ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان دونوں کا ذکر زیادہ تاکید کے لیے اکٹھا کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے "باھوائھم بغیر علم"

ضمنی طور پر اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ علم حقیقی ہرگز ہوا پرستی اور خیال آرائی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا اور جہاں یہ ان سے جا ملے وہ جہالت ہے نہ کہ علم و دانش۔

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے مندرجہ بالا جملہ اس خیال و تصور کی طرف اشارہ ہو جو مشرکین عرب میں موجود تھا کہ وہ مردہ جانوروں کا گوشت کھانے کے لیے اس طرح کا استدلال کیا کرتے تھے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جانور جنہیں ہم خود ذبح کریں انہیں تو ہم حلال سمجھ لیں لیکن جنہیں ہمارے خدا نے مارا ہے اسے ہم حرام شمار کریں؟

یہ بات ظاہر ہے کہ یہ سفسطہ ایک بیہودہ خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، کیونکہ خدا نے مردہ جانور کو ذبح نہیں

کیا اور اس کا سر نہیں کاٹا کہ ان جانوروں کے ساتھ قیاس کریں جنہیں ہم نے ذبح کیا ہے اور اسی دلیل سے وہ قسم قسم کی بیماریوں کا مرکز ہے اور اس کا گوشت فاسد اور خراب ہے، لہٰذا خداوند تعالیٰ نے اس کے کھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار ان لوگوں کے بارے میں کہ جو تجاوز کار اور زیادتی کرنے والے ہیں زیادہ آگاہ ہے (ان ربك هو اعلم بالمعتدين)۔

ایسے ہی لوگ فضول اور بودی دلیلوں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ راہ حق سے منحرف ہو جاتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی منحرف کر دیں۔

چونکہ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس فعل حرام کا چھپ کر اور پوشیدہ طور پر انجام دیں لہٰذا اس کے ساتھ ہی اگلی آیت میں ایک قانون کلی کے طور پر کہا گیا ہے: آشکارا اور پنہاں گناہ چھوڑ دو (وذروا ظاهر الاثم و باطنه)۔

کہتے ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ منافی عفت عمل (زنا) اگر چھپ کر کیا جائے تو کوئی عیب نہیں ہے وہ صرف اس صورت میں گناہ ہے کہ اگر اُسے آشکارا اور ظاہر بظاہر کیا جائے۔ آج بھی کچھ لوگوں نے عملی طور پر اسی جاہلانہ منطق کو اپنایا ہوا ہے اور صرف آشکارا اور ظاہر بظاہر گناہوں سے پریشان اور وحشت زدہ ہوتے ہیں لیکن چھپ کر گناہ کا ارتکاب کسی پریشانی کے بغیر کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیت نہ صرف مذکورہ بالا منطق کی مذمت کرتی ہے بلکہ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے کہ جو اس کے علاوہ کہ جو بیان کیا جا چکا ہے، دوسرے مفاہیم و تفاسیر کو بھی، جو "ظاہر" اور "باطن" گناہ کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں، اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ ظاہری گناہوں سے مراد وہ گناہ ہیں جو اعضاء بدن کے ساتھ انجام پاتے ہیں اور باطنی گناہ سے مراد وہ گناہ ہیں جو دل، نیت اور تصمیم و ارادہ کے ذریعہ صورت پذیر ہوتے ہیں۔

اس کے بعد یاد دہانی اور گنہگاروں کو تہدید کے طور پر اس بدبختی کے بارے میں جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں قرآن یوں کہتا ہے: وہ لوگ کہ جو گناہوں کا ارتکاب کر رہے ہیں بہت جلد اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں گے (ان الذين يكسبون الاثم سيجزون بما كانوا يقترفون)۔

"کسب گناہ" کی تعبیر (يكسبون الاثم) ایک عمدہ اور جالب نظر تعبیر ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ افراد انسانی اس جہان میں اُن سرمایہ داروں کی طرح ہیں جو ایک بہت بڑے بازار میں قدم رکھتے ہیں اُن کا سرمایہ ہوش، عقل، عمر، اور جوانی اور قسم قسم کی خداداد قوتیں ہیں وہ لوگ کتنے بدبخت ہیں جو سعادت، افتخار، مقام، تقویٰ اور قرب خدا کے حصول کی بجائے گناہ کمانے میں لگے رہیں۔

"سیجزون" (عنقریب اپنی جزا دیکھیں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر چہ بعض کی نظر میں قیامت دور ہے لیکن حقیقت میں وہ بہت قریب ہے اور یہ جہان بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور قیامت آجائے گی، یا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ زیادہ تر افراد اس دنیاوی زندگی میں ہی اپنے بُرے اعمال کے نتائج انفرادی اور

اجتماعی ردعمل کے طور پر دیکھیں گے۔

۱۲۱۔ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ۝

ترجمہ

۱۲۱۔ اور اس (ذبیحہ) سے کہ جس پر خدا کا نام نہیں لیا گیا، نہ کھاؤ، اور یہ فعل گناہ ہے اور شیاطین اپنے دوستوں کو مخفی طور پر کچھ مطالب القا کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے مجادلے اور جھگڑے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔

تفسیر

گذشتہ آیات میں مسئلہ کے مثبت پہلو یعنی حلال گوشت کھانے کا ذکر کیا گیا تھا لیکن اس آیت میں زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے منفی پہلو اور اس کے مفہوم کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان گوشتوں میں سے کہ جن پر خدا کا نام ان کے ذبح کے وقت نہیں لیا گیا نہ کھاؤ (ولا تأکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ)۔

اس کے بعد نئے سرے سے ایک مختصر سے جملے کے ساتھ اس عمل کو جرم قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ کام فسق و گناہ ہے اور راہ و رسم بندگی اور فرمان خدا کی اطاعت سے خروج ہے (وانہ لفسق)۔

نیز اس غرض سے کہ بعض سادہ لوح مسلمان ان کے شیطانی وسوسوں کا اثر قبول نہ کرلیں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ شیاطین وسوسہ انگیز مطالب مخفی طور پر اپنے دوستوں کو القا کرتے ہیں تاکہ وہ تمہارے ساتھ مجادلہ کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں (وان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم لیجادلوکم)۔

لیکن تم ہوش و حواس کے ساتھ رہو کیونکہ " اگر تم نے ان کے وسوسوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا تو تم بھی مشرکین کی صف میں شامل ہو جاؤ گے (وان اطعتموھم انکم لمشرکون)۔

یہ مجادلہ اور وسوسہ شاید اسی منطق کی طرف اشارہ ہو جو مشرکین ایک دوسرے کی طرف القا کیا کرتے تھے (اور بعض نے کہا ہے کہ مشرکین عرب نے اسے مجوسیوں سے سیکھا تھا) کہ اگر ہم مردہ جانور کا گوشت کھاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے خدا نے مارا ہے لہٰذا وہ اس جانور سے بہتر ہے جسے ہم مارتے ہیں، یعنی مردار نہ کھانا خدا کے کام سے ایک قسم کی بے اعتنائی ہے۔

وہ اس (حقیقت) سے غافل ہیں کہ جو اپنی طبیعی موت مرتا ہے وہ اس بات کے علاوہ کہ اکثر بیمار ہوتا ہے، اس کا سر نہیں کاٹا جاتا اور گندہ اور گاڑھا خون اس کے گوشت کے اندر ہی رہ جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے اور فاسد اور خراب ہو جاتا ہے اور وہ گوشت کو بھی آلودہ اور فاسد کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ صرف اس جانور کا گوشت کھاؤ جو مخصوص شرائط کے ساتھ ذبح ہوا ہے اور اس کا خون باہر گرا ہے۔

ضمنی طور پر ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ غیر اسلامی ذبیحہ حرام ہے کیونکہ دیگر جہات کے علاوہ اس کے ذبح کے وقت غیر مسلم خدا کا نام لینے کے پابند نہیں ہوتے۔

۱۲۲۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۱۲۳۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۲۔ وہ جو کہ مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور اس کے لیے ایک نور قرار دیا کہ جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، کیا اس شخص کی مانند ہے کہ جو تاریکیوں میں ہو اور اس سے باہر نہ نکلے۔ اس طرح کفار کے لیے وہ (برے) اعمال جو وہ انجام دیتے تھے زینت دیئے گئے ہیں (اور خوبصورت دکھائی دیتے ہیں)۔

۱۲۳۔ اور ہم نے اسی طرح سے ہر ہر شہر اور ہر ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم قرار دیئے ہیں، (ایسے افراد کہ ہم نے جن کے اختیار میں ہر قسم کی قدرت دے دی تھی لیکن انہوں نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا اور غلط راستے پر چل پڑے) اور آخر کار ان کا معاملہ اس حد کو پہنچ گیا کہ وہ مکر (کرنے اور لوگوں کو دھوکا دینے) میں مشغول ہو گئے۔ لیکن (فی الحقیقت) وہ صرف اپنے آپ کو ہی (دھوکا اور) فریب دیتے ہیں اور سمجھتے نہیں ہیں۔

شانِ نزول

پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں یوں نقل ہوا ہے :

ابوجہل جو اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت ہی سخت دشمنوں میں سے تھا، ایک دن اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت تکلیف پہنچائی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہادر چچا حضرت حمزہ جو اُس دن تک ایمان نہیں لائے تھے اور اسی طرح آپ کے دین کے بارے میں مطالعہ اور سوچ بچار کر رہے تھے اور اُس دن اپنے معمول کے مطابق شکار کے لیے بیابان میں گئے ہوئے تھے، جب بیابان سے واپس آئے تو ابوجہل اور اپنے بھتیجے کے مابین ہونے والے ماجرے سے باخبر ہوئے۔ انہیں بہت غصہ آیا، وہ فوراً ابوجہل کی تلاش میں نکل پڑے۔ وہ ملا تو اس کے سر پا ناک پر اس طرح مارا کہ خون جاری ہو گیا۔ ابوجہل نے اُس تمام نفوذ و اقتدار کے باوجود جو وہ اپنی قوم و قبیلہ، بلکہ مکہ کے لوگوں کے درمیان رکھتا تھا حضرت حمزہ کی بہت زیادہ شجاعت کو دیکھتے ہوئے کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کیا۔

اس کے بعد حمزہ، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں نکلے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس دن سے باقاعدہ اسلام کے ایک افسر رشید کے طور پر آخر عمر تک اس آسمانی دین کا دفاع اور اس کی حفاظت کرتے رہے۔

اوپر والی آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس میں حمزہ کے ایمان اور ابوجہل کے کفر و شرک میں پائیداری کو مشخص کیا گیا ہے۔

بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت عمار یاسر کے ایمان لانے اور ابوجہل کے کفر پر اصرار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

بہر حال یہ آیت بھی قرآن کی دوسری آیات کی طرح ہی اپنے محلِ نزول کے ساتھ ہی اختصاص نہیں رکھتی اور ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ہر سچے مومن اور ہر بے ایمان اور ہٹ دھرم پر صادق آتی ہے۔

تفسیر

ایمان اور نورِ نظر

ان آیات کا قبل کی آیات کے ساتھ ربط اس لحاظ سے ہے کہ گذشتہ آیات میں دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے، مومن خالص اور ہٹ دھرم کافر جو نہ صرف یہ کہ خود ایمان نہیں لاتا بلکہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی سختی سے کوشش بھی کرتا ہے، یہاں بھی دو جالب اور عمدہ مثالیں ذکر کرکے ان دونوں گروہوں کی کیفیت کو مجسم کیا گیا ہے۔

پہلے اُن افراد کو جو گمراہی میں تھے پھر انہوں نے حق اور ایمان کو قبول کرکے اپنے راستے کو بدل لیا انہیں اس مردہ

سے تشبیہ دی ہے کہ جو خدا کے ارادہ اور فرمان سے زندہ ہو گیا ہو (اومن کان میتاً فاحییناہ)۔

قرآن میں بارہا "موت" اور "حیات" معنوی موت وحیات اور کفر وایمان کے معنی میں آئی ہے اور یہ تعبیر اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتی ہے کہ ایمان ایک خشک اور خالی عقیدہ یا کوئی تکلفاتی الفاظ نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک ایسی روح کی مانند ہے کہ جو بے ایمان افراد کے بے جان جسم میں پھونکی جاتی ہے اور وہ اُن کے تمام وجود میں اثر کرتی ہے، اُن کی آنکھوں میں بینائی اور روشنی آجاتی ہے، اُن کے کانوں میں سننے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، زبان میں طاقت گویائی اور ہاتھ پاؤں میں ہر قسم کے مثبت کام انجام دینے کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایمان افراد کو دگرگوں کر دیتا ہے اور اُن کی ساری زندگی میں اثر انداز ہوتا ہے اور زندگی کے آثار کو ان کے تمام حالاتِ زندگی میں آشکار و واضح کرتا ہے۔

"فاحییناہ" (ہم نے اُسے زندہ کیا) کے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اگرچہ خود انسان کی اپنی سعی وکوشش سے صورت پذیر ہونا چاہیے لیکن جب تک خدا کی طرف سے کشش نہ ہو یہ کوششیں انجام کو نہیں پہنچتی۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہم نے ایسے افراد کے لیے نور قرار دیا ہے کہ جس کی روشنی میں وہ لوگوں کے درمیان چلیں پھریں (وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس)۔

اگرچہ مفسرین نے اس بارے میں کئی احتمال ذکر کیے ہیں کہ اس "نور" سے کیا مراد ہے لیکن ظاہری طور پر اس سے صرف قرآن اور تعلیمات پیغمبرؐ ہی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کے علاوہ خدا پر ایمان انسان کو نورِ بصیرت اور ایک نیا ادراک بخشتا ہے اور ایک خاص قسم کا نورِ بصیرت اس کو عطا کرتا ہے، اس کی نگاہ کے افق کو مادی محدود زندگی اور عالم مادہ کی چہار دیواری سے نکال کر ایک بہت ہی وسیع عالم میں لے جاتا ہے۔

اور چونکہ وہ انسان کو خود سازی کی دعوت دیتا ہے تو خود خواہی، خود بینی، تعصب، ہٹ دھرمی اور ہوا وہوس کے پردے اس کی روح کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیتا ہے اور وہ ایسے حقائق دیکھنے لگ جاتا ہے کہ جن کے ادراک کی اس سے قبل ہرگز قدرت نہیں رکھتا تھا۔

اس نور کے پرتو میں وہ لوگوں کے درمیان اپنی زندگی کی راہ تلاش کر سکتا ہے اور وہ بہت سے ایسے اشتباہات سے کہ جن میں دوسرے لوگ طمع اور لالچ کی خاطر اور مادی محدود فکر کی وجہ سے یا خود خواہی اور ہوا وہوس کے غلبہ کے باعث گرفتار ہو جاتے ہیں مامون ومحفوظ رہ جاتا ہے۔ نیز یہ جو اسلامی روایات میں ہے کہ:

المؤمن ینظر بنور اللہ

مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اگرچہ ان تمام باتوں کے باوجود اس خاص نورِ بصیرت کی کہ جو صاحب ایمان انسان میں پیدا ہو جاتا ہے بیان وقلم سے پھر بھی توصیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس کا ذائقہ چکھنا چاہیے اور اُس کے وجود کو محسوس کرنا چاہیے۔

اس کے بعد ایسے زندہ، فعال، نورانی اور موثر افراد کا ہٹ دھرم بے ایمان افراد کے ساتھ مقابلہ وموازنہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا ایسا شخص اُس شخص کی مانند ہے کہ جو ظلمتوں اور تاریکیوں کی امواج میں ڈوبا ہوا ہے اور ہرگز اس سے

باہر نہیں نکل سکتا (کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ نہیں کہتا کہ "کمن فی الظلمات" (اس شخص کی طرح جو ظلمات میں ہے) بلکہ یوں کہتا ہے "کمن مثلہ فی الظلمات" "اس شخص کی طرح کہ جس کی مثل ظلمات میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس تعبیر سے ہدف و مقصد یہ تھا کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اس قسم کے افراد اس قدر تاریکی اور بدبختی میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ان کی وضع و کیفیت ایک ضرب المثل بن گئی ہے کہ جس سے تمام باسمجھ افراد آگاہ ہیں۔

لیکن ممکن ہے کہ یہ تعبیر ایک لطیف تر معنی کی طرف اشارہ ہو اور وہ یہ کہ: ایسے افراد کی ہستی اور وجود سے حقیقت میں ایک قالب اور ایک مجسمہ کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی ہے، وہ ایک ایسا ہیکل رکھتے ہیں کہ جو روح کے بغیر ہے اور ایسا دماغ اور فکر رکھتے ہیں جو بے کار ہو چکی ہے۔

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی لازمی ہے کہ مومنین کا راہنما "نور" (صیغہ مفرد کے ساتھ) اور کفار کا محیط "ظلمات" (صیغہ جمع کے ساتھ) بیان کیا گیا ہے، کیونکہ ایمان صرف ایک ہی حقیقت ہے اور وحدت و یگانگی کی رمز ہے اور کفر و بے ایمانی، پراگندگی، تفرقہ اور پھوٹ کا سرچشمہ ہے۔

آیت کے آخر میں اس بدبختی کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کفار کے اعمال کو ان کی نظروں میں اسی طرح سے زینت دے دی گئی ہے (کذالک زین للکفرین ما کانوا یعملون)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ بُرے عمل کے تکرار کی خاصیت ہے کہ آہستہ آہستہ اس کی برائی نظر میں کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ اس کی نظروں میں ایک اچھا کام معلوم ہونے لگتا ہے اور ایک زنجیر کی مانند اس کے ہاتھ پاؤں میں پڑ جاتا ہے اور اپنے جال سے نکلنے کی اسے اجازت نہیں دیتا، تباہ کاروں کے حالات کا ایک سرسری مطالعہ اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔

اور چونکہ منفی جہت سے اس ماجرے کا ہیرو ابوجہل تھا اور وہ مشرکین مکہ اور قریش کے سرداروں میں شمار ہوتا تھا لہٰذا دوسری آیت میں ان گمراہ رہبروں اور کفر و فساد کے زعماء کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ہر شہر اور آبادی میں اسی طرح سے ایسے بڑے بڑے لوگ قرار دیئے ہیں کہ جنہوں نے گناہ کا راستہ اختیار کر لیا اور مکر و فریب اور دھوکا بازی کے ذریعے لوگوں کو راستے سے منحرف کر دیا (وکذالک جعلنا فی کل قریۃ اکابر مجرمیھا لیمکروا فیھا)۔

ہم نے بارہا یہ کہا ہے کہ اس قسم کے افعال کی خدا کی طرف نسبت اس بنا پر ہے کہ وہ مسبب الاسباب اور تمام قدرتوں کا سرچشمہ ہے اور جو شخص جس کام کو سرانجام دیتا ہے وہ ان امکانات و وسائل کے ساتھ سرانجام دیتا ہے کہ جو خدا نے اس کے اختیار میں دیئے ہیں۔ اگرچہ کچھ لوگ ان سے اچھا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض لوگ ان ہی وسائل سے بُرے کام انجام دیتے ہیں۔

"لیمکروا" (تاکہ وہ مکر و فریب کو کام میں لائیں) کا جملہ ان کے سرانجام کے معنی میں ہے۔ یہ ان کی خلقت کا

ہدف نہیں ہے[1] یعنی نافرمانی اور بکثرت گناہوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ راہ حق کے رہزن بن گئے اور بندگانِ خدا کو راہ سے منحرف کر دیا۔ کیونکہ "مکر" اصل میں گرم کرنے اور مروڑنے کے معنی میں ہے بعدازاں ہر اُس انحرافی کام کے لیے کہ جو مخفیانہ اور چھپ چھپا کر کیا جائے "استعمال ہونے لگا۔

آیت کے آخر میں کہا گیا ہے: وہ اپنے سوا کسی کو بھی فریب اور دھوکا نہیں دیتے، لیکن وہ سمجھتے نہیں ہیں اور متوجہ نہیں ہیں (وما یمکرون الا بانفسھم وما یشعرون)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا مکر و فریب ہوگا کہ وہ اپنے وجود کا تمام سرمایہ چاہے وہ فکر، ہوش، عقل، عمر اور وقت ہو یا مال و دولت ایسی راہ میں استعمال کرتے ہیں کہ جو نہ صرف یہ کہ اُن کے لیے سودمند نہیں بلکہ ان کی پشت کو بار مسئولیت اور گناہ سے بھی بوجھل کر دیتا ہے جب کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ مفاسد اور بدبختیاں جو معاشروں کو دامن گیر ہوتی ہیں ان کا سرچشمہ قوموں کے بڑے اور سردار ہی ہوتے ہیں اور وہی لوگ ہوتے ہیں جو قسم قسم کے حیلوں اور فریب کاریوں کے ذریعہ راہ حق کو دگرگوں کر کے حق کے چہرے کو لوگوں پر پوشیدہ کر دیتے ہیں۔

۱۲۴۔ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۲۴۔ اور جس وقت کوئی آیت ان کے لیے آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ہمیں بھی ویسی ہی چیز نہ دی جائے جیسی کہ خدا کے پیغمبروں کو دی گئی ہے۔ خدا ہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے، وہ لوگ کہ جو گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (اور انہوں نے اپنی حیثیت و مقام کو بچانے کے لیے لوگوں کو راہِ حق سے منحرف کیا ہے) وہ بہت جلدی اپنے مکر (اور فریب اور چالبازی) کے بدلے میں جو وہ کیا کرتے تھے، بارگاہ خداوندی میں ذلیل ہوں گے اور عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے۔

---

[1] اصطلاح کے مطابق "لام" "غایت کا" "لام" ہے بلکہ عاقبت کا لام ہے کہ جس کے قرآن میں متعدد نمونے موجود ہیں۔

شانِ نزول

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت ولید بن مغیرہ کے بارے میں (کہ جو بت پرستوں کے مشہور سرداروں میں سے تھا اور اصطلاح کے مطابق ان کا دماغ سمجھا جاتا تھا) نازل ہوئی ہے۔ وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتا تھا کہ اگر نبوت سچی بات ہے تو میں یہ مقام حاصل کرنے کا آپ سے زیادہ حقدار ہوں، کیونکہ ایک تو میرا سن آپ سے زیادہ ہے اور دوسرے میرے پاس مال و دولت بھی آپ سے زیادہ ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ یہ خیال کرتا تھا کہ مسئلہ نبوت بھی رقابتوں کا مرکز بنے، وہ کہتا تھا کہ ہم اور قبیلہ بنی عبد مناف (پیغمبر کا قبیلہ) ہر چیز میں ایک دوسرے کے رقیب تھے اور گھوڑ دوڑ کے دو گھوڑوں کی طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش جا رہے تھے یہاں تک کہ انہوں نے یہ دعویٰ کر دیا کہ ہمارے درمیان میں سے ایک پیغمبر مبعوث ہوا ہے جس پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن یہ بات ممکن نہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئیں مگر یہ کہ ہم پر بھی وحی اُترے جس طرح اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔

تفسیر

پیغمبر کا انتخاب خدا کے ہاتھ میں ہے

اس آیت میں ان باطل گدی نشینوں اور سرداروں اور "اکابر مجرمیھا" کے طرزِ فکر اور مضحکہ خیز دعوے کی طرف ایک مختصر اور پر معنی اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: جب خدا کی طرف سے کوئی آیت ان کی ہدایت کے لیے بھیجی گئی تو انہوں نے کہا: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے مگر یہ کہ ہمیں بھی وہی مقامات اور آیات جو خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں کو عطا ہوتی ہیں دی جائیں (و اذا جاءتھم اٰیة قالوا لن نؤمن حتّٰی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللّٰہ)۔

ان کے خیال میں جیسے مقام رسالت اور خلق کی رہبری کا حصول سن وسال اور مال و دولت پر موقوف ہے یا قبائل کی بچگانہ رقابتوں پر اور گویا خدا بھی اس بات کا پابند ہے کہ وہ ان بے بنیاد اور مضحکہ خیز رقابتوں کا خیال کرے اور انہیں صحیح قرار دے۔ ایسی رقابتیں کہ جن کا سرچشمہ انحطاط فکری ہو، جو مفہوم نبوت اور انسانوں کی رہبری کی فکر سے دور ہوں۔

قرآن انہیں واضح جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: اس کی ضرورت نہیں کہ تم خدا کو سبق دو کہ وہ اپنے پیغمبروں اور رسولوں کو کس طرح بنائے اور کن لوگوں میں سے ان کا انتخاب کرے کیونکہ "خدا سب سے بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کو کہاں قرار دے" (اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ)۔

یہ بات صاف ظاہر اور بالکل واضح ہے کہ رسالت نہ تو سن وسال اور مال و دولت سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ

ہی قبائل کی حیثیت سے۔ بلکہ ہر چیز سے پہلے اس کی شرط روح کی آمادگی، ضمیر کی پاکیزگی، اصل انسانی خصائل و صفات، فکر بلند، قوت نظر اور آخری طور پر غیر معمولی تقویٰ و پرہیزگاری کا مرحلۂ عصمت میں ہونا ہے اور ان صفات کا موجود ہونا خصوصاً مقام عصمت کے لیے آمادگی ایسی چیز ہے جسے خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ ان شرائط اور ان کی سوچ کے درمیان کس قدر فرق ہے۔

جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی سوائے وحی و تشریع کے نبی کی تمام صفات اور پروگراموں کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی وہ محافظ شرع و شریعت بھی ہے، اس کے مکتب و قوانین کا پاسدار بھی ہے اور لوگوں کا روحانی اور دنیا کا رہبر بھی ہے۔ لہٰذا اُسے بھی مقام عصمت پر فائز اور خطا و گناہ سے مامون و محفوظ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی پیغام رسانی کو بار آور کر سکے اور رہبر مطاع اور قابلِ اعتماد نمونہ ہو۔ اسی دلیل سے اس کا انتخاب بھی خدا ہی کے اختیار میں ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس مقام کو وہ کہاں قرار دے، نہ کہ خلق خدا۔ نہ ہی لوگوں کے انتخاب اور شوریٰ سے یہ ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں اس قسم کے مجرموں اور باطل دعوے کرنے والے رہبروں کے اس انجام کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے انتظار میں ہے ارشاد ہوتا ہے: عنقریب یہ گنہگار لوگ اس مکر و فریب کی وجہ سے جو وہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کرتے تھے ذلت و حقارت اور عذاب شدید میں گرفتار ہوں گے (سیصیب الذین اجرموا صغار عند اللہ و عذاب شدید بما کانوا یمکرون)۔[1]

یہ خود خواہ لوگ چاہتے تھے کہ اپنے غلط کاموں کے ذریعہ اپنی حیثیت، مقام اور مرتبے کی حفاظت کریں لیکن خدا انہیں اس طرح حقیر کرے گا کہ وہ دردناک روحانی گرفت کا احساس کریں گے، علاوہ ازیں چونکہ راہِ باطل میں ان کی باؤ ہو زیادہ اور ان کی سعی و کوشش سخت تھی لہٰذا ان کی سزا اور عذاب بھی "شدید" اور پر سر و صدا ہوگا۔

۱۲۵۔ فَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یَّہۡدِیَہٗ یَشۡرَحۡ صَدۡرَہٗ لِلۡاِسۡلَامِ ۚ وَ مَنۡ یُّرِدۡ اَنۡ یُّضِلَّہٗ یَجۡعَلۡ صَدۡرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا کَاَنَّمَا یَصَّعَّدُ فِی السَّمَآءِ ؕ کَذٰلِکَ یَجۡعَلُ اللّٰہُ الرِّجۡسَ عَلَی الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ○

۱۲۶۔ وَ ہٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ مُسۡتَقِیۡمًا ؕ قَدۡ فَصَّلۡنَا الۡاٰیٰتِ

---

[1] "اجرام" مادہ "جرم" سے اصل میں قطع کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ گنہگار افراد رشتوں اور ناتوں کو قطع کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو فرمانِ خدا کی اطاعت سے الگ کر لیتے ہیں لہٰذا یہ لفظ گناہ کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور اس میں اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذات میں حق و پاکیزگی اور عدالت کے ساتھ ایک رشتہ رکھتا ہے اور گناہ سے آلودگی فی الواقع فطرتِ الٰہیہ سے علیحدگی ہے۔

لِقَوۡمٍ یَّذَّکَّرُوۡنَ ○

۱۲۷۔ لَهُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَهُوَ وَلِیُّهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۲۵۔ جس شخص کے لیے خدا چاہتا ہے کہ ہدایت کرے اس کے سینہ کو (قبول کرنے کے لیے) کشادہ کر دیتا ہے اور جس شخص کو (اس کے بُرے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کرنا چاہے اُس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اس طرح خدا پلیدی ایسے افراد کے لیے قرار دے دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

۱۲۶۔ اور یہ صراط مستقیم (اور ہمیشہ کی سنت) تیرے پروردگار کی ہے ہم ایسے افراد کے لیے کہ جو پند و نصیحت حاصل کرتے ہیں اپنی آیات کو کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔

۱۲۷۔ اُن کے لیے ان کے پروردگار کے پاس امن و امان کا گھر ہو گا اور وہ ان کا ولی، دوست اور مددگار ہے اُن (نیک) اعمال کی وجہ سے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

خدائی امداد

گذشتہ آیات کہ جو سچے مومنین اور ہٹ دھرم کفار کے بارے میں بحث کر رہی تھیں، کے بعد ان آیات میں اُن عظیم نعمتوں کو جو پہلے گروہ کے لیے ہیں اور وہ بے توفیقیاں جو دوسرے گروہ کے دامن گیر ہوں گی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس شخص کو خدا ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ حق قبول کرنے کے لیے کشادہ کر دیتا ہے اور جسے وہ گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اس طرح تنگ اور محدود کر دیتا ہے کہ گویا وہ چاہتا ہے کہ آسمان کی طرف چڑھ جائے (فمن یرد اللّٰہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء)۔

اس امر کی تاکید کے لیے مزید کہا گیا ہے: خدا اس طرح سے پلیدی اور رجس کو بے ایمان افراد کے لیے قرار دے دیتا ہے اور ان کے سراپا کو نحوست اور سلب توفیق گھیرے گی (کذٰلک یجعل اللہ الرجس علی الذین لا یؤمنون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ ہم بارہا بیان کر چکے ہیں کہ خدائی "ہدایت" اور "ضلالت" سے مراد، ایسے اشخاص کے لیے کہ جنہوں نے حق قبول کرنے کے لیے اپنے اعمال و کردار سے آمادگی یا عدم آمادگی کو ثابت کر دیا ہے، ہدایت کی بنیادیں فراہم کرنا یا فراہم شدہ ہدایت کی بنیادوں کو برطرف کرنا ہے۔

وہ لوگ کہ جو راہ حق پر رواں دواں ہیں اور ایمان کے آبِ زلال کے متلاشی اور پیاسے ہیں، خدا ان کے راستوں میں ایسے ضیا بخش چراغ روشن کر دیتا ہے، تاکہ وہ اس آبِ حیات کو حاصل کرنے کے لیے تاریکیوں میں گم نہ ہو جائیں لیکن وہ لوگ کہ جنہوں نے ان حقائق کے بارے میں اپنی بے اعتنائی ثابت کر دی ہے وہ اس خدائی امداد سے محروم اور اپنی راہ میں انبوہِ مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں اور ان سے توفیق ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔

۲۔ یہاں "صدر" (سینہ) سے مراد روح اور فکر ہے اور یہ کنایہ بہت سے مواقع پر استعمال ہوتا ہے۔ نیز "یشرح" (کشادہ کرنا) سے مراد وہی وسعتِ روح، بلندئ فکر اور انسان کی عقل کے افق کا پھیلاؤ ہے۔ کیونکہ حق کو قبول کرنے کے لیے بہت سے ذاتی منافع چھوڑنے پڑتے ہیں کہ جس کے لیے وسعتِ روح رکھنے والے اور بلند افکار افراد کے سوا اور کوئی آمادہ نہیں ہوگا۔

۳۔ "حرج" (بروزن "حرم") حد سے زیادہ تنگی اور شدید محدودیت کے معنی میں ہے۔ یہ ہٹ دھرم اور بے ایمان افراد کا حال ہے، کہ جن کی فکر بہت کوتاہ اور ان کی روح حد سے زیادہ چھوٹی اور ناتواں ہے اور جو معمولی سی گنجائش بھی زندگی میں نہیں رکھتے۔

۴۔ قرآن کا ایک علمی معجزہ: اس قسم کے افراد کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دینا کہ جو یہ چاہتا ہے کہ آسمان پر چڑھ جائے اس لحاظ سے ہے کہ آسمان کی طرف صعود کرنا (چڑھنا) حد سے زیادہ مشکل کام ہے اور ان کے لیے حق کو قبول کرنا بھی اسی طرح ہے جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ کام فلاں شخص کے لیے اتنا مشکل ہے کہ گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ میں آسمان کی طرف چڑھ جاؤں۔ یا جیسا کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ کام کرنے کی بجائے آسمان پر چڑھ جاؤ تو وہ زیادہ آسان ہے۔

البتہ اس زمانے میں آسمان کی طرف پرواز کرنا انسان کے لیے ایک تصور سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا، لیکن آج بھی جبکہ فضا میں سیر کرنا ایک عملی شکل اختیار کر چکا ہے پھر بھی وہ ایک طاقت فرسا اور مشکل کاموں میں سے ہے اور فضانوردوں کو ہمیشہ شدید مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔

لیکن اس آیت کے لیے ایک لطیف تر معنی بھی نظر میں آتا ہے جو گذشتہ بحث کی تکمیل کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ کرۂ زمین کے اطراف کی ہوا اس زمین کے قرب و جوار میں تو بالکل ستھری ہوئی اور انسانی تنفس کے لیے

آمادہ ہے، لیکن ہم جتنا اوپر کی طرف چڑھتے چلے جائیں ہوا اتنی ہی زیادہ رقیق اور کم ہوتی جاتی ہے اور اس کی آکسیجن کی مقدار کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس حد تک کہ اگر ہم (آکسیجن کے ماسک کے بغیر) زمین کی سطح سے چند کلومیٹر اوپر کی طرف چلے جائیں تو ہمارے لیے سانس لینا ہر لحظہ مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور اگر ہم برابر اوپر کی طرف بڑھتے رہیں تو تنگیٔ تنفس اور آکسیجن کی کمی ہماری بے ہوشی کا سبب بن جائے گی، اس دن جب کہ یہ واقعیتِ علمی ثابت نہیں ہوئی تھی اس تشبیہ کا بیان کرنا حقیقت میں قرآن کے علمی معجزات میں شمار ہوگا۔

۵۔ شرح صدر کیا ہے: آیت میں شرح صدر (سینہ کی کشادگی) ایک عظیم نعمت اور ضیق صدر (سینہ کی تنگی) ایک خدائی سزا شمار کی گئی ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ سے ایک عظیم نعمت کا بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

الم نشرح لك صدرك

کیا ہم نے تیرے سینہ کو وسیع اور کشادہ نہیں کیا[1]

یہ ایک ایسا امر ہے کہ جو افراد کے حالات کا مشاہدہ کرنے سے اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ بعض کی روح تو اس قدر بلند اور کشادہ ہوتی ہے جو ہر حقیقت کو قبول کرنے کے لیے ـــ چاہے وہ کتنی بڑی کیوں نہ ہو ـــ آمادہ اور تیار ہوتی ہے لیکن کے برعکس بعض کی روح اتنی تنگ اور محدود ہوتی ہے جیسے کسی بھی حقیقت کے نفوذ کے لیے اس میں کوئی راہ اور جگہ نہیں ہے۔ ان کی فکری نگاہ کی حد روزمرہ کی زندگی اور کھانے پینے تک ہی محدود ہوتی ہے۔ اگر وہ انہیں مل جائے تو ہر چیز اچھی ہے اور اگر اس میں تھوڑا سا بھی تغیر پیدا ہو جائے تو گویا سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور دنیا خراب ہو گئی ہے۔

جس وقت اوپر والی آیت نازل ہوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے پوچھا کہ شرح صدر کیا ہے تو آپ نے فرمایا:

نور يقذفه الله في قلب من يشاء فينشرح له صدره وينفسح

ایک نور ہے کہ جسے خدا جس شخص کے دل میں چاہے ڈال دے تو اس کے سائے میں اس کی روح وسیع وکشادہ ہو جاتی ہے۔

لوگوں نے پوچھا کہ کیا اس کی کوئی نشانی بھی ہے کہ جس سے اُسے پہچانا جائے تو آپ نے فرمایا:

نعم الانابة الى دار الخلود والتجافی عن دار الغرور والاستعداد للموت قبل نزول الموت۔[2]

ہاں! اس کی نشانی ہمیشہ کے گھر کی طرف توجہ کرنا، اور دنیا کے زرق و برق سے دامن سمیٹنا، اور موت کے لیے آمادہ ہونا ہے (ایمان وعمل صالح اور راہ حق میں کوشش کرنے کے ساتھ) قبل اس کے کہ موت آجائے۔

---

[1] سورہ الم نشرح آیہ ۱۔

[2] مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۳۶۳۔

بعد والی آیت میں گذشتہ بحث کی تاکید کے عنوان سے کہتا ہے، یہ مطلب کہ خدائی مدد حق طلب لوگوں کے شامل حال ہوتی ہے اور سلب توفیق دشمنان حق کی تلاش میں جاتی ہے، ایک مستقیم و ثابت اور ناقابل تغیر سنت الٰہی ہے (وھذا صراط ربک مستقیما)۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ "ھذا" کا اشارہ اسلام اور قرآن کی طرف ہو، کیونکہ وہی صراط مستقیم اور راست و معتدل راستہ ہے۔

آیت کے آخر میں دوبارہ تاکید کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ہم نے اپنی نشانیوں اور آیات کو ان لوگوں کے لیے جو قبول کرنے والا دل اور سننے والا کان رکھتے ہیں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے (قد فصلنا الآیات لقوم یذکرون)۔

بعد والی آیت میں خدا تعالیٰ اپنی نعمتوں کے ان دو عظیم حصوں کو جو وہ بیدار افراد اور حق طلب لوگوں کو عطا کرتا ہے بیان کرتا ہے، پہلی یہ کہ، ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے امن و امان کا گھر ہے (لھم دار السلام عند ربھم)۔

اور دوسری یہ کہ: ان کا ولی وسرپرست اور حافظ و ناصر خدا ہے (وھو ولیھم)۔

"اور یہ سب کچھ ان نیک اعمال کی وجہ سے ہے جو وہ انجام دیتے تھے" (بما کانوا یعملون)۔

اس سے بڑھ کر اور کونسی چیز باعث افتخار ہوگی کہ انسان کی سرپرستی اور کفالت امور خداوند تعالیٰ اپنے ذمے لے، اور وہ اس کا حافظ، دوست اور یاور ہو جائے۔

اور کونسی نعمت اس سے عظیم تر ہے کہ "دارالسلام" یعنی امن و امان کا گھر وہ جگہ کہ جس میں نہ جنگ ہے نہ خونریزی، نہ نزاع ہے نہ جھگڑا، نہ خشونت و سختی ہے نہ مارنے والی اور طاقت صرف کرنے والی رقابتیں، نہ مفادات کا تصادم ہے نہ جھوٹ اور افترا، نہ تہمت، حسد اور کینہ ہے اور نہ غم و اندوہ۔ ایسا گھر جو ہر لحاظ سے راحت و آرام کی جگہ ہے، انسان کے انتظار میں ہے۔

لیکن آیت یہ کہتی ہے کہ یہ چیزیں وہ زبانی جمع خرچ سے کسی کو نہیں دیتا بلکہ عمل کے بدلے میں دیتا ہے۔ ہاں! ہاں! عمل ہی کے بدلے میں۔

۱۲۸۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ ٱلْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَآ أَجَلَنَا ٱلَّذِىٓ أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ ٱلنَّارُ مَثْوَىٰكُمْ خَٰلِدِينَ فِيهَآ إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ○

۱۲۹۔ وَكَذَٰلِكَ نُوَلِّى بَعْضَ ٱلظَّٰلِمِينَ بَعْضًۢا بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ ○ ع

ترجمہ

۱۲۸۔ اور اُس دن کہ جس میں اُن سب کو جمع اور محشور کرے گا تو اُن سے کہے گا کہ اے گروہ شیاطین و جن تم نے بہت سے انسانوں کو گمراہ کیا ہے، تو انسانوں میں سے اُن کے دوست اور پیروکار کہیں گے اے ہمارے پروردگار ہم دونوں (گمراہ پیشواؤں اور گمراہ پیروکاروں) میں سے ہر ایک نے دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے (ہم ہوس آلود اور زود گزر لذات تک پہنچے اور انہوں نے ہم پر حکومت کی) اور جو اجل تو نے ہمارے لیے مقرر کردی تھی ہم اُس تک پہنچ گئے۔ (خدا) کہے گا: تمہارے رہنے کی جگہ آگ ہے تم ہمیشہ کے لیے اسی میں رہو گے، مگر جو کچھ خدا چاہے، تیرا پروردگار حکیم اور دانا ہے۔

۱۲۹۔ اور اس طرح سے ہم بعض ستم گروں کو بعض (دوسرے ظالموں) کے سپرد کر دیتے ہیں یہ اُن اعمال کی وجہ سے ہے جو وہ انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

ان آیات میں قرآن نئے سرے سے گمراہ اور گمراہ کرنے والے مجرمین کی سرنوشت کی طرف لوٹتا ہے، اور گذشتہ آیات کے مباحث کی اس سے تکمیل کرتا ہے۔

انہیں اس دن کی یاد دلاتا ہے کہ جس دن وہ اُن شیاطین کے آمنے سامنے کھڑے ہوں گے کہ جن سے اُنہوں نے الہام لیا ہے، اور ان پیروکاروں اور اُن پیشواؤں سے سوال ہوگا، ایسا سوال کہ جس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور حسرت و اندوہ کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ کریں گے۔ یہ تنبیہیں اس مقصد کے لیے ہیں کہ صرف اس چند روزہ زندگی پر نگاہ نہ رکھیں اور انجام کار کی بھی فکر کریں۔

قرآن پہلے کہتا ہے: اس دن کہ جس میں اُن سب کو جمع و محشور کرے گا تو ابتداء میں کہے گا کہ اے گمراہ کرنے والے جن و شیاطین تم نے بہت سے افراد انسانی کو گمراہ کیا ہے (ویوم یحشرھم جمیعًا یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس)[1]۔

لفظ "جن" سے مراد یہاں وہی شیاطین ہیں، کیونکہ جن اصل لغت میں، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ہر مخفی مخلوق کے معنی میں ہے۔ سورہ کہف کی آیہ ۵۰ میں ہم شیاطین کے سردار ابلیس کے بارے میں پڑھیں گے۔

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور "یقول" سے متعلق ہے جو کہ محذوف ہے اور اصل میں جملہ یوں تھا ویوم یحشرھم جمیعًا یقول"

"کان من الجن"

یعنی وہ جنوں میں سے تھا۔

آیاتِ گذشتہ کہ جن میں شیاطین کے رمزی وسوسوں کے بارے میں گفتگو تھی اور فرمایا گیا تھا "ان الشیطین لیوحون الی اولیاءھم" اسی طرح بعد والی آیت کچھ اور لوگوں کے بارے میں بعض ستم گروں کی رہبری کی بات کر رہی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ اسی امر کی طرف اشارہ ہو۔

لیکن گمراہ کرنے والے شیاطین کے پاس اس گفتگو کا کوئی جواب نہیں ہے اور وہ خاموش ہو جاتے ہیں لیکن انسانوں میں سے ان کی پیروی کرنے والے اس طرح کہیں گے کہ پروردگارا! انہوں نے ہم سے فائدہ اٹھایا اور ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا یہاں تک کہ ہماری اجل آگئی" (وقال اولیاءھم من الانس ربنا استمتع بعضنا ببعض و بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا)۔

وہ اسی بات پر خوش تھے کہ انہیں فرمانبردار پیروکار مل گئے ہیں اور ان پر حکومت کر رہے ہیں، اور ہم بھی دنیا کے زرق و برق اور اس کی بے لگام وقتی لذات سے کہ جو شیاطین کے وسوسوں کی وجہ سے دلفریب اور دلچسپ دکھائی دیتی تھیں، خوش تھے۔

اس بارے میں کہ اس آیت میں اجل سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے مراد زندگی کا اختتام ہے؟ یا قیامت کا دن ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن ظاہراً زندگی کا اختتام مراد ہے، کیونکہ لفظ "اجل" اس معنی میں قرآن کی بہت سی آیات میں استعمال ہوا ہے۔

لیکن خدا ان سب فاسد و مفسد پیشواؤں اور پیروکاروں کو مخاطب کرکے کہتا ہے: تم سب کے رہنے کی جگہ آگ ہے اور تم ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہو گے، مگر جو کچھ خدا چاہے (قال النار مثواکم خالدین فیھا الا ما شاء اللہ)۔

جملہ "الا ما شاء اللہ" (مگر جو خدا چاہے) کے ساتھ استثنا یا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے مواقع پر عذاب و سزا کا ابدی ہونا پروردگار عالم سے اس کی قدرت کو سلب نہیں کرتا۔ بلکہ وہ جب چاہے اسے بدل سکتا ہے، اگرچہ ایک گروہ کے لیے قائم رہنے دیتا ہے۔

یا یہ اُن افراد کی طرف اشارہ ہے کہ جو ابدی عذاب کے مستحق نہیں ہیں۔ یا وہ عفو الٰہی کے شامل حال ہونے کی قابلیت رکھتے ہیں کہ جنہیں سزا کے جاودانی ہونے اور ہمیشگی کے حکم سے مستثنیٰ ہونا چاہیے۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: تیرا پروردگار حکیم و دانا ہے (ان ربک حکیم علیم)۔

اس کی سزا بھی حساب و کتاب کے ماتحت ہے اور اس کی بخشش بھی حساب و کتاب کی رو سے ہے اور وہ ان کے مواقع کو اچھی طرح جانتا ہے۔

اگلی آیت میں اس قسم کے افراد کے بارے میں ایک دائمی قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جس طرح ستم گر اور طاغی لوگ اس دنیا میں ایک دوسرے کے حامی اور معاون تھے، وہ آپس میں رہبر و رہنما بھی تھے،

اور غلط راستوں پر چلنے میں ایک دوسرے کے قریبی ہمکار بھی تھے" دوسرے جہان میں بھی ہم انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چھوڑ دیں گے، اور یہ اُن اعمال کی وجہ سے ہے کہ جنہیں وہ اس جہان میں انجام دیتے تھے" وکذٰلک نولی بعض الظٰلمین بعضا بما کانوا یکسبون)۔

کیونکہ جیسا کہ ہم نے معاد سے مربوط مباحث میں بیان کیا ہے قیامت کا منظر بہت بڑے پیمانے پر عکس العمل اور ردعمل کا منظر ہے اور وہاں پر جو کچھ ہوگا وہ اس دنیا میں ہمارے اعمال کا پرتو اور انعکاس ہے[1]

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں بھی امام علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

نولی کل من تولی اولیائھم فیکونون معھم یوم القیٰمۃ

قیامت کے دن ہر شخص اپنے اولیا کے ساتھ ہوگا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت میں ان تمام گروہوں کا "ظالم" کے عنوان سے تعارف کرایا گیا ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ "ظلم" اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے ان سب پر محیط ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہوگا کہ انسان اپنے جیسے شیطان صفت لوگوں کی رہبری کو قبول کر کے اپنے آپ کو خدا کی ولایت سے خارج کرلے، اور دوسرے جہان میں بھی انہی کی ولایت کے ماتحت قرار پائے۔

نیز یہ تعبیر اور" بما کانوا یکسبون "سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ سیاہ روزی اور بدبختی خود ان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے اور یہ ایک سنت الٰہی اور قانون فطرت ہے کہ تاریک راستوں کے راہی بدبختی کے کنویں اور درّے میں گرنے کے سوا اور کوئی انجام و عاقبت نہیں پائیں گے۔

۱۳۰۔ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِیْنَ ○

۱۳۱۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ○

۱۳۲۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ

---

[1] مزید وضاحت کے لیے "معاد و جہاں پس از مرگ" نامی قیمتی کتاب کی طرف رجوع کریں۔

عَمَّا يَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۱۳۰۔ (اس دن اُن سے کہے گا) اے گروہ جن وانس! کیا تم ہی میں سے (ہمارے بھیجے ہوئے) رسول تمہارے پاس نہیں آئے تھے، جو ہماری آیات تمہارے سامنے بیان کیا کرتے تھے، اور اس قسم کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈراتے تھے، وہ کہیں گے کہ ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں (ہاں ہم نے بُرا کیا) اور انہیں دنیا کی (زرق و برق) زندگی نے فریب دیا، اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں کہ وہ کافر تھے۔

۱۳۱۔ یہ اس بنا پر ہے کہ تیرا پروردگار کبھی بھی شہر اور آبادیوں (کے لوگوں) کو ان کے ظلم وستم کی وجہ سے غفلت اور بے خبری کی حالت میں ہلاک نہیں کرتا (بلکہ پہلے کچھ رسولوں کو اُن کے پاس بھیجتا ہے)۔

۱۳۲۔ اور (ان دونوں گروہوں میں سے) ہر ایک کے لیے درجات (اور مراتب) ہیں ہر اس عمل کے بدلے میں جو انہوں نے انجام دیا ہے اور تیرا پروردگار اُن اعمال سے جو انہوں نے انجام دیئے ہیں غافل نہیں ہے۔

تفسیر

اتمام حجت

گذشتہ آیات میں شیطان صفت ستم گروں کی قیامت کے دن کی سرنوشت بیان ہوئی ہے، اس غرض سے کہیں یہ تصور نہ کر لیا جائے کہ انہوں نے غفلت کی حالت میں یہ کام انجام دیئے ہوں گے اب ان آیات میں واضح کرتا ہے کہ انہیں کافی تنبیہ کی گئی ہے اور ان پر اتمام حجت کی گئی ہے، لہٰذا قیامت کے دن وہ ان سے کہے گا: اے گروہ جن وانس! کیا تم ہی میں سے رسول تمہارے پاس نہیں آئے تھے اور ہماری آیات بیان نہیں کی تھیں اور قسم کے دن کی ملاقات سے تمہیں ڈرایا نہیں تھا (یامعشر الجن والانس الم یأتکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی وینذرونکم لقاء یومکم ھٰذا)۔

"معشر" اصل میں "عشرة" سے جو دس کے عدد کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے اور چونکہ دس کا عدد ایک کامل عدد ہے، لہٰذا معشر کا لفظ ایک کامل جمعیت پر جو مختلف اصناف اور طبقوں پر مشتمل ہو، بولا جاتا ہے، اس بارے میں کہ آیا جنوں کی طرف بھیجے گئے رہنما خود انہی کی جنس و نوع سے تھے یا نوعِ بشر میں سے مفسرین کے درمیان اختلاف

ہے۔ لیکن سورہ جن کی آیات سے جو کچھ اچھی طرح سے استفادہ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن اور اسلام سب کے لیے ہے حتیٰ کہ جنوں کے لیے بھی نازل ہوا ہے، اور پیغمبر اسلام سب کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ان کو دعوت دینے کے لیے خود انہی میں سے پیغام دینے والے اور نمائندے مامور ہوں اس بارے میں مزید تشریح اور "جن" کے علمی معنی کے بارے میں بھی انشاء اللہ قرآن مجید کے پارہ ۲۹ میں سورہ جن کی تفسیر میں آئے گی۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ لفظ " منکم " (تم میں سے) اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہر گروہ کے رسول خود انہی کی جنس اور نوع سے ہوں گے کیونکہ جب ایک گروہ سے یہ کہا جائے کہ "تم میں سے چند نفر" تو یہ نفر ممکن ہے کہ ایک ہی گروہ سے ہوں یا تمام گروہوں میں سے ہوں۔

اس کے بعد کہتا ہے کہ قیامت کے دن کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکے گا اور اس روز سب چیزوں کی نشانیاں آشکار ہوں گی اور کوئی شخص کسی چیز کو چھپا نہیں سکے گا۔ سب کے سب خدا کی اس پرسش کے سامنے اظہار کرتے ہوئے کہیں گے: ہم خود اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں" اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ایسے رسول آئے تھے اور انہوں نے تیرے پیغام ہمیں پہنچائے تھے، مگر ہم نے ان کی مخالفت کی تھی (قالوا شھدنا علی انفسنا)۔

ہاں! ان کے پاس پروردگار کی طرف سے کافی دلائل موجود تھے اور وہ راہ اور چاہ میں تمیز کرتے تھے "لیکن دنیا کی پُر فریب زندگی اور اس کے وسوسہ انگیز زرق و برق نے انہیں دھوکا دیا" (و غرتھم الحیٰوۃ الدنیا)۔

یہ جملہ اچھی طرح سے واضح کر رہا ہے کہ انسانوں کے لیے راہِ سعادت میں سب سے بڑی رکاوٹ، جہاں مادہ کے مظاہر کے سامنے بے لگام ہو کر سرِ تسلیم خم کرنا اور بے حد و حساب وابستگی ہے، ایسی وابستگیاں کہ جو انسان کو زنجیرِ غلامی کی طرف کھینچ لے جاتی ہیں اور اسے ہر قسم کے ظلم و ستم، تعدی و انحراف اور خود خواہی و طغیان کی دعوت دیتی ہیں۔

قرآن دوبارہ تاکید کرتا ہے: وہ صراحت کے ساتھ اپنے ضرر میں اور اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کفر کی راہ پر چلے تھے اور منکرین حق کی صف میں شامل ہوئے تھے (و شھدوا علی انفسھم انھم کانوا کافرین)۔

بعد والی آیت میں گذشتہ آیت کے اسی مضمون کو دہرایا گیا ہے لیکن ایک قانونِ کلی اور دوامی سنتِ الٰہیہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے کہ "یہ اس بناء پر کہ تیرا پروردگار کبھی بھی شہروں اور بستیوں کے لوگوں کو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے غفلت کی حالت میں ہلاک نہیں کیا کرتا، مگر یہ کہ ان کی طرف انبیاء و رُسل کو بھیجے اور انہیں ان کے بُرے اعمال کی بُرائی کی طرف متوجہ کرے اور جو کہنے کی باتیں ہیں وہ ان سے کہے (ذٰلک ان لم یکن ربک مھلک القریٰ بظلم و اھلھا غافلون)۔

لفظ "بظلم" اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اس کے مظالم کی بناء پر غفلت کی حالت میں پیغمبروں کے بھیجنے سے پہلے عذاب اور سزا نہیں دیتا اور اس معنی میں بھی ہو سکتا ہے کہ خدا افرادِ غافل کو ظلم و ستم سے عذاب و سزا نہیں دیتا، کیونکہ انہیں اس حالت میں سزا دینا ظلم و ستم ہے اور خداوند تعالیٰ اس سے بالا و برتر ہے کہ وہ کسی پر ظلم و ستم

کرے [1]

ان کے سرانجام کا بعد کی آیت میں خلاصہ کرتے ہوئے یوں فرمایا گیا ہے: ان گروہوں میں سے ہر ایک، نیکوکار و بدکار، فرمانبردار و قانون شکن، حق طلب و ستم گر وہاں پر اپنے اعمال کے مطابق درجات و مراتب کے حامل ہوں گے اور تیرا پروردگار کبھی بھی ان کے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ بلکہ وہ سب کو جانتا ہے اور وہ ہر شخص کو اس کی لیاقت کے مطابق دے گا (ولکل درجات مما عملوا وما ربک بغافل عما یعملون)۔

یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کو تاکید کے ساتھ بیان کر رہی ہے کہ تمام مراتب، درجات اور درکات خود انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں نہ کسی اور چیز کا۔

۱۳۳ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا يَشَاءُ كَمَا أَنْشَأَكُمْ مِنْ ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ۝

۱۳۴۔ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝

۱۳۵۔ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝

ترجمہ

۱۳۳۔ اور تیرا پروردگار بے نیاز اور مہربان ہے (لہٰذا وہ کسی کے بارے میں ظلم و ستم نہیں کرتا بلکہ یہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتے ہیں) اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمہارے بعد تمہاری بجائے جو کچھ چاہے (اور جسے چاہے) تمہارا جانشین بنا دے جیسا کہ تمہیں دوسری اقوام کی نسل سے وجود میں لایا ہے۔

۱۳۴۔ جو کچھ تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ آکر رہے گا اور تم (خدا کو) عاجز و ناتواں نہیں کر سکتے (کہ اس کی عدالت

---

[1] پہلی صورت میں "ظلم" کا فاعل کافر ہیں اور دوسری صورت میں کہ جس میں ظلم کی نفی ہوئی ہے اس کا اشارہ خدا کی طرف ہے۔

سزا سے بچ کر بھاگ جاؤ)۔

۱۳۵۔ کہہ دو اے قوم! جو کام (تم سے ہو سکتا ہے اور) تمہاری قدرت میں ہے کر گزرو۔ میں (بھی اپنے فریضہ پر) عمل کروں گا، لیکن بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون شخص نیک انجام رکھتا ہے (اور کامیابی کس کے لیے ہے لیکن) یہ بات مسلم ہے کہ ظالم فلاح و نجات حاصل نہیں کریں گے۔

تفسیر

پہلی آیت در حقیقت اس پر ایک استدلال ہے جو گذشتہ آیات میں پروردگار کے ظلم نہ کرنے کے بارے میں بیان ہوا ہے۔ آیت کہتی ہے: تیرا پروردگار بے نیاز بھی ہے اور رحیم و مہربان بھی ہے، اس بناء پر کوئی وجہ نہیں کہ کسی پر چھوٹے سے چھوٹا ظلم بھی روا رکھے کیونکہ ظلم تو وہ کرتا ہے کہ جو یا تو نیازمند ہو یا سخت مزاج اور سنگدل ہو (وربک الغنی ذو الرحمة)۔

علاوہ ازیں اُسے نہ تو تمہاری اطاعت کی ضرورت ہے اور نہ ہی اسے تمہارے گناہوں کا خوف ہے کیونکہ "اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمہاری جگہ پر دوسرے لوگوں کو جنہیں وہ چاہے تمہارا جانشین بنادے جیسا کہ اس نے تمہیں ایسے انسانوں کی نسل میں سے پیدا کیا جو تم سے بہت سی صفات میں مختلف تھے (ان یشأ یذھبکم ویستخلف من بعدکم ما یشاء کما انشأکم من ذریة قوم اٰخرین)۔

اس بناء پر وہ بے نیاز بھی ہے اور مہربان بھی اور ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے، اس حالت میں اس کے بارے میں ظلم کا تصور ممکن نہیں ہے۔

اور اس کی لا متناہی قدرت پر توجہ رکھتے ہوئے یہ بات واضح اور روشن ہے کہ "اُس نے تم سے جو قیامت اور جزا و سزا کے بارے میں وعدہ کیا ہے وہ ہو کے رہے گا اور اس کی تھوڑی سی بھی خلاف ورزی نہیں ہوگی" (ان ما توعدون لاٰت)۔

"اور تم ہرگز اس کی حکومت سے باہر نہیں نکل سکتے اور اس کے پنجہ عدالت سے فرار نہیں کر سکتے" (وما انتم بمعجزین[1])۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے: انہیں تہدید کرتے اور دھمکی دیتے ہوئے کہو کہ اے قوم! تم سے جو کچھ ہو سکتا

---

[1] "معجزین" "اعجاز" کے مادہ سے ہے، یعنی دوسرے کو ناتوان و عاجز کر دینا۔ آیت کہتی ہے کہ تم خدا کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرکے اٹھانے اور عدالت کے جاری کرنے سے عاجز نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں تم اس کی قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہے وہ کرگزرو، میں بھی وہ کام جس کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے انجام دوں گا۔ مگر تمہیں بہت ہی جلد معلوم ہو جائے گا کہ نیک انجام اور آخری کامیابی کسے نصیب ہوتی ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ظالم و ستمگر کامیاب نہیں ہوں گے اور سعادت و نیک بختی کا منہ نہیں دیکھیں گے (قل یاقوم اعملوا علی مکانتکم انی عامل فسوف تعلمون من تکون لہ عاقبۃ الدار انہ لا یفلح الظالمون)۔

یہاں ہم دوبارہ دیکھ رہے ہیں کہ "کفر" کی بجائے "ظلم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کفر اور انکار حق ایک قسم کا واضح و آشکار ظلم ہے، اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور معاشرے پر بھی ظلم ہے اور چونکہ ظلم جہان آفرینش کی عمومی عدالت کے برخلاف ہے لہٰذا آخر کار اسے شکست ہوگی۔

۱۳۶۔ وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۳۶۔ اور (مشرکین نے) ان چیزوں میں سے جو خدا نے پیدا کی ہیں (یعنی) زراعت اور چوپایوں میں سے کچھ حصہ خدا کے لیے (بھی) قرار دیا ہے اور انہوں نے یہ کہا کہ (ان کے گمان کے مطابق) یہ خدا کا مال ہے اور یہ ہمارے شرکاء (یعنی بتوں) کا مال ہے۔ جو ان کے شرکاء کا مال تھا وہ تو خدا تک نہیں پہنچتا تھا لیکن جو خدا کا مال تھا وہ ان کے شرکاء تک پہنچ جاتا تھا۔ (اور اگر بتوں کا حصہ کم ہو جاتا تھا تو خدا کا مال انہیں دے دیتے تھے لیکن اس کے برعکس کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ یعنی خدا کا حصہ کم ہو جانے کی صورت میں بتوں کے مال میں سے خدا کو نہیں دیتے تھے) وہ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں (کہ شرک کے علاوہ خدا کو بتوں سے بھی کمتر سمجھتے تھے)

تفسیر

ان کے دماغوں سے بت پرستی کے افکار کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے مشرکین کے بیہودہ عقائد و رسوم اور آداب و عبادات کا دوبارہ ذکر شروع کیا گیا ہے اور بیان رسا کے ذریعے ان کے بیہودہ ہونے کو واضح کیا گیا ہے۔

قرآن پہلے کہتا ہے، کفار مکہ اور تمام مشرکین اپنی زراعت اور چوپایوں میں سے ایک حصّہ تو خدا کے لیے اور ایک حصّہ اپنے بتوں کے لیے بھی قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ حصّہ تو خدا کا ہے اور یہ ہمارے شرکا (یعنی بتوں) کا مال ہے (وجعلوا اللہ مما ذرأ من الحرث والانعام نصیباً فقالوا ھذا للہ بزعمھم وھذا لشرکائنا)۔

اگرچہ آیت میں صرف خدا کے حصہ کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن بعد کے جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حصّہ خدا کا اور ایک حصّہ بتوں کا قرار دیتے تھے۔ روایات میں آیا ہے کہ اس حصہ کو تو جسے وہ خدا کے لیے قرار دیتے تھے بچوں اور مہمانوں میں صرف کرتے اور اس سے اس کام کے لیے استفادہ کرتے تھے لیکن زراعت اور چوپایوں کا وہ حصّہ جو وہ بتوں کے لیے قرار دیتے تھے بتوں اور بت خانہ کے خادموں اور متولیوں اور مراسم قربانی اور خود ان کے اپنے لیے مخصوص تھا۔[1] "شرکائنا" (ہمارے شریک) کی تعبیر بتوں کے لیے اس بنا پر تھی کہ وہ انہیں اپنے اموال، سرمائے اور زندگی میں شریک سمجھتے تھے۔

"مما ذرأ" (اس میں سے جو خدا نے خلق کیا ہے) کی تعبیر درحقیقت ان کے عقیدہ کے ابطال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ تمام اموال سب کے سب خدا کی مخلوق تھے تو پھر ان میں سے ایک حصّہ خدا کے لیے اور ایک حصہ بتوں کے لیے کیسے مقرر کرتے تھے۔

اس کے بعد اس بارے میں ان کے ایک عجیب و غریب فیصلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ حصّہ جو انہوں نے بتوں کے لیے مقرر کیا تھا وہ تو ہرگز خدا کو نہیں مل سکتا تھا (اور خدا کے نام پر کسی کو نہیں دیا جا سکتا تھا) لیکن وہ حصّہ جو انہوں نے خدا کے لیے قرار دیا تھا وہ بتوں کو پہنچ جاتا تھا (فما کان لشرکائھم فلا یصل الی اللہ وما کان للہ فھو یصل الی شرکائھم)۔

اس بارے میں کہ اس جملے سے کیا مراد ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن تقریباً وہ سب کے سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب کسی حادثہ کی وجہ سے زراعت یا چوپایوں میں سے مقرر کیے ہوئے خدا کے سہم کا کچھ حصّہ خراب ہو جاتا تھا اور نابود ہو جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے خدا بے نیاز ہے لیکن اگر بتوں کے حصّہ میں سے کچھ ضائع ہو جاتا تو سہم خدا کو اس کی جگہ قرار دے لیتے تھے اور کہتے تھے کہ بتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر اس کھیت کا پانی جو خدا کے حصّہ میں تھا بتوں کے حصّہ والے کھیت میں چلا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ کوئی حرج نہیں ہے، خدا تو بے نیاز ہے۔ لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا تو اس کو روک دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بتوں کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔

آیت کے آخر میں خدا تعالےٰ ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس بے ہودہ عقیدے کو جرم قرار دے کر اس کے

---

[1] تفسیر المنار جلد ہشتم صفحہ ۱۲۲۔

خلاف فیصلہ کرتا ہے اور کہتا ہے یہ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں (ساء ما یحکمون)۔

اس بات کے علاوہ کہ بت پرستی خود ایک فاسد اور بے اساس چیز ہے ان کے فعل کی برائی کے کچھ اور پہلو بھی ہیں:

۱۔ باوجود اس کے کہ تمام چیزیں خدا کی مخلوق ہیں اور اس کی مسلّم ملکیت ہیں اور تمام موجودات کا حاکم و مدبر و محافظ وہی ہے، وہ اس میں سے صرف ایک ہی حصہ کو خدا کے ساتھ مخصوص قرار دیتے تھے، اگر یا اصلی مالک وہ خود تھے، لہٰذا تقسیم کا حق بھی صرف انہی کو حاصل تھا (جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ "مما ذرأ" کا جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے)۔

۲۔ وہ اس تقسیم میں بتوں کی طرف داری کو مقدم رکھتے تھے لہٰذا ہر وہ نقصان جو خدا کے حصہ میں واقع ہوتا تھا اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے لیکن جو نقصان بتوں کے حصہ میں ہو جاتا اس کی خدا کے حصہ میں سے تلافی کر لیا کرتے تھے اور خدا کے حصہ میں سے لے کر بتوں کو دے دیتے۔ آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے، اور یہ بتوں کے لیے خدا کی نسبت ایک قسم کی برتری اور امتیاز کا اظہار تھا۔

۳۔ بعض روایات[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بتوں کے حصہ کے لیے ایک خاص اہمیت کے قائل تھے۔ لہٰذا ان کے حصہ میں سے متولیان، بتوں کے خادم اور خود بت پرست کھاتے تھے اور خدا کے حصہ کو صرف بچوں اور مہمانوں کو دیتے تھے۔ قرائن اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ موٹے تازے گوسفند اور اچھی قسم کا اناج بتوں کا مال تھے تاکہ بقول "ماتم کے بعد پیٹ بھر کر کھا سکیں"۔

یہ سب چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ تقسیم کے سلسلے میں خدا کے لیے بتوں جتنی قدر و قیمت کے بھی قائل نہیں تھے۔ اس سے بڑھ کر قبیح اور زیادہ سنگین اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ انسان پتھر یا لکڑی کے ایک بے قدر و قیمت ٹکڑے کو عالم ہستی کے خالق و مالک سے بلند تر خیال کرے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی انحطاطِ فکری تصور کیا جا سکتا ہے۔

۱۳۷۔ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ ۖ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ○

ترجمہ

۱۳۷۔ اور اسی طرح ان کے شرکاء (یعنی بتوں) نے ان کی اولاد کے قتل کو ان کی نظروں میں پسندیدہ کر رکھا تھا (وہ اپنے بچوں کو بتوں پر قربان کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے) اور اس کام کا انجام یہ ہوا کہ بتوں نے انہیں ہلاکت میں ڈال دیا اور ان کے دین کو دگرگوں کر دیا اور اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے

(کیونکہ خدا جبراً انہیں ایسا کرنے سے روک سکتا تھا لیکن جبر کا کوئی فائدہ نہیں ہے) اس بناء پر انہیں اور ان کی تہمتوں کو بھی چھوڑ دو (اور ان کے اعمال کی پرواہ نہ کرو)۔

تفسیر

قرآن اس آیت میں بت پرستوں کی ایک اور بدکاری اور ان کے شرمناک جرائم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: جس طرح خدا اور بتوں کے بارے میں ان کی تقسیم ان کی نظروں میں بھلی تھی اور اس بُرے، بے ہودہ اور مضحکہ خیز عمل کو وہ پسندیدہ خیال کرتے تھے، اسی طرح ان کے شرکاء نے اولاد کے قتل کو بہت سے بت پرستوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا رکھا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے بچوں کو قتل کرنا ایک قسم کا افتخار یا عبادت شمار کرتے تھے (وکذالك زين لكثير من المشركين قتل اولادهم شركائهم)۔

یہاں "شرکاء" سے مراد بت ہیں کہ جن کی خاطر وہ بعض اوقات اپنے بیٹوں کو بھی قربان کر دیتے تھے یا نذر کرتے تھے کہ اگر انہیں بیٹا نصیب ہو گا تو اُسے بت کے لیے قربان کریں گے۔ جیسا کہ قدیم بت پرستوں کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے اور اس بنا پر بتوں کی طرف "زینت دینے" کی نسبت اس سبب سے ہے کیونکہ بتوں کے ساتھ تعلق اور عشق انہیں اس مجرمانہ عمل پر آمادہ کرتا تھا۔ اس تفسیر کی رو سے مذکورہ بالا آیت میں قتل کرنے کا بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے یا فقر و فاقہ کے خوف سے بیٹوں کو قتل کرنے کے مسئلہ کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ بتوں کے وسیلہ سے اس جرم کی تزئین سے مراد یہ ہو کہ بت کدوں کے خدام اور متولی لوگوں کو یہ کام کرنے کا شوق دلاتے تھے اور خود کو بتوں کی زبان سمجھتے تھے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب اہم سفروں اور دوسرے کاموں کے انجام دینے کے لیے "ھبل" (اُن کا بڑا بت تھا) سے اجازت لیتے تھے، ان کے اجازت لینے کا طریقہ یہ تھا کہ تیر کی وہ لکڑیاں جو ایک مخصوص تھیلے میں "ھبل" کے پہلو میں ہوا کرتی تھیں اور اُن میں سے بعض کے اُوپر "افعل" (یہ کام انجام دو) اور بعض کے اُوپر "لا تفعل" (یہ کام انجام نہ دو) لکھا ہوا ہوتا تھا، وہ تھیلے کو ہلاتے تھے اور اُن میں سے ایک تیر کی لکڑی نکال لیتے تھے اور جو کچھ اس کے اُوپر لکھا ہوا ہوتا تھا، اُسے "ھبل" کا پیغام سمجھتے تھے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ اس طریقے سے بتوں کا منشاء معلوم کرنا چاہتے تھے اور کچھ بعید نہیں کہ بت کے لیے قربانی کا مسئلہ بھی خدام کے ذریعہ بت کے ایک پیغام کے طور پر متعارف ہوا ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بیٹیوں کا زندہ درگور کرنا اُن لوگوں کے درمیان کہ جو تاریخ کے بیان کے مطابق بدنامی اور ننگ و عار کا داغ مٹانے کے نام پر قبیلہ بنی تمیم کے درمیان رائج تھا، وہ بھی بت کے پیغام کے طور پر ہی متعارف ہوا ہو۔ کیونکہ تاریخ میں ہے کہ نعمان بن منذر نے عرب کی ایک جماعت پر حملہ کیا اور ان کی عورتوں کو اسیر کر لیا اور

ان کے درمیان "قیس بن عاصم" کی بیٹی بھی تھی، اس کے بعد ان کے درمیان صلح ہوگئی۔ اور ہر عورت اپنے قبیلہ کی طرف پلٹ آئی۔ سوائے قیس کی بیٹی کے کہ اس نے اس بات کو ترجیح دی کہ وہ دشمن کی قوم کے درمیان رہ جائے اور شاید ان کے کسی جوان سے شادی کرلے۔ یہ مطلب قیس پر گراں گزرا اور اس نے بتوں کے نام کی قسم کھائی کہ جب میری دوسری لڑکی پیدا ہوگی تو میں اُسے زندہ درگور کردوں گا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یہ عمل بطور سنت ان کے درمیان رائج ہوگیا کہ انہوں نے ناموس کے دفاع کے نام پر ایک بہت بڑے جرم یعنی بے گناہ اولاد کو قتل کرنے کا ارتکاب کرنا شروع کردیا۔[1]

اس بنا پر ممکن ہے کہ بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا بھی زیرِ نظر آیت میں داخل ہو۔

ایک اور احتمال بھی زیرِ بحث آیت کی تفسیر میں نظر آتا ہے۔ اگرچہ مفسرین نے اُسے ذکر نہیں کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب بتوں کے لیے اس قسم کی اہمیت کے قائل تھے کہ اپنے نفیس اور عمدہ اموال تو بتوں اور ان کے طاقتور اور مالدار متولیوں اور خدام پر خرچ کردیا کرتے تھے، اور خود فقیر اور تنگ دست ہوجاتے تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات بھوک اور فقر و فاقہ کی وجہ سے اپنے بچوں کو ذبح کردیتے تھے، بتوں کے ساتھ ان کے اس عشق نے ایسے بُرے عمل کو ان کی نظروں میں مزین کردیا تھا۔

لیکن پہلی تفسیر یعنی بتوں کے لیے اولاد کو قربان کرنا آیت کے متن کے ساتھ سب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اس قسم کے قبیح اور بداعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ بت اور بتوں کے خدام، مشرکین کو ہلاکت میں ڈال دیں، اور دین و آئینِ حق کو ان پر مشتبہ کردیں اور انہیں ایک پاک و پاکیزہ دین تک پہنچنے سے محروم کردیں (لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم)۔

قرآن کہتا ہے: ان تمام باتوں کے باوجود اگر خدا چاہتا تو جبراً انہیں اس کام سے روک دیتا، مگر جبر کرنا سنتِ الٰہی کے برخلاف ہے، خدا چاہتا ہے کہ بندے آزاد رہیں، تاکہ تربیت اور تکامل و ارتقا کی راہ ہموار ہو۔ کیونکہ جبر میں نہ تربیت ہے نہ تکامل و ارتقا (ولو شاء اللّٰہ ما فعلوہ)۔

اور آخر میں فرماتا ہے: اب جبکہ یہ حال ہے اور وہ اس قسم کے بیہودہ، پست اور شرمناک اعمال میں غوطہ زن ہیں یہاں تک کہ اس کی قباحت کو بھی نہیں سمجھتے اور سب سے بدتر یہ کہ وہ کبھی اسے خدا کی طرف بھی منسوب کردیتے ہیں لہٰذا تم "انہیں اور ان کی تہمتوں کو چھوڑ دو اور آمادہ و مستعد دلوں کی تربیت کرو (فذرھم وما یفترون)۔

---

[1] بعض خیال کرتے ہیں کہ لفظ اولاد زیرِ نظر آیت میں اس تفسیر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ لفظ اولاد ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو بیٹا اور بیٹی دونوں پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۳۳ میں ہے:

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین

مائیں اپنی اولاد کو مکمل دو سال دودھ پلائیں گی۔

۱۳۸۔ وَقَالُوا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ○

۱۳۹۔ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰۤى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۳۸۔ اور انہوں نے کہا کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ (جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے یہ سب کے لیے) ممنوع ہے اور سوائے اُن لوگوں کے جنہیں ہم چاہیں ۔ ان کے گمان کے مطابق ۔ اس سے کسی کو نہیں کھانا چاہیے۔ اور (وہ یہ کہتے تھے کہ یہ) ایسے چوپائے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام قرار دے دیا گیا ہے اور وہ چوپائے کہ جن پر خدا کا نام نہیں لیتے تھے اور خدا پر جھوٹ بولتے تھے (اور یہ کہتے تھے کہ یہ احکام خدا کی طرف سے ہیں) عنقریب ان کے افتراء کی سزا انہیں دے گا۔

۱۳۹۔ اور انہوں نے کہا کہ جو کچھ ان حیوانات کے شکم میں (جنین اور بچے میں سے) موجود ہے وہ تو ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور وہ ہماری بیویوں پر حرام ہے لیکن اگر وہ مردہ ہو (یعنی مردہ پیدا ہو) تو پھر سب اس میں شریک ہیں اور عنقریب (خدا) اس توصیف (اور جھوٹے احکام) کی سزا انہیں دے گا، وہ حکیم و دانا ہے۔

تفسیر

ان آیات میں بت پرستوں کے بے ہودہ احکام کے کچھ حصوں کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو ان کی کوتاہ فکری کی حکایت و ترجمانی کرتے ہیں اور گذشتہ آیات کی بحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

قرآن پہلے کہتا ہے کہ بت پرست کہتے تھے کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے اور خاص انہی کا حصہ ہے کلی طور پر سب کے لیے ممنوع ہے، سوائے اُن لوگوں کے جن کو ہم چاہیں - ان کے خیال کے مطابق صرف اسی گروہ کے لیے حلال تھا دوسروں کے لیے نہیں (وقالوا هذه انعام و حرث حجر لا يطعمها الا من نشاء بزعمهم)۔

ان کی اس سے مراد وہی بت اور بت خانہ کے متولی اور خدام تھے، صرف وہی گروہ تھا کہ جو ان کے خیال کے مطابق بتوں کے حصہ میں سے کھانے کا حق رکھتے تھے۔

اس بیان سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آیت کا یہ حصہ حقیقت میں اس حصہ کے مصرف کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے، جو انہوں نے زراعت اور چوپایوں میں سے بتوں کے لیے مقرر کیا تھا، جس کی تفصیل گذشتہ آیات میں گذر چکی ہے۔

لفظ "حجر" (بروزن "شعر") اصل میں ممنوع قرار دینے کے معنی میں ہے اور جیسا کہ راغب نے کتاب مفردات میں کہا ہے بعید نہیں کہ " حجارۃ " کے مادہ سے پتھر کے معنی میں لیا گیا ہو۔ کیونکہ جب وہ یہ چاہتے تھے کہ کسی احاطے میں داخلہ ممنوع قرار دیں تو اس کے گرد پتھر چن دیتے تھے اور یہ جو "حجر اسماعیل" پر اس لفظ کا اطلاق ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص پتھر کی دیوار کے ذریعے اسے مسجد الحرام کے دوسرے حصوں سے الگ کیا گیا ہے۔ اسی مناسبت سے عقل کو بھی کبھی "حجر" کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ انسان کو بُرے کاموں سے روکتی ہے، اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی نگرانی اور حمایت میں آجائے تو کہتے ہیں کہ یہ اُس کی حجر (حفاظت) میں ہے، اور "محجور" اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو اپنے اموال میں تصرف کرنے سے رُکا ہوا ہے [1]

اس کے بعد دوسری چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جسے انہوں نے حرام کر رکھا تھا اور فرمایا گیا ہے: وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ کچھ جانور ایسے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام ہے (وانعام حرمت ظهورها)۔

اور ظاہراً یہ وہی جانور تھے کہ جن کی تفصیل سورہ مائدہ کی آیہ ۱۰۳ میں "سائبہ"، "بحیرہ"، اور "حام" کے عنوان سے گذر چکی ہے (مزید معلومات کے لیے مذکورہ آیت کے ذیل میں بیان کردہ تفسیر کا مطالعہ کریں)۔

اس کے بعد ان کے ناروا احکام کے تیسرے حصے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کچھ جانوروں پر خدا کا نام نہیں لیتے تھے (وانعام لا يذكرون اسم الله عليها)۔

یہ جملہ ہو سکتا ہے ایسے جانوروں کی طرف اشارہ ہو جن کو ذبح کرتے وقت صرف بت کا نام لیتے تھے یا اس سے مراد وہ جانور ہوں کہ جن پر حج کے لیے سوار ہونا انہوں نے حرام قرار دیا تھا، جیسا کہ تفسیر مجمع البیان، تفسیر کبیر، المنار

---

[1] اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ اوپر والی آیت میں "حجر" وصفی معنی رکھتا ہے اور "محجور" کے معنی میں آیا ہے اور مذکر و مونث دونوں اس میں یکساں ہیں۔

اور قرطبی میں بعض مفسرین سے نقل ہوا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ ایک بے دلیل اور بیہودہ حکم تھا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ ان بیہودہ احکام پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ خدا پر افترا باندھتے تھے اور ان کی خدا کی طرف نسبت دیتے تھے (افتراء علیه)۔

آیت کے آخر میں ان بناوٹی احکام کے ذکر کے بعد قرآن کہتا ہے: خدا عنقریب ان افترات کے بدلے میں انہیں سزا اور عذاب دے گا (سیجزیهم بما کانوا یفترون)۔

ہاں! جب ایک انسان یہ چاہے کہ وہ اپنی ناقص فکر و عقل کے ذریعے کوئی قانون بنا لے تو عین ممکن ہے کہ ہر گروہ اپنی ہوا و ہوس سے کچھ احکام و قوانین بنا ڈالے اور خدا کی نعمتوں کو بلا وجہ اپنے اُوپر حرام قرار دے لے یا قبیح اور غلط کاموں کو اپنے لیے حلال قرار دے لے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون کا وضع کرنا صرف خدا کا کام ہے جو سب کچھ جانتا ہے اور ہر کام کی مصلحت سے آگاہ ہے اور ہر قسم کی ہوا و ہوس سے دور ہے۔

بعد والی آیت میں ان کے ایک اور بیہودہ حکم کی طرف جو جانوروں کے گوشت کے بارے میں ہے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انہوں نے کہا ہے کہ وہ جنین (اور بچے) جو ان جانوروں کے شکم میں ہیں وہ ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ہماری بیویوں پر حرام ہیں البتہ اگر وہ مردہ پیدا ہوں تو پھر سب اس میں شریک ہیں (وقالوا ما فی بطون هٰذه الانعام خالصة لذکورنا و محرم علی ازواجنا و ان یکن میتة فهم فیه شرکآء)۔

اس بات پر توجہ رہے کہ "هٰذه الانعام" سے مراد وہی جانور ہیں جن کی طرف گذشتہ آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ "ما فی بطون هذه الانعام" (جو کچھ ان جانوروں کے شکم میں ہے) کی عبارت ان جانوروں کے دودھ کے بارے میں بھی ہے لیکن "و ان یکن میتة" (اگر مردہ ہوں) کے جملے پر توجہ کرتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت "جنین" (شکم مادر میں بچہ) سے بحث کر رہی ہے کہ اگر وہ زندہ پیدا ہو تو اُسے صرف مردوں کے ساتھ مخصوص جانتے تھے اور اگر مردہ پیدا ہوتا تھا کہ جو ان کے لیے زیادہ باعث رغبت و میل نہ ہوتا تھا تو پھر سب کو اس میں مساوی جانتے تھے۔

اس حکم کا اوّل تو کوئی فلسفہ اور منطقی دلیل ہی نہیں اور دوسرے مردہ پیدا ہونے والے جنین کے بارے میں بہت ہی بُرا اور چھپنے والا تھا کیونکہ اس قسم کے جانور کا گوشت تو اکثر اوقات خراب اور مضر ہوتا ہے اور تیسرے یہ کہ یہ ایک قسم کی مردوں اور عورتوں میں واضح تفریق تھی کیونکہ جو چیز اچھی تھی وہ تو صرف مردوں کے ساتھ مخصوص تھی جو چیز بُری تھی اس میں سے عورتوں کو بھی حصہ دیا جاتا تھا۔

قرآن اس جاہلانہ حکم کا ذکر کرنے کے بعد مطلب کو اس جملے کے ساتھ ختم کرتا ہے: عنقریب خدا انہیں ان کی اس قسم کی توصیفات کی سزا دے گا (سیجزیهم وصفهم)۔

"وصف" کی تعبیر ایسی توصیف کی طرف اشارہ ہے کہ جو وہ خدا کے لیے کرتے تھے اور اس قسم کی غذاؤں کی حرمت کی نسبت خدا کی طرف دیتے تھے۔ اگرچہ اس سے مراد وہ صفت اور حالت ہے کہ جو تکرار گناہ کے اثر سے گناہگار شخص کو عارض ہوتی ہے اور اُسے سزا و عذاب کا مستحق بنا دیتی ہے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ حکیم اور دانا ہے (انه حکیم علیم)۔

ان کے اعمال و گفتار اور ناروا تہمتوں سے بھی باخبر ہے، اور حساب ہی کے ساتھ انہیں سزا بھی دے گا۔

۱۴۰۔ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۴۰۔ یقیناً جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت و نادانی کی بناء پر قتل کر دیا انہوں نے نقصان اٹھایا ہے، اور جو کچھ خدا نے انہیں رزق دے رکھا تھا اُسے اپنے اُوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر انہوں نے افترا باندھا ہے وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (وہ ہرگز) ہدایت نہیں پائیں گے۔

تفسیر

گذشتہ چند آیات میں زمانہ جاہلیت کے عربوں کے فضول احکام اور قبیح اور شرمناک رسوم سے متعلق گفتگو تھی منجملہ ان کے اپنی اولاد کو بتوں کی قربانی کے طور پر قتل کرنا، اپنے قبیلہ اور خاندان کی حیثیت و عزت کو محفوظ رکھنے کے نام پر اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا اور اسی طرح کچھ حلال نعمتوں کے حرام کر لینا تھا۔ اس آیت میں بڑی سختی کے ساتھ ان تمام اعمال و احکام کو جرم قرار دیتے ہوئے سات مختلف تعبیروں کے ساتھ جو مختصر جملوں میں ہیں لیکن وہ بہت ہی رسا اور جاذب توجہ ہیں، ان کی وضع و کیفیت کو واضح و روشن کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ کہ جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت، بے وقوفی اور جہالت کی بناء پر قتل کیا ہے، انہوں نے نقصان اور خسارہ اُٹھایا ہے وہ انسانی اور اخلاقی نظر سے بھی اور احساس کی نظر سے بھی اور اجتماعی و معاشرتی لحاظ سے بھی خسارے اور نقصان میں گرفتار ہوئے ہیں اور سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر انہوں نے دوسرے جہاں میں روحانی نقصان اٹھایا ہے (قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھًا بغیر علم)۔ اس جملے میں ان کا یہ عمل اولاً ایک قسم کا خسارہ اور نقصان اور اس کے بعد حماقت کم عقلی اور بعد میں جاہلانہ کام کے طور پر متعارف ہوا ہے ان تینوں تعبیرات میں سے ہر ایک تنہا ان کے عمل کی برائی کے تعارف کے لیے کافی ہے۔ کونسی عقل اجازت دیتی ہے کہ انسان

اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دے اور کیا یہ حماقت اور بے وقوفی کی انتہا نہیں ہے کہ وہ اپنے اس عمل پر شرم نہ کرے بلکہ اس پر ایک قسم کا فخر کرے اور اسے عبادت شمار کرے۔ کونسا علم و دانش اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ انسان ایسا عمل ایک سنت کے طور پر یا اپنے معاشرے میں ایک قانون کے طور پر قبول کرے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں ہمیں ابن عباس کی گفتگو یاد آرہی ہے کہ جو کہا کرتے تھے:

جو شخص زمانہ جاہلیت کی قوموں کی پسماندگی کی میزان کو جاننا چاہے تو وہ سورۂ انعام کی آیات (یعنی زیر بحث آیات) کو پڑھے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: انہوں نے اس چیز کو جو خدا نے انہیں روزی کے طور پر دی ہوئی تھی اور ان کے لیے اُسے مباح و حلال قرار دیا تھا، اپنے اُوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر انہوں نے یہ افترا باندھا کہ خدا نے انہیں حرام کیا ہے (وحرموا ما رزقهم الله افتراء على الله)۔

اس جملہ میں دو اور تعبیروں کے ذریعے ان کے اعمال کو جرم قرار دیا گیا ہے کیونکہ اوّل تو انہوں نے اس نعمت کو جو خدا نے انہیں بطور روزی دے رکھی تھی یہاں تک کہ وہ ان کی حیات کی بقا اور زندگی کے برقرار رہنے کے لیے بھی ضروری تھی، اُسے اپنے اُوپر حرام کر لیا اور خدا کے قانون کو پاؤں تلے روند ڈالا اور دوسرے خدا پر افترا باندھا کہ اُس نے یہ حکم دیا ہے، حالانکہ ہرگز ہرگز ایسا نہیں تھا۔

آیت کے آخر میں دو اور تعبیرات کے ذریعے انہیں مجرم قرار دیا گیا ہے پہلے کہا گیا ہے: وہ یقیناً گمراہ ہو گئے (قد ضلوا)۔

اس کے بعد مزید کہا گیا ہے: وہ کبھی بھی راہِ ہدایت پر نہیں تھے (وما كانوا مهتدين)۔

پانچویں جلد کا ترجمہ تمام ہوا
بقلم سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی بر مکان
حقیر واقع قم المقدسہ چہار مردان سلطان محمد شریف
کوی جمشیدی بلاک ۱۱ ۔ اسلامی جمہوریہ ایران
بتاریخ ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۳ھ
مطابق ۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء
بوقت صبح ساڑھے نو بجے

۷۸۶

اشاریہ

تفسیر نمونہ جلد پنجم

ترتیب و تزئین۔ سید شکیل حسین موسوی

اصول و عقائد

توحید

علم خدا

خالق ارض و سما

نبوت

امامت

قیامت

معجزہ

احکام

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

عیسائی

مشرکین

شخصیات

ابراہیم علیہ السلام

ابن ابی ماریہ

محمدؐ بن عبداللہؐ ختم المرسلین

لُغاتِ قرآن

اثابھم ۔ مادہ "ثواب" لوٹ آنا نیکی کرنا ۶٧
اجتناب ۔ فاصلہ پر رہنا دُوری اختیار کرنا ٧٧
اجرموا ۔ اجرام مادہ "جرم" قطع کرنا ۔ گنہگار ۳۴۶
اجل ۔ مدت معیّن آخری وقت ، وقت سے پہلے آنے والی موت ١۳۳
اجل مسمّیٰ ۔ طبعی موت ١۳۳
استھوتہ ۔ مادہ ۔ "ھویٰ" ہوا و ہوس ۲۴۴
اصحمہ ۔ عطیہ و بخشش حبشہ کے بادشاہ (نجاشی) کا نام ۶۲
اعقاب ۔ جمع عقب کی (بروزن خشن) ایڑی ۲۴۴
اقنوم ۔ اصل اور ذات ۴٨
اَکنّۃ ۔ کِنان کی جمع (بروزن کتاب) پردہ ، چھپانے والی چیز ١۶۴
اُمَم ۔ امت کی جمع وہ جماعت جو قدرِ مشترک رکھتی ہو ١٨٨
انشاء ۔ ایجاد ، ابداع ۲۹۶
اوزار ۔ جمع وزر کی سنگین بوجھ ١٧۶
بازغ ۔ مادہ "بزغ" (بروزن تدر) شگاف کرنا ۔ خون جاری کرنا ۔ بزغ ۔ جراحیٔ حیوانات ۲۵٨
باساء ۔ شدت رنج ، جنگ ، قحط سالی خشک سالی ١۹۹
بحر ۔ وسیع قطعہ جہاں پانی جمع ہو ۔ سمندر ۲۲۴
بحیرہ ۔ مادہ "بحر" پانچواں بچہ جننے کے بعد عرب ایسے جانور کے کان میں سوراخ کر کے آزاد چھوڑ دیتے ہیں ذبح یا قتل نہیں کرتے تھے ۔ ایک معنی سمندر ۔ وسیع قطعۂ آب ۹٨
بدالھم ۔ ان کے لیے آشکار ہوا ١٧۳
بدیع ۔ کسی چیز کا کسی سابقہ کے بغیر وجود میں لانا ۳١٠
بر ۔ وسیع مکان ۔ خشکی کا بہت بڑا قطعہ ۲۲۴
بصائر ۔ مادہ "بصر" بصیرت کی جمع دیکھنا ۔ فکر و عقل
بصارت ۔ دلیل ، شاہد ، گواہ ۳١۳
بَغتۃً ۔ ناگہانی ، اچانک ۔ پنہاں ١٧۶ ، ۲٠۴
بلغ ۔ پہنچا دے مفردات کی رو سے ابلغ سے زیادہ تاکید ہے ۲۵
تاس ۔ مادہ "آس" معنی غم و اندوہ ۴۲
تبسل ۔ مادہ "بسل" (بروزن نسل) قہر و غلبہ کے ذریعہ بچنا ۲۴۲
تضرّع ۔ دودھ کا پستان میں آنا ۔ دوہنے والے کے سامنے مطیع ہونا ۲٠١
تفرّع ۔ دُعائے آشکار ۲۳١
جن ۔ مادہ "جَن" بروزن فن ۔ کسی چیز کو چھپانا ۔ مجنون ، جن جنین ، جنت بھی پوشیدہ کے معنی میں ہیں دل کو جنان سینے میں چھپا ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں ۲۵٧
جھد ۔ سعی و کوشش (انتہائی) ۳۲٠
جھرہ ۔ آشکار علی الاعلان ۲٠۴
حام ۔ مادہ "حمایت" کا اسم فاعل حمایت کرنے والا نر جانور جو دس مرتبہ جفت ہو چکا ہو ۹٨
حبہ ۔ دانہ ، فرزند ۲۲۶
حجر ۔ (بروزن شعر) ممنوع قرار دینا ۳۶۴
حرج ۔ (بروزن حرم) بہت زیادہ نقصان ۔ حد سے

قاھر۔ اس طرح غلبہ پانے والا کہ کوئی سدِ مقابل رہے ہی نہیں ۱۵۴
قبلا۔ روبرو ہونا۔ ممکن ہے قبیل کی جمع بھی ہو ۳۲۵
قراطیس۔ قرطاس کی جمع۔ جس پر لکھا جائے ۲۷۷
قرطاس۔ ہر وہ چیز جس پر لکھا جائے ۱۴۱
قرن۔ زمانہ، سال اور زمانے والے بھی ۱۲۹
قسیسین۔ قسیس کی جمع جو قشیش سریانی کا معرب ہے معنی عیسائی پیشوا ۶۶
قنوان۔ "قنو" کی جمع (بروزن صنف) باریک اور لطیف دھاگے اور دھاریاں ۲۹۹
کتب۔ مادہ۔ کتابت۔ معنی لکھ دیا ہے۔ لازم ہے ۲۱۶
کرب (بروزن حرب) قلبہ رانی کرنا۔ غم واندوہ ۲۳۲
کِسوتھم۔ کسوہ سے مراد دو قطعہ لباس قمیص شلوار ۷۲
کعبہ۔ کعب سے مشتق۔ پاؤں کی ابھری ہوئی جگہ مراد بلند جگہ، بمعنب کاعب، کواَب اسی سے بنے ہیں ۹۰
لا تغلوا۔ مادہ۔ غلو۔ حق سے تجاوز کرنا ۵۳
لا تقعد۔ پاس نہ بیٹھو ۲۳۸
لَبس۔ (بروزن درس) پردہ پوشی اشتباہ کاری ۱۴۳
لُبس۔ (بروزن قفل) لباس پہننا ۱۴۳
لتصغیٰ۔ مادہ "صغوا" (بروزن سرو) میلان ورغبت رغبت سماعت ۳۲۹
لطیف۔ مادہ۔ لطف۔ لطیف مخلوقات کا خالق ۳۱۱
لعب۔ (بروزن لزج) مادہ۔ لعاب۔ (بروزن غبار) کھیل ۱۷۷
مأئدہ۔ مادہ۔ مید۔ معنی حرکت دینا ہلانا۔ مراد کھانا اور کھانے کا طبق۔ ٹرے ۱۱۵
مبلسون۔ مادہ۔ ابلاس۔ رنج وغم جو حوادث کی شدت سے پیدا ہو۔ ابلیس بھی اسی مادہ سے ماخوذ ہے ۱۹۹
متراکب۔ مادہ۔ رکوب۔ ایسے دانے جو دوسرے دانوں پر سوار ہیں۔ غذائی دانے ۲۹۹
مستقر۔ مادہ۔ قر۔ (بروزن حر) سردی، مراد سکون ثابت و پائیدار ۲۹۷
مستودع۔ مادہ۔ ودع۔ (بروزن منع) ترک کرنا ناپائیدار ۲۹۷
معاشر۔ مادہ۔ عشرہ۔ دس کے معنی میں مراد کامل جماعت ۳۵۴
معجزین۔ مادہ۔ اعجاز۔ عاجز و مجبور کرنے والے ۳۵۷
مفاتح۔ مفتح کی جمع (بروزن بستر) چابی۔ کنجی بروزن دفتر۔ خزانہ حفاظت کا دفتر ۲۲۳
مکر۔ گرم کرنا۔ مروڑنا۔ حیلہ۔ ہر انحرافی کام ۳۴۴
مِمّا ذراء۔ اس میں سے جو خدا نے خلق کیا ۳۵۹
نبات کل شیء۔ (ہر چیز کی گھاس) کونپلیں
ا۔ ایک ہی زمین و پانی سے سیراب ہونے والی نباتات
۲۔ ہر جاندار، یعنی حشرات چرند پرند انسان کے کام آنے والی نباتات ۳۹۸
نصرِّف۔ مادہ۔ تصریف۔ مختلف شکل کے استدلال کرنا۔ دگرگوں کرنا۔ مختلف شکلوں میں لانا ۳۱۴
نفس۔ معنی ذات جیسے بہ نفسِ نفیس یہاں ہر نفس کا اطلاق روح اور جان پر نہیں ہے ۱۲۱
نفق۔ نقب زیر زمین راستہ ۱۸۳
وبال۔ مادہ۔ وبل یا وابل۔ سخت بارش۔ سخت کام۔ سزا و عذاب کو بھی سختی و شدت کی وجہ سے وبال کہتے ہیں ۸۵
وحشرنا علیھم کل شیء۔ تمام چیزیں اور ان کے تمام مطالبے۔ جمع کرنا ۳۲۵

متفرق موضوعات

آخری کار رسالت

اعمال

امن وامان

اندھی تقلید

بُت

پاک وناپاک

التماس سورہ فاتحہ برائے تمام مرحومین

۱] شیخ صدوقؒ
۲] علامہ مجلسیؒ
۳] علامہ ساغر حسین
۴] علامہ سید علی نقی
۵] بیگم و سید عابد علی رضوی
۶) بیگم و سید احمد علی رضوی
۷) بیگم و سید رضا امجد
۸) بیگم و سید علی حیدر رضوی
۹) بیگم و سید سبط حسن
۱۰) بیگم و سید مردان حسین جعفری
۱۱) بیگم و سید جبار حسین
۱۲) بیگم و مرزا توحید علی
۱۳) سید حسین عباس فرحت
۱۴) بیگم و سید جعفر علی رضوی
۱۵) سید انعام حسین زیدی
۱۶) سیدہ ہما زہرہ
۱۷) سیدہ رضویہ خاتون
۱۸) سید نجم الحسن
۱۹) سید مبارک رضا
۲۰) سید تہنیت حیدر نقوی
۲۱) بیگم و مرزا محمد ہاشم
۲۲) سید باقر علی رضوی
۲۳) بیگم و سید باسط حسین
۲۴) سید عرفان حیدر رضوی
۲۵) بیگم و اخلاق حسین
۲۶) سید ممتاز حسین
۲۷) بیگم و سید اختر عباس
۲۸) سید محمد علی
۲۹) سیدہ رضیہ سلطان
۳۰) سید مظفر حسنین
۳۱) سید باسط حسین نقوی
۳۲) غلام محی الدین
۳۳) سید ناصر علی زیدی
۳۴) سید وزیر حیدر زیدی
۳۵) ریاض الحق
۳۶) خورشید بیگم